سیدنا شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی

قدس اللہ سرہ العزیز

جلد دوم

شائع کردہ

مکتبہ دینیہ دیوبند

إنّ الدّار الآخرة لهي الحيوان

نقشِ حیات

خود نوشت سوانح حیات

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی

جلد دوم

وہ قابل قدر بیش بہا مستند تاریخی مجموعہ جس میں اسلامی ریاستوں پر دُول یورپ کی مسلسل یورشیں۔ استخلاص وطن کے متعلق حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کا فتویٰ۔ حضرت سید احمد صاحب شہید کا جہاد حریت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں علماء اور مشائخ اسلام کا حصہ۔ ریشمی خطوط کی تحریک یعنی شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی انقلابی تحریک، اُس کے رفقارِ کار۔ ہندوستان اور افغانستان میں اُس کے اثرات و نتائج۔ اسارت مالٹا۔ مقدمہ کراچی وغیرہ وغیرہ یعنی انیسویں اور بیسویں صدی میں اسلامی سیاسیات۔ اُس کے تقاضوں، ردعمل اور پس منظر پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے

ناشر

محمد اسعد خلف حضرت مصنف مدظلہ العالی

مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی

قیمت مجلد للعہ غیر مجلد عہ

ادائے فرض

آج جبکہ خدا کے فضل و کرم سے حضرت والد ماجد مدظلہ العالی کی تصنیف "نقش حیات" کی دوسری جلد زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہے میرا اخلاقی فرض ہے کہ ان تمام بزرگوں، احباب اور رفقاء کرام کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے ان جلدوں کی طباعت میں امداد فرمائی یا اس کی اشاعت میں پیشگی رقم دیکر یا بعد میں فروخت کے سلسلہ میں سرگرم کوشش فرما کر میرا ہاتھ بٹایا۔ میں ان سب حضرات کا ممنون ہوں اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ خصوصیت سے عم محترم حضرت مولانا سید محمود احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی کا شکر گذار ہوں کہ جیسے ہی ان کو اس کتاب کی طباعت کا علم ہوا ایک رقم خطیر عطا فرما کر احقر کی امداد فرمائی اور فراہمی مالیہ کے سلسلہ میں میری پریشانیوں کا بوجھ ہلکا کر دیا

فجزاھم اللہ تعالیٰ عنی وعن مصنف الکتاب وعن کل من تمتع بہ۔

محمد اسعد غفرلہٗ

خادم تدریس دار العلوم دیوبند ضلع سہارنپور

۲۰ر شعبان ۱۳۷۳ھ

۲۴ر اپریل ۱۹۵۴ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

جلد دوم

نقشِ حیات

تحریکِ استخلاصِ وطن کی ابتدا

حصول اقتدار۔ استحصال دولت۔ اقتصادی برتری کے لئے یورپین اقوام بالخصوص انگریزوں نے جو نفرت انگیز، انسانیت سوز مظالم کئے اور جن کا طویل سلسلہ وحشت و بربریت کی پوری سرگرمیوں کے ساتھ برابر جاری تھا انھیں سفاکانہ مظالم نے عام مسلمانوں بالخصوص علمی طبقہ میں آزادی کی عام تڑپ پیدا کی۔ پہلے پہلے تو یہ خیال تھا کہ بادشاہ اور صوبہ جات کے نواب وغیرہ اس بدیسی یورپین ظالم قوم کا قلع قمع کردیں گے۔ مگر پلاسی اور پھر بکسر پھر روہیلکھنڈ و میسور، مدراس، دکن، بمبئی وغیرہ کی لڑائیوں میں ناکامیوں نے انتہائی مایوسی پیدا کردی اور مصائب کے روز افزوں زلزلوں نے سخت پریشان کردیا۔ ۱۸۰۳ء میں جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندہ نے بادشاہ دہلی سے ملکی انتظام کا پروانہ جابرانہ طریقہ پر لکھوا کر ملک میں اعلان کرادیا کہ

"خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا حکم کمپنی بہادر کا" تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان کے دارالحرب ہوجانے کا فتویٰ دیا اور مسلمانوں کو آزادیٔ ہند کے لئے آمادہ کرنا ضروری سمجھا[1]

---

[1] اسی حالت کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۱۹۰ میں لکھتا ہے۔ "ہمارے لئے اگرچہ اپنی مسلمان رعایا سے پرجوش وفاداری کی توقع رکھنا عبث ہوگا لیکن ان سے یہ امید رکھنا بھی غیر معقول نہیں کہ جب تک ہم پابندی کے ساتھ ان کے حقوق پورے کرتے رہیں گے وہ بھی ایمانداری کے ساتھ اس صورت حالات میں اپنے فرائض سرانجام دیتے رہیں گے جس میں اللہ تعالےٰ نے ان کو ہمارے زیر نگیں کر دیا ہے۔ علماء میں سے جو لوگ زیادہ زیرک تھے انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت میں آنے والے تغیر کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ یہ تغیر اب ایک حقیقت بن چکا ہے وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے فتووں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مآل اندیشانہ رویہ کے باوجود حکومت کا انقلاب ایک نامعلوم طریقہ پر جاری نہ تھا۔ چنانچہ ان میں سے ایک فتوے میں صاف صاف اعلان کیا گیا ہے کہ ہندوستان اسوقت تک دارالاسلام رہ سکتا ہے جب تک مسلمان مفتی جن کو آگے چل کر ہم نے برطرف کر دیا تھا قانونی فیصلے کرتے رہیں۔ ان میں سے دو فتوے یعنی ایک تو شمس الہند مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب اور دوسرا ان کے بھتیجے مولوی عبدالحی صاحب کا سب سے زیادہ اہم ہیں۔ جب ہم نے نظام حکومت کو بتدریج اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو اس وقت دیندار مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوا کہ ہمارے ساتھ ان کے تعلقات کیا ہونے چاہئیں۔ لہذا انہوں نے ہندوستان کے سب سے زیادہ مستند علماء سے رجوع کیا اور اوپر کے دونوں مشہور و معروف علماء نے ان کے جواب میں فتوے صادر فرمائے۔ جو حرف بحرف مندرج ذیل ہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں "کہ جب کافر کسی اسلامی ملک پر قابض ہو جائیں اور اس ملک اور ملحقہ اضلاع کے لئے یہ ناممکن ہو کہ وہ ان کو اس سے باہر نکال سکیں یا ان کو باہر نکالنے کی کوئی امید باقی نہ رہے اور کافروں کی طاقت میں یہانتک اضافہ ہو جائے کہ وہ اپنی مرضی سے اسلامی قوانین کو جائز یا ناجائز قرار دیں اور کوئی انسان اتنا طاقتور نہ ہو جو کافروں کی مرضی کے بغیر ملک کی مالگذاری پر قبضہ کر سکے اور مسلمان باشندے اس امن و امان سے زندگی بسر نہ کر سکیں جیسا کہ وہ پہلے کرتے تھے تو یہ ملک سیاسی اعتبار سے دارالحرب ہو جائے گا۔ جوں جوں ہماری طاقت مضبوط ہوتی گئی علماء کے فتووں میں ہندوستان کا دارالحرب ہونا زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ مولوی عبدالحی صاحب جو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے بعد ہوئے مختصر طور پر حکم لگاتے ہیں "عیسائیوں کی پوری سلطنت کلکتہ سے لیکر دہلی اور ہندوستان خاص سے ملحقہ ممالک (یعنی شمالی مغربی سرحدی صوبے) تک سب کی سب دارالحرب ہے کیونکہ کفر اور شرک ہر جگہ رواج پا چکا ہے اور ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پرواہ نہیں کیجاتی۔ جس ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں وہ دارالحرب ہے یہاں ان تمام شرائط کا بیان کرنا طوالت کا باعث ہوگا جن کے ماتحت جملہ فقہا اس بات پر (بقیہ حاشیہ صفحہ ۵ پر)

(وہ فتوی مفصل فتاوی عزیزیہ صفحہ، ا وغیرہ میں موجود ہے) واقعات نے بتلادیا تھا کہ ہندوستان کے موجودہ حکام وامراء میں اب کسی میں طاقت اس بدیسی غیر مسلم ظالم قوم کے مقابلہ اور دفع کرنے کی ایسی نہیں رہی جس پر اطمینان کیا جائے۔ لہذا مسلمانوں کو احوال پر غور کرنا اور آزادی کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا ازبس ضروری ہے جو کہ ہر دارالحرب کے باشندوں پر لازم ہے۔ چنانچہ اس کے بعد سے جد وجہد شروع ہوئی۔ جو کہ سکھوں کے مقابلہ کے نام سے مشہور کی گئی[1]۔ اس زمانہ میں مغربی پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی جو کہ انگریزوں کے حلیف تھے اور آپس میں (انگریزوں اور راجہ رنجیت سنگھ میں) زوردار معاہدے کئے ہوئے تھے۔ مگر حقیقت میں[2] سکھوں سے لڑنے کا مقصد اصلی ان بدیشیوں (انگریز) اور ان کے معاونین سے لڑ کر ملک کو اس مصیبت سے بچانا تھا اور رعایا پر سے ان کے وحشیانہ مظالم کو اٹھا دینا اور بس۔ حضرت سید احمد صاحب بریلوی شہید رحمۃ اللہ علیہ جو کہ اس تحریک کے سردار اور بانی ہیں ان کے خط میں جو کہ وزیر گوالیار کے نام مدد طلب کرنے کے لئے لکھا گیا تھا (جس کو ہم بجنسہ آگے ذکر کریں گے) صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ ہمارا مقصد ہندوستان کو اس بدیسی قوم (انگریز) کے مظالم سے پاک کرنا ہے اس کے بعد ہندو اور مسلمان ملک بادشاہت کے لئے جس کو مناسب سمجھیں منتخب کریں[3]۔ اور یہی وجہ ہے کہ مجاہدین کی جماعت جو کہ یاغستان میں اب تک مقیم ہے اور جس کو انگریز باغی کیمپ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں سکھوں کی حکومت کا خاتمہ ہو جانے کے بعد بھی وہاں مقیم رہے۔ انگریزوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴) متفق ہیں کہ کلکتہ اور اس کے ملحقات دار الحرب ہیں۔ ان فتووں سے عملی نتائج بھی مترتب ہوئے۔ وہابیوں نے جنگا جوش ان کے علم کی نسبت بہت زیادہ ہے اس اصول سے کہ ہندوستان دار الحرب ہے نتیجہ اخذ کیا کہ اس کے حاکموں کے خلاف جہاد کرنا فرض ہے۔"

[1] بہت سی مصلحتیں تھیں جنگی بنا پر اس نام سے شہرت دی گئی۔ ان مصلحتوں کو ہم آئندہ ذکر کریں گے۔

[2] حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ فرقہ وارانہ نہ تھی ہندوستان میں کئی سو ریاستیں غیر مسلموں کی پہلے سے چلی آتی تھیں جو کہ مسلمان بادشاہوں نے غیر مسلم فرمانرواؤں کو دے رکھی تھیں۔ راجہ رنجیت سنگھ کو بھی شہزادہ زمان خاں ابدالی نے پنجاب کا گورنر بنایا تھا۔

[3] ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۲۰ میں سید صاحب کی حج سے واپسی پر لکھتا ہے:۔ "پہلے جو چیز ان کی نظر میں محض خواب وخیال تھی وہ انکو حقیقی روشنی میں نظر آنے لگی جس میں انہوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے ہر ضلع میں اسلامی جھنڈا گاڑتے اور صلیب کو انگریز کافروں کی لاشوں کے نیچے دفن کرتے ہوئے دیکھا"

بہت خواہش کی کہ وہ اپنے وطنوں میں لوٹ آئیں - مگر اُن کا بڑا حصّہ وہیں رہ کر انگریزوں سے برسرِ پیکار ہوتا رہا - مندرجہ ذیل اقتباس جو کہ البرہان جلد ۱۷ صفحہ ۸۷ - اگست ۱۹۴۶ء کا ہے اس پر پوری روشنی ڈالتا ہے -

ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیر کے بعد یہاں کی حکومت کو گھن لگنا شروع ہوا تو حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی (مرحوم) نے نہ صرف یہ کہ اس کو محسوس کیا بلکہ اس کے اسباب و علل پر بڑی دیدہ وری اور جامعیت کے ساتھ بحث کی اور ان کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے اس کی طرف حکومت کو امراء اور وزراء کو اور سوسائٹی کے دوسرے طبقات کو درجہ بدرجہ نہایت پر زور و پُر شکوہ الفاظ میں توجہ دلائی - حضرت شاہ صاحب (مرحوم) کے بعد آپ کے صاحبزادہ اور صحیح جانشین حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب (مرحوم) کی حیات میں دہلی کے حالات اور زیادہ بگڑے اور "حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم" کی مثل صادق آنے لگی - انگریزوں کا اقتدار اور اُن کا ظلم و ستم اور اس کے بالمقابل لال قلعہ کے بادشاہ کی قوت کا اضمحلال روز افزوں ہو گیا تو شاہ عبدالعزیز صاحب نے دہلی کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا - چنانچہ ایک شخص جس نے پوچھا تھا کہ دارالاسلام دارالحرب بن سکتا ہے یا نہیں - حضرت شاہ صاحب اُس کے جواب میں یہ بتانے کے بعد کہ کن کن چیزوں کے پیدا ہونے سے دارالاسلام دارالحرب بن جاتا ہے خاص دہلی کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں - "دریں شہر حکم امام المسلمین الخ" (ترجمہ) "امام المسلمین (بادشاہ اسلام) کا حکم اس شہر میں بالکل جاری نہیں ہے - اور بڑے بڑے عیسائیوں (انگریزوں) کا حکم بے دغدغہ جاری ہے - اور احکام کفر کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ملک داری، رعایا کا بندوبست، خراج اور باج کا وصول کرنا، کسٹم ڈیوٹی لینا - رہزنوں کو سزا دینا، اور مقدمات کا فیصلہ کرنا، اور جرموں کی سزا دینا یہ تمام معاملات یہ لوگ خود ہی کرتے ہیں"۔

آگے چل کر فرماتے ہیں - کہ اگرچہ بعض احکام اسلام ایسے ہیں جن سے یہ تعرض نہیں کرتے مثلاً جمعہ، عیدین اور اذان و ذبح بقر وغیرہ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے - جب ان چیزوں کی جو اصل اور جڑ و بنیاد ہے وہی ان کے نزدیک خیر وقیع ہے - چنانچہ یہ لوگ بے تکلف مسجدوں کو گرا دیتے ہیں اور کوئی مسلمان یا ہندو

ان سے امن لئے بغیر دہلی یا اُس کے اطراف وجوانب میں نہیں آسکتا اور دوسرے بڑے بڑے سردار مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم بھی ان عیسائیوں کے حکم اور اجازت کے بغیر اس علاقہ میں داخل نہیں ہوسکتے ۔ عیسائیوں کا عمل دخل دہلی سے کلکتہ تک پھیلا ہوا ہے"۔

عام لوگ جو مسلمانوں کی گذشتہ دو سو سال کی سیاسی جد وجہد کی تاریخ سے بے خبر ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں کانگریس ہی سب سے بڑی اور سب سے پہلی وطنی جماعت ہے جو ملک کو اجنبی اقتدار سے آزاد کرنے کے لئے کھڑی ہوئی ۔ اس قسم کا خیال کرنا تاریخی اعتبار سے بالکل غلط ہے ۔ کیونکہ اول تو کانگریس کی ابتدا ۱۸۵۷ء کے بہت بعد (۱۸۸۵ء) میں ہوئی اور پھر اس کے اولین مقاصد میں ملک کو آزاد کرانا نہیں بلکہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں باہمی اعتماد پیدا کرنا اور ان کے دلوں کو ایک کرنا تھا۔ چنانچہ کانگریس کا پہلا اجلاس جو ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو مسٹر بنرجی وکیل کلکتہ کی زیر صدارت بمبئی میں منعقد ہوا تھا اور جس میں بمبئی کے مشہور مسلمان تاجر مسٹر رحمت اللہ سیانی اور دوسرے مسلمان بھی شریک ہوئے تھے اُس میں کانگریس کے مقاصد حسب ذیل بیان کئے گئے تھے۔

۱- ہندوستان کی آبادی جن مختلف عناصر سے مرکب ہے ۔ ان سب کو متحد و متفق کرکے ایک قوم بنانا ۔

۲- اس طرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو اُس کی دماغی ۔ اخلاقی اور اجتماعی و سیاسی صلاحیتوں کو بیدار کرنا

۳- ایسے حالات کی اصلاح و ترمیم کرانا جو ہندوستان کے لئے نقصان کا باعث اور غیر منصفانہ ہوں اور ہندوستان اور انگلستان میں اتحاد و یگانگت کو استوار کرنا ۔

اس واقعہ سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ۔ (۱) مسلمان اور ہندو اور دوسرے مذاہب کے اربابِ نظر نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہی یہ محسوس کرلیا تھا کہ انگریز اپنی حکومت کو مضبوط اور دیرپا بنانے کے لئے ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی اختلاف سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ جیسا کہ انہوں نے کیا ۔ اس بناء پر انہوں نے کانگریس کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی قرار دیا تھا کہ ہندوستان کی سب قوموں کو ملا کر ایک ہندوستانی قوم بنایا جائے ۔

(۲) کانگریس کے قیام کا مقصد انگریزوں سے ملک واپس لینا نہیں تھا بلکہ راعی اور رعایا دونوں کے باہمی تعلقات کو خوشگوار رکھنا تھا۔

بہر حال یہ ظاہر ہے کہ کانگریس کے عالمِ وجود میں آنے سے بہت پہلے حضرت شاہ عبد العزیز صاحب (مرحوم) اور آپ کے ہمخیال دوسرے علماء کی رہنمائی میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی تھی جو ہندوستان کو انگریزوں کے اقتدار سے نجات دلانا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ اس جماعت میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شریک تھے۔ لیکن قیادت اور سیادت بہر حال مسلمانوں کو حاصل تھی۔ حضرت شاہ عبد العزیز (مرحوم) کے علاوہ آپ کے شاگرد مولانا عبد الحی صاحب بھی صراطِ مستقیم میں لکھتے ہیں:۔

"سلطنت شاہجہاں آباد (دہلی) اسم محض بلا حقیقت است کہ اصلاً معنی از سلطنت نماندہ"

جمہوریت یا فسطائیت

اس موقعہ پر آگے بڑھنے سے قبل یہ معلوم کر لینا موضوع گفتگو کی زیادہ وضاحت کا سبب ہوگا کہ علماء کا سلطنت کے معاملات میں کیا رویہ رہا ہے۔ یعنی یہ کہ اُنہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کو جمہوری نظام پر چلانے کی کوشش کی یا وہ اُسے فسطائیت کی راہ پر چلانا چاہتے تھے۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ علماء نے حکومت کو ہمیشہ جمہوریت کے اصول پر چلنے کی تلقین کی۔ وہ حکومت کو خدا کی مخلوقات جس میں ہر مذہب وملت کے لوگ شامل ہیں ان کی خدمت کا ذریعہ سمجھتے تھے نہ کسی قسم کے تغلب اور جبر وتشدد کا۔ قرآن کی انسانیت عامہ کی تعلیم کے پیشِ نظر اُن کا اصل مقصد تھا انسانیت کو اس کی نشو ونما میں مدد دینا۔ خدا کی پاک زمین سے ظلم وفساد کی گندگی کو دور کرنا۔ عدل وانصاف کا راج قائم کرنا۔ حق اُس کے حقدار کو پہنچانا۔ خدا کے مختلف المذاہب بندوں میں خلوص ومحبت اور صلح وآشتی پیدا کرنا۔ حکومت پر اُن کا اثر ہوتا تھا اور وہ اس اثر کو اپنے ان مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے۔ جب تک ہندوستان میں حکومت مغلیہ قائم رہی اور دربار پر علماء کا اثر واقتدار رہا سلطنت انتظامی معاملات میں اسی عدل وانصاف کے اصول پر عامل رہی اس بناء پر تختِ حکومت پر اگرچہ بادشاہ مسلمان نظر آتا تھا۔ لیکن در اصل حکومت کا نظم ونسق جمہوری تھا۔ آج کل جمہوریتوں میں عوام کی رائے الکشن اور انتخابات سے معلوم ہوتی ہے اور اس زمانہ میں جبکہ یہ جدید طریقہ مروج نہیں تھا۔ درباریوں، عمالِ حکومت، جاسوسوں اور ملک کے عام حالات وغیرہ کے ذریعہ عوام کی رائے اور اُن کی خواہشوں کا بادشاہ کو علم حاصل ہوتا رہتا تھا اور وہ اُن کی روشنی میں اپنی پالیسی متعین کرتا اور عوام کو مطمئن

کرنے کے لئے احکام جاری کرتا تھا۔ چنانچہ انگلستان کے مشہور مقرر اڈمنڈ برک نے پارلیمنٹ میں ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کے نظامِ حکومت کے متعلق صاف اور واضح لفظوں میں کہا تھا۔

"عیسائی بادشاہوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے قانون میں بدرجہا زیادہ مضبوطیاں ہیں اُن کا اپنے قانون کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ اس لئے بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب کے سب یکسانیت کے ساتھ قانون اور مذہب کے پابند ہیں۔ قرآن کے قانون کا ہر ہر حرف ظالموں کے خلاف گرج رہا ہے۔ اس قانون کی شرح کرنے والے علماء یا قاضیوں کا طبقہ موجود ہے جو اس کا محافظ قرار دیا گیا ہے اور جو بادشاہوں کی ناراضی سے محفوظ ہے اور جسے بادشاہ بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اُن کے بادشاہوں تک کو حقیقی اعلیٰ طاقت حاصل نہیں ہے۔ بلکہ وہاں کی حکومت ایک حد تک جمہوری ہے"۔

(تقاریر ایڈمنڈ برک (انگریزی)، جلد اول صفحہ ۱۰۴ و ۱۰۵)

علماء کے زیرِ اثر ملکی معاملات میں ہندو یا مسلم کا کوئی امتیاز نہیں تھا دونوں کو یکساں حقوق حاصل تھے۔ اور اُن کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہمارے ملک کے مشہور مصنف پنڈت سندر لال الہ آبادی لکھتے ہیں:۔

"اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اُن کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے دونوں مذاہب کی توقیر کیجاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں"۔

(بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل ایڈیشن ۵۔ صفحہ ۲۲)

شواہد و نظائر بے شمار ہیں۔ کوئی کہاں تک گنائے۔ صرف ایک واقعہ جو حد درجہ عبرت آمیز ہے سُن لیجئے سلطان محمد تغلق کا نام کس نے نہ سنا ہوگا۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس کے جاہ و جلال اور رعب و داب کا کیا عالم تھا مشہور سیاح ابن بطوطہ اُس کے متعلق اپنا چشم دید واقعہ لکھتا ہے:۔

"ایک مرتبہ سلطان کے خلاف ایک ہندو نے عدالت میں استغاثہ کیا کہ بادشاہ نے اُس کے لڑکے کو بے وجہ

مارا ہے۔ قاضی نے بادشاہ کو مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں طلب کیا اور مقدمہ کی سماعت کی۔ آخر فیصلہ یہ کیا کہ بادشاہ پر جرم ثابت ہے اور اُس سے بدلہ لیا جائے۔ سلطان محمد بن تغلق نے بے چون چرا عدالت کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا"۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے:۔

"میں نے دیکھا کہ بادشاہ نے عدالت کے فیصلہ کے مطابق ہندو زادہ کو دربار میں بلایا اور اس کے ہاتھ میں چھڑی دے کر کہا کہ لے مجھ سے بدلہ لے لے"۔ مزید براں لڑکے کو اپنے سر کی قسم دے کر کہا کہ جس طرح میں نے تجھ کو مارا ہے تو بھی مجھ کو اُسی طرح مارا۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ اب لڑکے نے بادشاہ کے اکیس چھڑیاں ماریں یہاں تک کہ ایک مرتبہ بادشاہ کی ٹوپی بھی سر پر سے گر پڑی"

(سفرنامہ ابن بطوطہ ج ۲ صفحہ ۱۳۰)

دنیا میں عدل و انصاف ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے باعث ایک شخص کو کسی حکومت پر مکمل اعتماد ہو سکتا ہے۔ مسلمان بادشاہ چونکہ علماء کی زیر نگرانی اس راہ پر گامزن رہتے تھے اس بناء پر بلا اختلاف مذہب و ملت رعایا کو ان پر اعتماد ہوتا تھا اور بغاوت و سرکشی کے واقعات ہوتے بھی تھے تو اُن کی بنیاد مذہب کے اختلاف پر نہیں ہوتی تھی علاوہ بریں کسی فرقہ کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس فرقہ کے لئے بھی حکومت کے عہدوں اور منصوبوں کے دروازے ایسے ہی کھلے رکھے جائیں جیسے کہ خود اپنے فرقہ کے لوگوں کے لئے اور ملکی و انتظامی معاملات میں کسی قسم کا کوئی تعصب نہ برتا جائے

قرآن کا حکم ہے۔ ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا ھوا قرب للتقویٰ

(کسی قوم سے تکدر تم کو اس پر مجبور نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ نہیں تم بہر حال انصاف ہی کرو۔ یہی پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے) مغل بادشاہوں نے اس معاملہ میں کس حد تک بے تعصبی برتی۔ تاریخ کے دفتر اس سے پُر ہیں۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اُن سے قطع نظر خود اورنگ زیب عالمگیر جو اپنی خشک مذہبیت کیلئے بدنام ہے اُس کے عہد حکومت میں راجپوت اور ہندو سیکڑوں کی تعداد میں بڑے بڑے عہدوں اور مناصب پر فائز تھے اور جب کسی نے اُس پر اعتراض کیا تو اُس نے فوراً کہا۔ دنیوی کاروبار اور حکومت کے معاملات کا دارومدار قابلیت اور لیاقت پر ہوتا ہے اس میں مذہب کو دخل ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔

زوال حکومت کے بعد علماء کا نصب العین

یہ جو کچھ آپ نے پڑھا اُس زمانہ سے متعلق ہے جب کہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا اقتدار پورے طور پر قائم تھا۔ پھر جب اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد اُس میں اضمحلال آنا شروع ہوا اور حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے رہے تو اب علماء نے اُن کی اصلاح کی کوشش کی اور اس کوشش سے ان کا مقصد ملک کی خوشحالی، امن واماں سکون واطمینان ظلم وجور کی بیخ کنی اور خلق خدا کی عام رفاہیت وبہبودی تھا ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ حکومت مسلمان کی ہو یا غیر مسلم کی وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ جس کی بھی حکومت ہو انصاف کرے اس سے خدا کے بندوں کو کوئی دکھ نہ پہونچے پھر خدمت انسانیت کے اس جذبۂ بلند واعلیٰ کے زیر اثر مقصد کی تکمیل کے لئے وہ سب کچھ کرتے تھے جو ایک باعمل سرفروش جماعت کو کرنا چاہیئے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فتوے کا جو اقتباس اوپر گذر چکا ہے اس میں دو باتیں خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہیں۔

(۱) حضرت شاہ صاحب نے انگریزوں کے خلاف جو ظلم وستم کی شکایت کی ہے اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا بھی ذکر کیا ہے دونوں شہر دہلی اور اُس کے نواح میں امن کا پروانہ لئے بغیر نہیں آسکتے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب انگریزوں کے مظالم سے صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوؤں کی بھی گلو خلاصی چاہتے تھے۔

(۲) شاہ صاحب کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کے لئے اُس میں محض مسلمانوں کی آبادی کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے لئے وہ یہ بھی ضروری جانتے ہیں کہ مسلمان باعزت طریقہ پر رہیں اور اُن کے شعار مذہبی کا احترام کیا جائے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدار اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو لیکن مسلمان بھی بہرحال اُس اقتدار میں شریک ہوں اور اُن کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک بلاشبہ دارالاسلام ہوگا اور از روئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے لئے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ کریں۔ ......

حضرت سید احمد شہید اور اُن کی تحریک

حضرت شاہ ولی اللہ اور پھر حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہما نے اپنے ارشاد و ہدایت سے جس انقلابی پارٹی کی داغ بیل ڈالی تھی آخر کار اُس نے انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں سید احمد صاحب شہید اور اُنکی جماعت حقہ کے روپ

میں جنم لیا۔ حضرت سید صاحب اور آپ کے رفقائے کار نے اپنی نواہائے آتشیں سے تمام ملک میں آگ لگا کر ایک ایسی بڑی جمعیت پیدا کر لی جو ملک کو ہر قسم کے شر و فساد اور ظلم و جور سے پاک و صاف کر دے۔ اور مسلمان دوسرے اربابِ مذہب کے ساتھ عزت و خود داری کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ یہ زمانہ پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کا تھا۔ سید صاحب کو مسلسل اطلاعات پہونچ رہی تھیں کہ مہاراجہ کی حکومت میں مسلمانوں پر ناگفتنی مظالم ہو رہے ہیں اُن کے شعائرِ مذہبی کی علانیہ توہین ہو رہی ہے اور عرصۂ حیات اُن پر تنگ کر دیا گیا ہے۔ آپ نے اپنے خلیفہ مولانا اسمٰعیل شہید کو ان واقعات کی تحقیق کے لئے پنجاب روانہ کیا اور آخر جب اُنہوں نے چشم دید حالات دیکھنے کے بعد ان واقعات و مظالم کی تصدیق کر دی تو آپ نے پنجاب کا رُخ کر دیا۔

جہاد کا مقصد لیکن اس جہاد سے سید صاحب کا مقصد ملک گیری یا اور کوئی دنیوی منفعت بالکل نہیں تھا۔ چنانچہ اپنے خطوط اور خطبات و مواعظ میں آپ بار بار اس کا تذکرہ فرماتے تھے۔

مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری جو حضرت سید صاحب کے نہایت مستند سوانح نگار ہیں لکھتے ہیں۔

کہ ایک مرتبہ ایک سوال کے جواب میں سید صاحب نے صاف صاف فرمایا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادران اسلام پر ظلم کرتے، اور اذان وغیرہ مذہبی فرائض ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکات مستوجب جہاد سے باز آجائیں گے تو ہم کو اُن سے لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

(سوانح احمدی صفحہ ۷۰)

ہندوستان کی یہ بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ سید صاحب کو مسلمانانِ پنجاب کی حد درجہ پامالی و زبوں حالی کے باعث مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بالمقابل صف آرا ہونا اور آخر معرکۂ بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ ورنہ اصل یہ ہے کہ سید صاحب کا مقصد ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط و اقتدار سے نجات دلانا تھا۔ انگریز خود اسے محسوس کرتے تھے اور اس تحریک سے بڑے خوف زدہ تھے اسی بناء پر جب سید صاحب کا ارادہ سکھوں سے جنگ کرنے کا ہوا تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا اور جنگی ضرورتوں کے

مہیا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی۔

سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط و اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے۔ اس بناء پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور اس میں صاف صاف انہیں بتادیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کر دینا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی۔ اس سے آپ کو غرض نہیں ہے۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سرحد سے ریاست گوالیار کے مدار المہام اور مہاراج دولت رائے سیندھیا کے وزیر و برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کو آپ نے جو خط تحریر فرمایا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس سے آپ کے اصلی عزائم اور ملکی حکومت کے متعلق آپ کے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم اس خط کو اس کی اہمیت کی وجہ سے بعینہٖ نقل کرتے ہیں۔

(از کتاب مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا صفحہ ۲۷۳ تا ۲۷۶ مصنفہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی)

"برائے عالی روشن و مبرہن است کہ بیگانگاں بعید الوطن ملوک زمین و زماں گردیدہ و تاجران متاع فروش بپایۂ سلطنت رسیدہ امارت امرائے کبار و ریاست رؤسائے عالی مقدار برباد نمودہ اند و عزت و اعتبار ایشاں بالکل ربودہ۔ چوں اہلِ ریاست و سیاست در زاویہ خمول نشستہ اند ناچار چندے از اہلِ فقر و مسکنت کمرِ ہمت بستہ ایں جماعت ضعفاء محض بنا بر خدمت دین رب العالمین ہرگز ہرگز از دنیاداران جاہ طلب نیستند محض بنا بر خدمت دینِ رب ذوالجلال برخاستہ اند

جناب کو خوب معلوم ہے کہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے دنیا جہان کے تاجدار، اور یہ سودا بیچنے والے تاجر سلطنت کے مالک بن گئے ہیں۔ بڑے بڑے امیروں کی امارت اور بڑے بڑے اہلِ حکومت کی حکومت اور انکی عزت کو انہوں نے خاک میں ملادیا ہے۔ جو حکومت و سیاست کے مردِ میدان تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اسلئے مجبوراً چند غریب بے سر و سامان کمرِ ہمت باندھ کر کھڑے ہوگئے اور محض اللہ کے دین کی خدمت کیلئے اپنے گھروں سے نکل آئے یہ اللہ کے بندے ہرگز دنیادار اور جاہ طلب نہیں ہیں محض اللہ کے دین کی خدمت کے لئے اٹھے ہیں مال و

نہ بنا بر طمع مال ومنال وقتے کہ میدان ہندوستان
از بیگانگاں دشمناں خالی گردیدہ و تیر سعی
ایشاں بر ہدفِ مراد رسیدہ آئندہ مناصب
ریاست وسیاست بطالبین آں سلم باد و بیخ
شوکت وسطوت ایشاں محکم شود و ایں ضعفا
را از رؤساء کبار و عظماء عالی مقدار ہمیں قدر
مطلوب است کہ خدمتِ اسلام بجان و دل کنند
و بر مسند مملکت متمکن شوند۔"

دولت کی ان کو ذرہ برابر طمع نہیں جس وقت ہندوستان
ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائیگا اور ہماری کوششوں کا تیر
مراد کے نشانوں تک پہونچ جائے گا۔ حکومت کے
عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے جنکو انکی طلب ہوگی
اور ان (ملکی) حکام واہلِ ریاست کی شوکت وقوت کی بنیاد
مستحکم ہوگی۔ ہم کمزوروں کو والیان ریاست اور بڑے بڑے
سرداروں سے صرف اسی بات کی خواہش ہے کہ جان ودل سے اسلام کی
خدمت کریں اور اپنی مسندِ حکومت پر برقرار رہیں۔

ریاست گوالیار کے ایک مسلمان عہدہ دار غلام حیدر خاں کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"دریں صورت مناسب وقت چناں می نماید
کہ ریاست پیرائے سیاست آرائے عظمت
نشاں راجہ ہندو رائے را ایں معنی بفہمانند
کہ اکثر بلاد ہندوستان بدست بیگاں افتادہ و
ایشاں ہر جا بنیاد و آئین ظلم وجور نہادہ ریاست
رؤساء ہندوستان برباد رفتہ کسے تاب مقاومت
ایشاں نمی دارد بلکہ ہر کس ایشاں را آقائے خود
می شمارد و چوں رؤساء کبار از مقابلہ ایشاں
نشستند لاچار چند کس از ضعفائے بے مقدار کمر
بستند۔ پس دریں صورت رؤسائے عالی مقدار
را لازم چنانکہ بر مسند ریاست سالہا سال متمکن
ماندہ اند بالفعل در اعانت ضعفاء مذکورین

ایسی صورت میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ
سردار والاقدر راجہ ہندو رائے کے یہ مضمون
ذہن نشین کریں کہ ملک ہندوستان کا
بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضہ میں چلا گیا
اور انہوں نے ہر جگہ ظلم و زیادتی پر کمر باندھی
ہے۔ ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہوگئی کسی کو ان کے
مقابلہ کی تاب نہیں بلکہ ہر ایک ان کو اپنا آقا سمجھنے لگا
ہے چونکہ بڑے بڑے اہلِ حکومت ان کا مقابلہ کرنیکا
خیال ترک کرکے بیٹھ گئے ہیں اس لئے چند کمزور بے حقیقت
اشخاص نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اس صورت میں ان بڑے
سرداروں کے لئے مناسب یہی ہے جو سالہا سال سے اپنی مسندِ ریاست پر
متمکن چلے آرہے ہیں کہ اسوقت ان کمزوروں کی ہر طرح امداد

مساعی بلیغہ بجا آرند و آں را باعثِ استحکام	کریں اور اس بات کو اپنی حکومت کے استحکام کا
بنیان ریاست خود شمارند۔	باعث سمجھیں۔

(مجموعہ خطوط قلمی صفحہ ۱۴۲)

حضرت سید صاحب (مرحوم) کے ان خطوط کو غور سے پڑھنے کے بعد تجزیہ کیجئے تو حسبِ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) آپ انگریزوں کو "بیگانگاں بعید الوطن" اور پردیسی سمجھتے تھے اور ان کے استیلاء و تغلب سے تنگ آکر ان سے لڑنے کا عزم رکھتے تھے۔

(۲) آپ ہندوستان کو اپنا ملک اور وطن سمجھتے تھے۔

(۳) جہاد سے آپ کا مقصد خود اپنی حکومت قائم کرنا ہرگز نہیں تھا بلکہ دین رب العالمین کی خدمت تھا۔

(۴) ہندوؤں سے اختلافِ مذہب کی بناء پر آپ کو پرخاش تو کیا ہوتی آپ کمپنی کے ہاتھوں مظلومیت و پامالی میں ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں شریک جانتے تھے اور جہاد سے آپ کی غرض دونوں کو ہی اجنبی اقتدار کی مصیبت سے نجات دلانا تھا۔

(۵) کامیاب ہونے کے بعد ہندوستان میں ملکی حکومت کا نقشہ کیا ہوگا اس کا فیصلہ آپ طالبین مناصبِ ریاست و سیاست پر چھوڑتے ہیں۔ مگر ہندوؤں کو یہ اطمینان ضرور دلاتے ہیں کہ وہ سید صاحب کی کوششوں کو اپنی ریاست کی بنیاد کے مستحکم ہونے کا باعث سمجھیں اور پھر سید صاحب کا ہندو ریاستوں کو مدد اور شرکتِ جنگ کی دعوت دینا اور اپنے توپ خانہ کا افسر راجہ رام راجپوت کو مقرر کرنا خود اس کی دلیل ہے کہ آپ ہندوؤں کو اپنا محکوم نہیں بلکہ شریکِ حکومت بنانا چاہتے تھے۔

بیشک سید صاحب جگہ جگہ اعلاء کلمۃ اللہ اور دین رب العالمین کی خدمت کا ذکر کرتے اور اسی کو اپنی مساعی کا محرک بتاتے ہیں لیکن آپ یہ خوب سمجھتے تھے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کا ذریعہ صرف یہی نہیں ہے کہ ایک فرقہ وار گورنمنٹ قائم کیجائے۔ اور خود حاکم بن کر دوسرے برادرانِ وطن کو اپنا محکوم بنایا جائے بلکہ اس کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ برادرانِ وطن کو سیاسی اقتدار میں اپنا شریک کر کے

اسلامی فضائل اخلاق سے ان کے دلوں کو فتح کیا جائے۔ اقلیت اور اکثریت کے مسئلہ کی کوئی پیچیدگی آپ کے ذہن میں نہیں تھی۔ کیونکہ آپ کے نزدیک یہ دونوں بے حقیقت چیزیں تھیں جو اپنے عمل میں سب سے زیادہ پرجوش، فداکار، سرگرم اور مخلص و دیانت دار ہوگا۔ امامت اور لیڈرشپ اسی کے ہاتھ میں رہے گی۔ خواہ اقلیت کے فرقہ سے تعلق رکھے یا اکثریت کے فرقہ سے۔ قرآن مجید کی آیت۔ کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة (کتنی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں ہیں جو بڑی ٹکڑیوں پر غالب آجاتی ہیں) آپ کے لئے مشعل راہ تھی۔ اقلیت میں ہونے کا خوف و ہراس اور وسوسہ و اندیشہ صرف اسی شخص یا گروہ کو ہو سکتا ہے جو سست عمل، کمزور اور سبک مایہ ہو اور جو اپنے بچاؤ کے لئے خارجی قلعہ بندیوں کا محتاج ہو۔

(البرہان ۲۷، جلد ۲۱ صفحہ از ۷۷ تا ۷۸)

مذکورہ بالا اقتباس سے بہت سے امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(الف) یہ تحریک آزادی علماء ہند کے ہاتھوں انیسویں صدی کے ابتدائی حصہ سے شروع ہوئی اور اس کی سنگ بنیاد رکھنے والے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی اور ان کے خاندان کے لوگ اور ان کے شاگرد اور مریدین ہیں۔

(ب) اس تحریک میں فرقہ واریت اور مذہبی تنگدلی کا نام نہ تھا بلکہ تمام ہندوستان اور اس کے باشندوں کو بدیشی مظالم سے جو کہ تمام ملک کو برباد کر رہے تھے نجات دلانا تھا۔

(ج) اس تحریک میں غیر مسلموں کو بھی شریک کیا گیا تھا۔ اور ان کو بلایا گیا تھا۔

(د) سکھوں سے جنگ فرقہ واریت کی بناء پر نہیں تھی بلکہ اس بناء پر تھی کہ وہ انگریزوں کے حلیف اور مددگار تھے۔ انگریزوں نے ان کو ہندوستان میں اپنی حکومت کی حفاظت کے لئے افغانستان کے راستہ میں آہنی دیوار اور سدِ سکندری بنایا تھا اس لئے انکا قلع قمع کرنا لازم تھا اس کے علاوہ وہ بے پناہ مظالم کی محرک تھے جن کا وہ انتہائی بربریت کے ساتھ ارتکاب کر رہے تھے۔

(ہ) اس تحریک کا مقصد دنیاوی مفاد، ملک گیری، خود غرضی، عہدوں اور منصوبوں کا حاصل کرنا کسی قوم کو غلام بنانا، ان کی دولت اور ذرائع دولت کو ہتھیانا ہرگز نہ تھا بلکہ محض خدا کی ہندوستانی عام مخلوق کو

یوروپین سپید بھیڑیوں، اور ان کے حلفا کی لوٹ مار، چیر پھاڑ، تذلیل و توہین وغیرہ سے بچانا تھا
جو کہ اعلاء کلمۃ اللہ کا عظیم ترین مقصد ہے۔ عدل و انصاف، امن و اماں، انسانی ہمدردی، غربا
پروری، کمزوروں کی امداد اسی مقصد اعلےٰ کے پھل پھول اور شاخیں ہیں۔

(و) یہ تحریک شخصی یا کسی فرقہ کی حکومت، فسطائیت کے لئے نہیں عمل میں لائی گئی تھی بلکہ حقیقی جمہوریت
اس کا مطمح نظر تھا

الحاصل دار الحرب بنجانے کے فتوی مذکورہ کے بعد اس کے فرائض کی انجام دہی میں غور و خوض شروع
ہوا حضرت شاہ صاحب مرحوم اور ان کے خاندانی حضرات اور تلامذہ اور مریدین با اخلاص میں
گفت و شنید بحث و تمحیص ہونی ضروری تھی۔ اس کے بعد عام مسلمانوں کو ساتھ لینے اور اس فریضہ کی
انجام دہی کے عمل میں لانے کی تدبیریں سوچی گئیں۔ اور ضروری سمجھا گیا کہ عام مسلمانوں کو فریضہ مذکورہ
کی دعوت دیجائے مگر جب تک مدعوین کے کیرکٹر اور اخلاق و اعمال میں استقامت اور استقلال خدا
ترسی اور اخلاص وغیرہ اعلےٰ ترین اخلاق پیدا نہ ہوں تو مقصد حاصل نہیں ہو سکتا اور اگر بغیر ان کے
اقدام کیا گیا تو بجائے نفع ضرر کا سخت اندیشہ[1] ہے۔ اس لئے ملک میں دورہ کرنا، ہر جگہ وعظ و نصیحت
اور تبلیغ و تفہیم سے لوگوں کے عقائد و اخلاق و اعمال کو درست کرنا اور ان سے عہد و میثاق لینا کہ وہ
اللہ تعالےٰ اور رسول علیہ السلام کی سچی اور پکی تابعداری کریں گے۔ چوری، زنا، ناحق قتل کرنا، لوگوں پر
بہتان باندھنا وغیرہ تمام بڑے بڑے گناہوں سے دور رہیں گے[2]۔ ضروری سمجھا گیا۔ اور اس کام کے لئے
حضرت سید احمد صاحب بریلوی مرید و خلیفہ خاص حضرت شاہ عبد العزیز صاحب اور ان کے بھتیجے شاہ
محمد اسمٰعیل صاحب اور داماد و بھتیجے مولانا عبد الحی صاحب مرحومین کو منتخب کیا گیا۔ اول الذکر کو سب کا
سردار اور ہر دو بزرگوں کو جو کہ بحکم حضرت شاہ عبد العزیز صاحب سید صاحب کے مرید بھی ہو گئے تھے ان کا

---

[1] کیونکہ تہذیب اخلاق، اور صالح جذبات کے بغیر جو جنگ و جدال ہو گا وہ جہاد نہ ہوگا بلکہ فساد اور ڈاکہ زنی ہو گی خلقت کی آبادی اور امن و اماں کی صورت نہ ہو گی بلکہ بربادی اور ظلم و ستم کا بازار گرم ہو گا۔

[2] یہی مفہوم مرید کرنے کا ہے انہیں باتوں کے عہد و پیمان لینے کو مرید کرنا کہا جاتا ہے۔

دست و بازو بنا دیا گیا۔

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے احوال و مناقب بہت سی کتابوں میں مذکور ہیں اُن کی تفصیلات وہیں سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ اس تحریک کے سردار ہونے کی وجہ سے بہت سے انگریزوں کو بھی قلم اٹھانا پڑا اور چونکہ انگریزوں کے خلاف اپنی قوم اور ملک کی بھلائی سید صاحب چاہتے تھے اس لئے انگریز حکام اور مورخین سید صاحب پر نہایت کڑی اور سخت نظر رکھتے ہیں اور حسب عادت نہایت قبیح الفاظ آپ کی نسبت اور آپ کی پارٹی کی نسبت استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صادق حسین صاحب ایم۔ بی ایس تمہید ترجمہ رسالہ "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں لکھتے ہیں:۔

"مغربی تاریخ نگاروں کا یہ ہمیشہ اصول رہا ہے کہ ملت کے یہ وفادار سرفروش اگر یورپ میں ہوں تو انہیں قومی اور مذہبی زندگی میں بلند ترین مقام پر جگہ دیجاتی ہے اور بدقسمتی سے اگر ان کا تعلق سرزمین ایشیا اور بالخصوص اسلام سے ہو اور وہ کسی مغربی سے برسرپیکار ہو تو اُس سے زیادہ ذلیل، انسانیت کا خون کرنے والا اور امن پسند شہریوں کی جائداد و املاک لوٹنے والا اس دنیا میں کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ چاہئے کہ اس کی لاش بھی قبر سے کھدوا کر جلا دی جائے (جیسا کہ لارڈ کچنر نے مہدی سوڈانی مرحوم کے ساتھ کیا) مجاہدین کے لئے باغی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ دو متضاد قوانین میں سے ایک کی پرجوش حمایت دوسرے سے بغاوت کے مترادف ہے"

بہر حال حضرت سید صاحب کی سیرتیں اور بلند احوال بہت سی کتابوں میں مندرج ہیں۔ اس لئے ہم اُن کی تفصیلی سیرت اس مقام پر پیش نہیں کر سکتے فقط بقدر ضرورت اجمالاً کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

حضرت سید صاحب کے مختصر حالات

حضرت سید صاحب مرحوم ۱۲۰۱ھ ۱۷۸۶ء میں بمقام تکیہ متصل رائے بریلی (صوبہ اودھ) سادات کے معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ہونہاری کے اعلٰے آثار بچپن سے ہویدا تھے ۱۲۲۲ھ ۱۸۰۷ء میں دہلی میں حضرت شاہ عبد العزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں تحصیل علوم اور سلوک کی غرض سے حاضر ہوئے۔ مقصد معلوم کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحب نے فرمایا۔

"آپ کے خاندان میں تو منصب ولایت موروثی ہے امید ہے کہ آپ بھی اپنے آباء و اجداد کی طرح منزلِ مقصود پر فائز ہوں گے"

حضرت شاہ صاحب مرحوم نے اپنے چھوٹے بھائی حضرت شاہ عبدالقادر صاحب مرحوم کے سپرد کر دیا انہوں نے روحانی تعلیمات اور تلقینات کے ساتھ قرآن پاک کا ترجمہ اور حدیث و تفسیر وغیرہ پڑھائی ۱۸۰۶ء ہجری میں جبکہ آپ کی عمر بائیس سال کی تھی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے بیعت ہوئے چونکہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کی صحبت موثرہ اور تلقینات سے مادہ وصول الی اللہ پوری طرح تیار ہو گیا تھا چند ہی روز میں شاہ عبدالعزیز صاحب کی حسن توجہ اور اپنی خداداد قابلیت کی بناء پر کمال پر پہنچ گئے۔ شاہ صاحب نے خلعتِ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اسی سال میں وطن مالوف واپس ہوئے۔ اور وطن میں شادی کر کے تقریباً دو برس قیام فرمایا۔ سنہ ۱۸۱۰ء میں ضروریاتِ معاشیہ کی بناء پر نواب امیر خاں والی ٹونک کی فوج میں ملازم ہو گئے اس زمانہ میں فوجی کارناموں کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ شب بیداری کی حالت یہ تھی کہ نفلوں میں کھڑے کھڑے آپ کے پاؤں ورم کر جاتے تھے۔ سنہ ۱۸۱۷ء میں جبکہ نواب امیر خاں انگریزوں سے صلح کے نامہ و پیام کرنے لگے۔ تو سید صاحب فوجی نوکری چھوڑ کر پھر دہلی حضرت شاہ صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس آٹھ برس کی غیبوبت میں سید صاحب نے اس قدر روحانی ترقی کر لی تھی کہ ان کی روحانی نسبت ان کے مرشدوں سے بھی بالاتر ہو گئی تھی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب (برادر شاہ محمد اسحٰق صاحب نواسہ شاہ عبدالعزیز صاحب) فرمایا کرتے تھے:۔

"شاہ عبدالعزیز صاحب کی توجہ کی تاثیر ہلکی بارش کی طرح ہوتی ہے اور حضرت سید صاحب کی مثال لوہے کی پھوکنی سے دینی چاہیئے جو کہ فوارہ کی طرح قلب پر پڑتی ہے۔"

(سوانح احمدی صفحہ ۲۱ - از شاندار ماضی صفحہ ۱۷۱)

اسی بناء پر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے اپنے اعزا و احباب کو اپنے بجائے سید صاحب علیہ الرحمۃ کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید (باوجود سید صاحب سے تقریباً دس برس بڑے ہونے اور علومِ ظاہرہ میں بہت زیادہ ماہر ہونے کے) نیز حضرت

مولانا عبدالحی صاحب، مولانا وجیہہ الدین صاحب، مولانا محمد یوسف صاحب بغیرہ شاہ اہل اللہ صاحب وغیرہ حضرت سید صاحب سے بیعت ہو گئے[۱]......... (شاندار ماضی صفحہ ۱۶)

حضرت شاہ محمد اسماعیل صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب دہلی میں حسن تقریر و تحریر اعلیٰ علمی قابلیت اعلیٰ ذکاوت وغیرہ میں پہلے سے بہت زیادہ مشہور و معروف تھے ان حضرات کا اور شاہ صاحب کے تمام خاندان کا سید صاحب سے بیعت ہو جانا اور حلقہ ارادت میں داخل ہونا معمولی بات نہ تھی نہ باطنی حیثیت سے اور نہ ظاہری حیثیت سے۔ اگر روحانی طاقت اور نسبت باطنیہ کی قوت معمولی ہوتی تو یہ علماء کرام جو کہ نہ صرف دہلی کے چوٹی کے علماء تھے بلکہ تمام ہندوستان کے ممتاز اور سربرآوردہ علماء تھے اور اسی طرح اصحاب باطن میں شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب دونوں اُس زمانہ میں انتہائی درجہ کے اشخاص میں سے شمار کئے جاتے تھے اُن کا اپنے مریدوں اور اولاد کو سید صاحب کے سپرد کر دینا بخوبی دلالت کرتا ہے کہ سید صاحب باطنی کمالات اور روحانی نسبت میں غیر معمولی طاقت کے مالک ہیں[۲]۔ اس کا اثر یہ بہت جلد ظاہر ہوا کہ سید صاحب کے کمالات کا

---

[۱] حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب حضرت سید صاحب اپنے دورہ تبلیغ میں حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب شہید ولایتی (دادا پیر حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب مکی رحمہا اللہ تعالیٰ) سے ملاقی ہوئے تو منجملہ اور لوگوں کے حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب نے بھی بیعت حضرت سید صاحب کے ہاتھ پر کی (حالانکہ وہ خود صاحب ارشاد کامل تھے۔ ہزاروں آدمی ان کے مرید تھے) اور فرمایا کہ واقعہ میں کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی مجھ کو حاجت نہیں ہے مگر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اسی میں دیکھتا ہوں (نظر کشفی سے) اس لئے بیعت ہوتا ہوں۔ پھر دونوں حضرات حجرہ میں اکتساب فیوض روحانیہ کے لئے چلے گئے۔ جب نکلے ہیں تو حضرت سید صاحب پر نسبت چشتیہ اور گریہ و بکا کا غلبہ تھا اور حضرت حاجی صاحب پر نسبت نقشبندیہ سکینت اور ضحک کا غلبہ تھا۔

[۲] سید صاحب کا انتہائی دشمن انگریز ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۷، میں لکھتا ہے "گو سید احمد ایک لٹیرا اور جعل ساز تھا اور اُن کے حواریوں نے بھی بعد میں یہی پیشہ اختیار کیا لیکن میں اس بات کا یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سید احمد صاحب کی زندگی کا ایک درمیانی حصہ ایسا بھی تھا جس میں اُن کا دل و دماغ اپنے برادران وطن کی نجات کے لئے ہر وقت بیقرار رہتا تھا اور اُن کا دھیان ہر وقت خدا کی طرف لگا رہتا تھا۔ وہ بہت ہی بیقرار جوشیلے اور اعصابی مزاج کے انسان تھے۔ اگرچہ ان کا ظاہری اطمینان انکی قلبی کیفیت کو ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ ان پر وجدانی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی جسکو ہم مغربی سائنس کی اصطلاح میں مرگی سے تعبیر کر سکتے ہیں اور ایشیائی عقیدہ کے مطابق بڑی ہی متبرک حالت ہے کیونکہ اس کا مطلب براہ راست خدا تعالیٰ سے تعلق کا پیدا ہو جانا ہے ان وجدانی کیفیات میں پیغمبران سلف روکی بصیرت پر چھا ہو جاتے تھے اور کشفی طور پر وہ ہندوستان کے دو گذشتہ مذہبی اماموں سے متواتر راہ و رسم رکھتے تھے" صفحہ ۷۔

تمام شہر اور اطراف و جوانب میں چرچا زوروں پر ہوگیا۔ اور لوگ جوق درجوق فیضیاب ہونے کے لئے آنے لگے دعوتی خطوط کی بھرمار ہوگئی۔ مقصد اصلی کے لئے فضا مناسب ہوگئی۔ ہر دو ممتاز علماء مولانا اسمٰعیل صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب رحمہما اللہ تعالےٰ کو لے کر حضرت سید صاحب ۱۲۳۳ھ میں مشرقی اور جنوبی صوبجات کے دورہ پر روانہ ہوگئے۔ اس وقت سید صاحب کے ساتھ منجملہ دیگر قوتوں کے تین قوتیں اعلیٰ درجہ کی تھیں (اول) بے مثل روحانی قوت نسبت (دوم) بے مثل علم و ذکاوت اور قوت تقریر و تحریر حضرت شاہ اسماعیل صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب کے آتشیں اور ساحرانہ پُر درد پُر تاثیر مواعظ و بیانات (سوم) ان تینوں حضرات اور اُن کے رفقاء کی بے مثل مخلصانہ استقامت اور اتباع سنت پھر ایسی صورت میں اگر خارج از عقل و عادت لوگوں پر اثر نہ پڑے تو کیا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بکثرت ہر ہر جگہ باطل سوز انقلاب پیدا کرنے والے مواعظ اور بیانات ہوئے۔ مناظروں اور مباحثوں کی نوبتیں آئیں جن میں شاہ محمد اسماعیل صاحب کی ذکاوت، حافظہ، حسن بیان حاضر جوابی سے ہر مقابل کو کھلی کھلی شکست اُٹھانی پڑی۔ بہت سے مقامات پر کرامتوں کے نہایت واضح اور کھلے ہوئے واقعات رونما ہوئے۔ نتیجہ ظاہر تھا کہ مخلوق خدا فوجاً فوجاً کھنچ کھنچ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی، مرید ہوتی توبہ کرتی اور آئندہ کے لئے عہد و پیمان کرتی کہ اتباع شریعت اور اتباع سنت پر ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور بدعات اور ناجائز رسوم کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیگی۔ چنانچہ عام اور خاص میں کھلا ہوا انقلاب عظیم نظر آتا تھا۔ گویا کہ کایا پلٹ ہوگئی۔ ہم تفصیلات اگر لکھیں تو دفتر تیار ہوجائیں اس لئے ان کو اُن سوانح نگاروں کی تصانیف پر حوالہ کرتے ہوئے ایک دشمن اسلام و ایشیا یعنی ایک چالاک انگریز کے قول کو پیش کرتے ہیں جو کہ حقیقت سے مجبور ہو کر اقرار کرتا ہے۔ الفضل ما شهدت به الاعداء۔

سید صاحب اور اُن کی جماعت اور تحریک کا دشمن انگریز ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر "ہمارے ہندوستانی مسلمان" صفحہ ۲۲ پر لکھتا ہے۔

"سید احمد نے نہایت دانشمندی سے اپنے آپ کو زمانہ کے مطابق بدل دیا۔ چنانچہ اُنہوں نے قزاقی کا پیشہ ترک کر کے ۱۸۱۶ء میں احکام شرعیہ پڑھنے کے لئے دہلی جا کر ایک جید عالم کی شاگردی قبول کی (مغربی اقوام کا یہ خاصہ ہے کہ ہر محب وطن اور آزادی خواہ کو پہلے لٹیرے ہی کے لقب سے یاد

کرتی ہیں۔ مترجم) اور پھر تین سال کی اس طالب علمانہ حیثیت کے بعد ایک مُبلّغ کی زندگی اختیار کی اُنھوں نے پُرزور طریقہ پر اُن بدعات کے خلاف جہاد شروع کیا جو مسلمانانِ ہند کے اسلامی عقائد میں داخل ہوچکی تھیں اور اس طرح پُرجوش اور حوصلہ مند لوگوں کو اپنا مرید بنالیا۔ اُن کی تبلیغ کا پہلا مرکز روہیلوں کی قوم تھی جن کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کے لیے ہم نے محض دولت کی لالچ میں اپنی فوجیں عاریتاً دوسروں کو دیدی تھیں اور جس کی افسوسناک تاریخ وارن ہسٹنگز کی زندگی پر ایک نہ مٹنے والا بدنما داغ ہے۔ ان کی اولاد گذشتہ نصف صدی سے متواتر اس کا انتقام لیتی چلی آرہی ہے اور اس وقت بھی سرحد کے باغی کیمپ کو اس کے بہترین شمشیر زن مہیا کررہی ہے۔ روہیلوں کے معاملہ میں بھی اور ہندوستان میں جہاں کہیں بھی ہم نے مظالم کئے ہیں ہم نے جیسا بویا تھا ویسا ہی کاٹا ہے۔

۱۸۲۰ء میں اس مجاہد نے آہستہ آہستہ اپنا سفر جنوب کی طرف شروع کیا۔ اُن کے مُریداُن کی روحانی فضیلت کو تسلیم کرتے ہوئے اُن کے ادنیٰ سے ادنیٰ کام کو بخوبی سرانجام دیتے تھے۔ اور صاحب جاہ اور علماء عام خدمت گاروں کی طرح اُن کی پالکی کے ساتھ ننگے پاؤں دوڑنا اپنے لئے فخر سمجھنے لگے۔ پٹنہ میں طویل قیام کے بعد اُن کے مُریدوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک باقاعدہ نظام حکومت کی ضرورت پیش آگئی۔ اُنھوں نے باقاعدہ اپنے ایجنٹ مقرر کئے تاکہ ہر اُس شہر سے جو اُن کے راستے پر پڑتا ہو تجارت کے منافع پر ٹیکس وصول کریں۔ اس کے بعد انھوں نے چار خلیفے مقرر کئے یعنی روحانی نائب اور ایک قاضی القضاۃ مقرر کیا اور اس کے لئے باقاعدہ فرمان جاری کیا جیسا کہ مسلمان بادشاہ صوبجات میں اپنے گورنر مقرر کرتے وقت جاری کیا کرتے تھے اس طرح پٹنہ میں ایک مستقل مرکز قائم کرنے کے بعد انھوں نے دریائے گنگا کے ساتھ ساتھ کلکتہ کی طرف کوچ کیا۔ راستہ میں لوگوں کو سلسلہ مریدی میں داخل کرتے جاتے اور بڑے بڑے شہروں میں اپنے نائب مقرر کرتے جاتے تھے۔ کلکتہ میں اُن کے اردگرد اس قدر ہجوم ہوگیا تھا کہ لوگوں کو مرید کرتے وقت اپنے ہاتھ پر بیعت کرانا اُن کے لئے مشکل تھا۔ بالآخر اُنہیں اپنی

پگڑی کھول کر یہ اعلان کرنا پڑا کہ ہر وہ شخص جو اس کے کسی حصہ کو چھو دے گا اُن کا مُرید ہو جائے گا۔"

(رسالہ ہمارے ہندوستانی مسلمان صـ۲۲)

اس سفر سے لاکھوں بندگان خدا کی اصلاح ہوئی اُن کے اخلاق اور اعمال اور عقائد درست ہوئے۔ جہاد کی تلقین اور دعوت کے لئے زمین تیار ہو گئی۔ پنجاب سے برابر جبر و مظالم کی آ رہی تھیں۔ انگریز بھی مطمئن ہو کر اپنے مظالم کی کڑیاں اس زنجیر میں جس میں ہندوستانیوں کو باندھ رکھا تھا بڑھاتا جا رہا تھا۔ مگر چونکہ ہندوستان کے اہل ثروت فریضہ حج ادا کرنا چھوڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ خشکی کے راستہ سے مکہ معظمہ جانا بہت ہی طویل مدت اور بہت زیادہ مشقت اور بہت زیادہ مصارف کا متقاضی اور طالب تھا۔ مختلف ممالک افغانستان، ایران، عراق، نجد وغیرہ درمیان میں حائل تھے بسا اوقات اُن میں خانہ جنگی کی بنا پر راستہ ملنا مشکل ہوتا تھا۔ اور بحری راستہ سمندر کے تلاطم اور طوفان کی وجہ سے لوگوں کی ہمتوں کو پست کئے ہوئے تھا۔ سید صاحب نے ضروری سمجھا کہ فریضۂ حج کی ادائیگی میں جو خوف اور کم ہمتی لوگوں کے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے اس کو نکالا جائے اور اس کی ہمت پیدا کی جائے۔ چنانچہ ۱۲۳۶ھ میں ایک بڑے قافلہ کے ساتھ آپ نے کلکتہ کے بندرگاہ سے عرب کا سفر کیا۔

شوال ۱۲۳۶ھ میں سفر حج کے لئے وطن مالوف سے روانگی ہوئی۔ راستہ میں مختلف مقامات پر جو کہ گنگا کے کنارے پڑتے تھے ٹھہرتے اور تبلیغی خدمت انجام دیتے ہوئے کئی مہینہ کے بعد کلکتہ پہونچے۔ کلکتہ میں بھی تقریباً تین مہینہ قیام کرنا پڑا[۱]۔ قافلہ حجاج کی تعداد اس قدر زیادہ ہو گئی تھی کہ گیارہ جہاز کرایہ کئے گئے اور گیارہ ہزار روپیہ پیشگی بطور نول دیئے گئے۔ وطن سے روانہ ہو کر گیارہ مہینہ بعد ۲۸ر شعبان ۱۲۳۷ھ کو یہ قافلہ بخیر و عافیت مکہ معظمہ پہونچا۔ حج کرنے کے بعد مدینہ منورہ کو روانگی ہوئی اور وہاں تین ماہ سے کچھ زائد قیام کرنے کے بعد ۲۹ر ربیع الاول ۱۲۳۸ھ میں مکہ معظمہ کو واپس ہو کر اخیر شوال ۱۲۳۸ھ تک مکہ معظمہ میں قیام کر کے یکم ذیقعدہ ۱۲۳۸ھ کو مکہ معظمہ سے واپس ہوئے۔ حجاز میں کل قیام چودہ مہینہ رہا۔

---

[۱] قیام کلکتہ کے زمانہ میں دور دور سے مشتاقان زیارت آ کر روزانہ بیعت کرتے تھے اگرچہ رفقاء سفر کی تعداد زیادہ سے زیادہ آٹھ سو تھی مگر زائرین کی تعداد ہزار سے بالا ہو جاتی تھی۔ اوسطاً دو ہزار آدمی دو وقتہ آپ کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔

لفظ وہابی کا حضرت سید صاحب اور اُن کے متعلقین کے متعلق استعمال صرف انگریزی پروپیگنڈہ ہے

مندرجہ بالا واقعات سے بخوبی واضح ہو گیا کہ حضرت سید صاحب اور اُن کے قافلہ والے مکہ معظمہ میں ۱۲۳۶ھ کے آخر میں پہونچے۔ یعنی ابتداء ۱۸۲۳ء میں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ وہابی حکومت اور اُن کے اجتماعات کا نام و نشان نہ حجاز میں باقی رہا تھا اور نہ نجد کے کسی شہر اور قصبہ میں۔ بلکہ اس سے پانچ برس پہلے نہ صرف مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ سے بلکہ تمام حجاز اور نجد کے مشہور مقامات سے ان کا قلع قمع مصری فوجوں نے زیر کمان ابراہیم پاشا بن محمد علی پاشا خدیو مصر بحکم سلطان عبد المجید خاں کر دیا تھا اور اُن کے باقیماندہ لوگ پہاڑوں اور جنگلوں میں دُور دُور بھاگ کر روپوش ہو گئے تھے۔ چنانچہ شامی حاشیہ درمختار جلد ثالث میں واضح طور سے اس کو ذکر کیا گیا ہے کہ ۱۲۳۳ھ میں مصری فوجوں نے اس جماعت کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صفحہ (۸۷) میں وہابیوں کے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ اور دیگر مقامات پر قابض ہو جانے کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے:۔

> "آخر کار محمد علی پاشا والیٔ مصر مصلحین (محمد بن عبد الوہاب اور اس کی جماعت) کو تباہ و برباد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۸۱۲ء میں تھومس کیتھہ نے جو کہ اسکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا پاشا کے لڑکے کے ماتحت مدینہ شریف پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا ۱۸۱۳ء میں مکہ معظمہ پر بھی قبضہ ہو گیا اور اس کے پانچ سال بعد یہ عظیم الشان سلطنت جس معجزانہ طور پر منصۂ شہود پر آئی تھی اسی معجزانہ طور پر ریت کے صحرائی ٹیلوں کی طرح غائب ہو گئی"

محمد بن عبد الوہاب کی اس جماعت نے چونکہ اہل مدینہ اور اہل مکہ و حجاز کے عام باشندوں کو اس مدت اقامت حجاز میں بہت زیادہ ستایا تھا۔ لوگوں کو قتل کرنا، مارپیٹ، لوٹنا، ذلیل کرنا وغیرہ وغیرہ عمل میں لاتے رہتے تھے جیسا کہ وہاں پر مشہور و معروف ہے اور صاحب رد المحتار لکھتا ہے کہ یہ لوگ صرف اپنی جماعت کو مسلمان سمجھتے تھے اور دوسری جماعتوں کو مشرک اور غیر مسلم کہتے تھے اور اُن کے اموال اور جانوں کو لوٹنا اور ضائع کرنا حلال جانتے تھے اس لئے اہل حرمین کو وہابیوں سے انتہائی عداوت اور نفرت تھی۔ اس لئے اہل حجاز و مکہ معظمہ

و مدینہ منورہ) کسی طرح اس کے روادار نہ تھے کہ کوئی نجدی جس کا تعلق اس فرقہ سے کچھ بھی ہو یہاں حجاز میں رہ جائے۔ ترکی حکومت اور اس کے عمال تو اتنی بڑی بغاوت اور اس کے فرو کرنے میں جو کچھ مالی اور جانی نقصان ہوا اٹھانے کے بعد کب گوارا کرسکتے تھے کہ کوئی وہابی وہاں باقی رہے۔ الغرض جس وقت حضرت سید صاحب اور اُن کے قافلہ والے مکہ معظمہ شعبان ۱۲۳۷ھ میں پہونچے ہیں کوئی وہابی حاکم یا عالم یا مُبلغ وہاں نہ تھا اور نہ اطراف و جوانب میں تھا۔ محمد بن عبدالوہاب کی وفات بہت پہلے ہو چکی تھی اس لئے ان کو کوئی موقعہ وہابیوں کے مسلک کو اُن سے لینے کا ہاتھ ہی نہیں آسکتا تھا اور نہ کسی وہابی سے اُن کی ملاقات کسی معتبر ذریعہ سے پایہ ثبوت کو پہونچی ہے پھر ان حضرات کو اس جماعت کی طرف منسوب کرنا بالکل افتراء اور جھوٹا پروپگنڈا ہے۔ یہ حضرات شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور علم ظاہر و باطن میں اُن کے تابعدار اور ایسے خوشہ چین اہل کمال تھے کہ نہ ہندستان میں اور نہ عرب و مصر و شام وغیرہ میں اس وقت ان کا نظیر اور مثیل تبحر، تفقہ، تصوف، تقریر و تحریر میں کوئی پایا جاتا تھا۔ اُن کی تصانیف اور تقریریں اور اعمال نامے اس کے گواہ ہیں۔ تو ایسے اہل کمال کسی دوسرے کے تابعدار اور مقلد بنیں یہ کیسے عقل سلیم میں آسکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ دوسرا اُن سے ہر کمال میں کمتر ہو۔ وہابیوں کے عقیدہ اور عمل میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی غرض سے سفر کرنا حرام ہے۔ چنانچہ اُن کے رسائل اور تحریریں موجود ہیں۔ اگر معاذ اللہ ان حضرات کا یہ عقیدہ ہوتا تو مکہ معظمہ سے تمام قافلہ سفر کر کے مدینہ منورہ کیوں پہونچتا اور اواخر ذی الحجہ سے ربیع الاول تک تین مہینہ وہاں کیوں قیام پذیر رہتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت سید صاحب کے ان دونوں سفروں میں (یعنی پہلے تبلیغی دورہ اور دوسرے حج کے سفر میں) لوگوں کا سید صاحب کی طرف جوق درجوق رجوع کرنا اور انتہائی درجہ میں گرویدہ ہو کر مُرید ہونا اس صورت حال نے انگریزوں کو گھبراہٹ میں ڈالدیا اور پھر دوسرے سفر میں تبلیغ آزادی اور تشویق جہاد کے اثر سے چاروں طرف سے پے درپے مجاہدین کے قافلوں کا سرحد پہونچنا معمولی چیز نہ تھا اس نے انگریزوں کے دماغ کو بوکھلا دیا اور اس فکر میں ڈالدیا کہ اگر مسلمانوں کی گرویدگی اس شخص اور اس کی جماعت کی طرف اسی طرح رہی تو ہمارا ہندستان میں باقی رہنا مشکل ہوگا اس لئے یہ جھوٹا پروپیگنڈہ بدنام کرنے اور لوگوں کو بدظن اور بدعقیدہ بنانے کے لئے جاری کیا گیا۔ انگریزوں کا اصول ہے "کتے کو بھی مارو تو بدنام کر کے مارو" اس کے لئے کتابیں اور رسالے لکھوائے گئے

اخباروں میں آرٹیکل شائع کئے گئے۔ سی۔ آئی۔ ڈی بکثرت ہرطرف مقرر کئے گئے جو کہ ہراس مقام پر کوشش کرتے تھے جہاں سید صاحب کے مخلصین کا کوئی اثر محسوس ہوتا تھا۔ جب تک انہوں نے جہاد نہیں کیا تھا یا جب تک وہ سکھوں سے برسر پیکار رہے تھے کسی اخبار یا رسالے میں یہ القاب ان کی یا ان کی جماعت کے متعلق نہیں آئے تھے ؂

جنوں کا نام خرد رکھدیا خرد کا جنوں ؎ تمہارے حسن فسوں ساز نے کیا کیا نہ کیا

اس غلط پروپیگنڈے کی قلعی مرزا حیرت نے حیوٰۃ طیبہ میں خوب کھولی ہے جس کو مولانا محمد میاں صاحب نے شاندار ماضی کی جلد ۳ ص۱۹۰ میں صاف طور سے بیان فرمایا ہے۔

سفر حج سے واپسی حضرت سید صاحب جدہ سے ابتداء ذیقعدہ ۱۲۳۷ھ میں روانہ ہوکر تخمیناً پندرہ روز ٹھہرتے ہوئے بمبئی پہنچے ڈاکٹر ہنٹر کہتا ہے "حاجی کے مقدس لباس میں اگلے سال ماہ اکتوبر میں بمبئی وارد ہوئے یہاں پر بھی آپ کی تبلیغی کوششوں کو وہی کامیابی حاصل ہوئی جو کلکتہ میں ہوئی تھی" اور پھر بمبئی میں قیام کرکے جہاز ہی کے ذریعے کلکتہ پہونچے اور وہاں دو ماہ قیام کرنے کے بعد وطن مالوف کو روانہ ہوگئے اور ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ کو دو سال گیارہ مہینے کے بعد وطن عزیز میں داخل ہوگئے۔

حضرت سید صاحب کے طرز میں تغیر

ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتویٰ (ہندوستان دارالحرب ہوگیا ہے) کی وجہ سے عام مسلمانوں اور بالخصوص علماء کے دماغوں میں ہلچل پیدا ہوگئی تھی اور اس کے لئے بحث و تمحیص کے بعد پروگرام بنایا گیا تھا جس کی تفصیل ان کارناموں سے ظاہر ہوتی ہے جو کہ بعد میں ظاہر ہوئے۔ ۱۸۲۰ء تک شہر دہلی میں بکثرت وعظ اور تقریریں نہایت زوردار اور موثر الفاظ میں حضرت شاہ محمد اسمٰعیل صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب اور ان کے رفقاء وغیرہ کی ہوتی رہیں۔ جن میں ہر قسم کے اصلاحی اور تنظیمی شرعی مواد پر بحث ہوتی تھی۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین کی ایک جماعت تو اس طرف دن رات مشغول رہنے لگی۔ اور دوسری جماعت حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب، مولانا صدرالدین صاحب، مولانا رشیدالدین صاحب وغیرہ جن میں مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی بھی ہیں۔ یہ حضرات ان ہنگامہ خیز امور میں باوجود ہر قسم کے کمالات علمی اور عملی کے حصہ نہیں لیتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے اس جماعت کو اسی لئے ٹھوس کاموں (تعلیم و تدریس وغیرہ) میں لگا دیا تھا کہ وہ مجاہدین کے لئے پشت پناہ بنکر ان کی ضروریات اس طرح

پوری کرتے رہیں گے کہ انگریزوں کی نظر میں نہ کھٹکیں - چنانچہ حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب مرحوم اور ان کے بھائی شاہ یعقوب صاحب دہلی ہی میں بیٹھے ہوئے تمام ضروریات کو انجام دیتے رہے - سنہ ۱۸۲۰ء میں جبکہ دہلی کی زمین تیار ہوگئی تو یہی جماعت تبلیغی خدمات کے لئے کرنال، سہارنپور، دیوبند، رام پور، روہیلکھنڈ، لکھنؤ وغیرہ کے دورے کرنے کے لئے نکلی اور جہاں بھی پہونچی عظیم الشان کامیابی، قبولیت اور تاثیر ظاہر ہوئی - پھر سنہ ۱۸۲۲ء میں حج کے لئے تبلیغ کرتے ہوئے نکلی - اس میں بھی حسب سابق سید صاحب کسی مقام پر جانا نہیں ہوتا تھا بلکہ دریائی آبادیوں میں ٹھہرنا، لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا، اصلاح سے متعلق ہر قسم کی کارروائی کرنا معمول تھا، انتہائی کامیابی اور جذب کے ساتھ سنہ ۱۸۲۳ء میں حجاز سے واپسی ہوئی - لوگوں کا ہجوم حضرت سید صاحب کی طرف بمبئی میں کلکتہ سے کم نہ تھا - وہی تبلیغی اور اصلاحی کوششیں جاری کی گئیں - روزانہ مرید ہونے والوں کی تعداد یہاں بھی ہزاروں کی تھی - مگر اس وقت حضرت سید صاحب کھل کر میدان میں آگئے تھے یعنی صریح اور صاف الفاظ میں لوگوں کو جہاد کی طرف بلاتے اور فرضیت جہاد کی وجوہ و دلائل بیان فرماتے تھے اور نہ صرف سکھوں سے جہاد کرنے کی فرضیت کی تلقین ہوتی تھی بلکہ انگریزوں سے جہاد کرنا ضروری اور اصل الاصول قرار دیتے تھے اور رقت انگیز اضطراب کے ساتھ لوگوں میں اس کی تڑپ اور آگ پیدا کرتے تھے - سوانح نگاروں اور سیرت کے لکھنے والوں نے اس بات کو قصداً چھپایا ہے ورنہ ان کی کتاب بھی ضبط ہوجاتی اور وہ بھی گرفتار ہوجاتے - ڈاکٹر ہنٹر صہ ۸۹ میں لکھتا ہے -

" (حج سے واپسی کا ذکر کرتے ہوئے) پہلے جو چیز ان کی نظر میں خواب و خیال تھی اب وہ ان کو حقیقی روشنی میں نظر آنے لگی - جس میں انھوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے ہر ضلع میں اسلامی جھنڈا گاڑتے اور صلیب کو انگریزوں کافروں کی لاشوں کے نیچے دفن کرتے ہوئے دیکھا - پہلے جو کچھ ان کی تعلیم میں ابہام تھا اب اس نے اس خوفناک اور باقاعدہ مذہب کی شکل اختیار کرلی - جس سے عبدالوہاب نے عرب میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی تھی اور جس سے سید احمد صاحب کو امید تھی کہ وہ ہندوستان میں اس سے بھی زیادہ عظیم الشان اور پائیدار سلطنت قائم کرنے کے قابل ہوجائیں گے - امام صاحب کی اندرونی کیفیات میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کا علم ان کو یا صرف خدا کو ہوسکتا ہے - لیکن یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ظاہری عادات بالکل بدل گئیں - اب ان کی زندگی کا مقصد صرف مرید بنانا ہی نہ تھا بلکہ اس مقصد اصلی کو پورا کرنے کے لئے یہ محض ایک ابتدائی ذریعہ تھا - بمبئی میں جہاں وہ

سب سے پہلے جہاز سے اُترے اُن لوگوں کی کثرت بھی جو اُن کا وعظ سُننے آتے یا مُرید ہونا چاہتے تھے اُن کو زیادہ دیر تک ٹہرنے کے لئے مجبور نہ کرسکی۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے اس سے زیادہ کامیابی حاصل کی جتنی کہ مکہ معظمہ کے سفر سے پہلے کی تھی۔ باایں ہمہ وہ ان پُرامن اضلاع میں اپنی واعظانہ سرگرمیوں کو حقارت آمیز بے صبری سے دیکھتے۔ معلوم ہوتا ہے اب اُن کی نگاہ ہر وقت سرحد کی دور دراز جنگجو آبادی پر لگی رہتی تھی۔ اُن کی آئندہ زندگی کو ہم اپنے پہلے باب میں اچھی طرح بیان کر چکے ہیں"۔

یہاں یہ شبہ ضرور رہتا ہے کہ اس طرح علانیہ جہاد کی تبلیغ اور تیاری اور اس کے لئے اجتماع پر گورنمنٹ کی طرف سے رکاوٹ کیوں نہ ہوئی اس کا جواب ڈاکٹر ہنٹر کے مندرجہ ذیل الفاظ دیتے ہیں۔ وہ صفحہ ۶۷ پر لکھتا ہے۔

"سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء تک سید احمد صاحب کی تبلیغ کی طرف انگریزی حکام نے کوئی توجہ نہیں کی۔ اُنھوں نے اپنے جاں نثار مریدوں کی ہمراہی میں ہمارے صوبجات کا دورہ کیا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو مُرید بنایا اور ایک باقاعدہ گدی۔ مذہبی ٹیکس اور ملکی حکومت قائم کر دی۔ اس اثناء میں ہمارے افسران اپنے اردگرد کی بہت بڑی مذہبی تحریک سے بے خبر ہو کر صرف مالیہ جمع کرتے انصاف کے لئے عدالتیں قائم کرنے اور فوجوں کو پریڈ کرانے ہی میں مصروف رہے۔ سنہ ۱۸۳۱ء میں اپنی اس بے خبری سے بہت بُری طرح جھنجھوڑے گئے"۔

شاندار ماضی جلد ۳ ص۶۵ میں ہے :-

"براہ دور اندیشی شیخ غلام علی صاحب رئیس اعظم الہ آباد کی معرفت گورنر اضلاع شمالی و مغربی کو اس تیاری جہاد کی اطلاع دیدی گئی تھی جس کے جواب میں گورنر نے کہا تھا "جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہو ہم ایسی تیاری سے مانع نہیں"۔ ممکن ہے کہ مذکورہ بالا امور کے علاوہ دوسری سیاسی مصلحتیں بھی ہوں مگر بہر حال انگریزوں نے اس وقت سید صاحب کے اس علانیہ جہاد اور اس کی تیاری پر کوئی رکاوٹ نہیں کی البتہ سنہ ۱۸۳۱ء کے بعد سب کچھ کیا گیا۔ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اواخر شعبان سنہ ۱۲۳۹ھ میں وطن مالوف پہونچ گئے تھے۔ تین مہینہ آرام فرما کر ذی الحجہ

۱۲۳۹ھ میں جہاد کے لئے اپنے سفر کا اعلان فرمادیا دولت خانہ چھاؤنی بن گیا۔ چاروں طرف سے مجاہدین اور سامان جہاد وغیرہ آنے لگے۔ اور ہر قسم کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ اس سفر اور جہاد کے واقعات وغیرہ کی تفصیلات حضرت سید صاحب کی سوانح اور سیرتوں اور شاندار ماضی جلد ثالث میں مکمل موجود ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ابتداءً حضرت سید صاحب کو بہت عمدہ کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ مگر بعد میں اپنوں کی غداریوں۔ انگریزوں اور سکھوں کی مسلسل سازشوں وغیرہ سے کامیابیاں سست پڑگئیں (اگرچہ مخلصین کا جوش وخروش بڑھتا ہی رہا) بالآخر ۱۲۴۶ھ میں بمقام بالاکوٹ جنگ وجہاد کرتے ہوئے ایک سرحدی مسلمان کی سازش سے مع مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ودیگر رفقاء شہید ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب ہم مذکورہ بالا بیان اور اس کے مأخذ کا حوالہ دیتے ہوئے مختصر طور پر چند باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

(۱) یہ تحریک محض آزادی وطن کے لئے علماء اور فقراء اور غرباء مسلمانوں نے محض بے سروسامانی کے ساتھ شروع کی تھی جس سے عام لوگوں میں اس قدر جوش اور جذبہ سرفروشی پیدا ہوگیا تھا کہ باوجود ہر قسم کی مشکلات اور ناکامیوں کے اخیر زمانہ تک نہیں مٹا۔ فریضہ جہاد کی انجام دہی کا یہ جذبہ ہر چھوٹے بڑے میں پایا جاتا تھا۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ۔ شہری ہو یا دیہاتی۔ عوام ہوں یا خواص۔ مختصر یہ کہ ہر فرد ملت اس نشہ میں سرشار تھا اور اپنی اپنی بساط کے مطابق سرگرم عمل، سب ایک ہی دھن میں لگے ہوئے تھے اور حوادث روزگار اور انگریزی مظالم کے آہنی پنجے سے بے پرواہ ہوکر جس راہ پر گامزن ہوئے اس سے سرمو انحراف نہ کیا۔

صفحہ ۹۰ پر ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے۔

"اب ہمیں اُس مجموعہ قوانین کا حال مختصراً بیان کرنا ہے جو اُن کے پیروؤں نے اُن کی تعلیم سے اخذ کیا اور جس کی وجہ سے اُنہوں نے ہندوستان میں ایک ایسا مذہبی انقلاب برپا کردیا جس کی مثال اس کی گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہی انقلاب ہے جس نے پچاس سال سے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی روح کو دبنے نہیں دیا۔"

صفحہ ۱۰۱ پر ڈاکٹر مذکور لکھتا ہے۔

"۱۸۲۱ء میں امام صاحب (حضرت سید صاحب مرحوم) نے اپنے خلفاء کو منتخب کرتے وقت ایسے آدمیوں کا انتخاب کیا جو بے پناہ جوش و خروش کے مالک اور بہت ہی مستقل مزاج تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح متعدد بار جب یہ تحریک تباہ ہونے کے قریب تھی انہوں نے بار بار جہاد کے جھنڈے کو تباہی سے بچا کر از سر نو بلند کر دیا۔ پٹنہ کے خلفاء جوان تھک واعظ خود اپنے آپ سے بے پرواہ، بے داغ زندگی بسر کرنے والے انگریز کافروں کی حکومت تباہ کرنے میں نہایت چالاک تھے۔ وہ اپنی جماعت کے اراکین کا نمونہ اور ان کے لئے ایک مثال تھے۔ ان کی بہت سی تعلیم بے عیب تھی اور یہ انہیں کا کام تھا کہ انہوں نے اپنے ہزاروں ہم وطنوں کو بہترین زندگی بسر کرنے اور اللہ تعالیٰ کے متعلق بہترین تصور پیدا کرنے کی ترغیب دی۔ مگر صرف اخلاقی نظام ہی ایک بہت بڑی جماعت کو آپس میں اکٹھا نہیں رکھ سکتا۔ اس نئی زندگی کے مذہبی پہلو نے بہت جلد اپنی طاقت کو کھونا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اس تحریک کے ابتدائی لیڈروں کے ماتحت بھی اس میں کمزوری کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور خلفاء کو ہمیشہ اپنے سامعین کے دلوں میں کافروں کے خلاف نفرت کو بار بار مشتعل کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی۔ پٹنہ کے پروپیگنڈا اسٹر نے اسکو صاف طور پر بھانپ لیا تھا اور وقت کی نئی ضروریات کے ساتھ اپنی تعلیم میں مطابقت پیدا کرتے رہے۔ انہوں نے بیدار شدہ ضمیر کی قوت کی دہشت انگیزیوں پر اعتماد کرنے کے بجائے اس سخت اور دائمی نفرت و حقارت کو ابھارے رکھا جو ہندوستانی مسلمان کو انگریزوں سے ہے اس طرح انہوں نے اپنی تعلیم کی بنیاد مسلمانوں کے قلوب کے اعلیٰ ترین قابلیتوں کے بجائے عوام کے تعصبی جوش و خروش پر رکھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کو یہ ضرورت محسوس ہوتی گئی کہ اپنی تعلیم میں باغیانہ حصہ کو مضبوط تر کرتے رہیں" (ص۲۲)

ڈاکٹر مذکور صفحہ ۳۰ پر لکھتا ہے۔

"ہر ایک ضلع کے مبلغین متعصب لوگوں کے گروہ دارالاشاعت میں بھیجتے۔ ان میں سے اکثر کو جن کے جوش کو پٹنہ کے لیڈر اور بھی بھڑکا دیتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں سرحدی کیمپ کی طرف روانہ کر دیا جاتا۔ ان میں سے زیادہ ہوشیار نوجوانوں کو زیادہ دیر تک زیر تربیت رکھنے کے لئے منتخب کر لیا جاتا تھا اور جب وہ باغیانہ اصولوں سے اچھی طرح واقف ہو جاتے تھے تو ان کو ان کے صوبہ کی طرف روانہ کر دیا جاتا۔"

میں اس بات کے لئے بے قرار ہوں کہ پٹنہ کے خلیفوں کی تاریخ کا جو روشن پہلو ہے اس کو بھی منظر عام پر لایا جائے۔ بہترین اخلاقی نظام سے شروع کرتے ہوئے انہوں نے آہستہ آہستہ اپنی تعلیم کے اخلاقی پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا اور اپنی زوال پذیر تحریک کو انسانی دل کے بدترین جذبہ کو اُبھار کر مضبوط کیا" (اگر یہی معاملہ یورپین لوگوں میں آزادی وطن کے لئے ہوتا تو اس قدر مقدس ہوتا کہ تعریف کے پُل باندھ دیئے جاتے۔)

ڈاکٹر مذکور صفحہ ۱۰۵ پر لکھتا ہے:۔

"باغیانہ لٹریچر اور پٹنہ کے پروپیگنڈہ سنٹر کے علاوہ وہابیوں کا دیہاتی علاقوں میں اپنا مذہب پھیلانے کے لئے ایک باقاعدہ اور مستقل نظام تھا گو یہ مقامی مبلغین بعض دفعہ خطرناک آتش بیان ثابت ہوتے لیکن میرے لئے ناممکن ہے کہ میں ان کا نام ادب سے نہ لوں۔ ان میں سے اکثر خدا ترس نوجوان کی حیثیت سے زندگی شروع کرتے ہیں۔ اکثر اپنے اس مذہبی جوش کو آخر تک برقرار رکھتے ہیں جس میں ان زہریلے اصولوں کا جن کے ماتحت پٹنہ کے واعظین نے ان کو تربیت دی تھی شائبہ تک نہیں ہوتا"

پٹنہ کا مجسٹریٹ سرکاری دستاویزات متعلقہ ۱۸۶۵ء میں لکھتا ہے۔

"ان لوگوں نے ہمارے گنجان آباد ضلعوں کے ہر گاؤں میں خود حکومت کے افسروں کی زیر حفاظت اور زیر سایہ علانیہ بغاوت کی تبلیغ کی۔ مسلمان آبادی کے دلوں کو بے قرار کیا اور فتنہ و فساد کے لئے ایسا حیرت انگیز اقتدار حاصل کیا جیسا کہ ظاہر ہے۔

اس پر ڈاکٹر ہنٹر کہتا ہے:۔

"بہر حال اس حیرت انگیز اقتدار کے سرچشمہ کی بنیاد فتنہ و فساد نہ تھی۔ سید صاحب نے اپنی پیغمبرانہ زندگی کی بنیاد انہیں دو اصولوں کی نشر و اشاعت پر رکھی جن کو تمام مبلغین کام میں لاتے آئے ہیں۔ یعنی وحدانیت اور مساوات۔ اُنہوں نے الہامی یقین کے ساتھ عوام کی مذہبی حمیت سے انصاف چاہا۔ ان کے ملکی بھائیوں کے دلوں میں یہ مذہبی حمیت مردہ ہو چکی تھی اور صدیوں تک ہندوؤں کے میل جول سے اُن کے اسلام میں بہت سی بدعات پیدا ہو چکی تھیں۔ اُن پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ اسلام کی

حقیقی تعلیم بُت پرستی کے مراسم کے نیچے دب چکی ہے " (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۶۷ از ڈاکٹر ہنٹر)

ص۱۴۳ میں لکھا ہے :-

" اس بغاوت کے تین نمایاں پہلو ہیں جو مقدمہ کے دوران میں ظاہر ہوئے وہ یہ ہیں - پہلی وہ حیرت انگیز قابلیت جس سے دور دراز تک پھیلی ہوئی بغاوت کو منظم کیا گیا - دوسرے وہ رازداری جس کے ساتھ مختلف پیچیدہ کارروائیاں عمل میں لائی گئیں - تیسرے وفاداری کا وہ رویہ جو اس کے ممبروں نے ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھا - اُن کی کامیابی کا راز اُن کے عمدہ فرضی ناموں کی ترکیب اور خفیہ زبان پر تھا الخ "

مندرجہ بالا نوٹوں سے (جو کہ ایک اُس دشمن انگریز کے بیانات کے اقتباسات ہیں جس نے اس بارہ میں بہت چھان پھٹک کی ہے اور بہت سے اُمور کا خود معائنہ کیا ہے) ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تحریک مسلمانوں کی اٹھائی ہوئی نہایت منظم اور دیرپا اور موثر تھی اور اُس نے تمام ملک میں اندر اور باہر ایسی بڑی ہلچل پیدا کر دی کہ مدبران برطانیہ لرزہ براندام ہو گئے - اس قدر جوش اور قربانی کے جذبات پیدا کر دیئے کہ جس کی نظیر اس ملک میں کبھی پائی نہیں گئی اس میں فسادات اور ظلم، غریبوں اور ناکردہ گناہ کو ستانا، امن و امان کو تباہ کرنا جیسا کہ کمیونزم میں یا تقسیم بنگال (بنگال پارٹیشن) کے زمانہ میں نمودار ہوا قطعاً نہیں تھا - ہاں متحارب قوت یعنی انگریزوں اور اُن کے حلیفوں کے ساتھ جو بھی اقتضار وقت تھا عمل میں لایا گیا -

(۲) اس تحریک میں اگرچہ غیر مسلموں یعنی ہندوؤں کو بھی دعوت دی گئی مگر سوائے راجہ رام توپچی کے اور کسی ہندو کی شرکت کسی جنگ میں معلوم نہیں ہوتی راجہ رام راجپوت تھے اور آسمان زئی کی جنگ میں اُنہوں نے ہی توپخانہ کے فرائض انجام دیئے ہیں -

(۳) یہ تحریک آزادئ ہند ۱۸۰۶ء یا ۱۸۰۳ء سے شروع ہوئی اور ۱۹۴۷ء کی آزادی ہند تک باقی رہی - اس کی جنگی کارروائی صوبہ سرحد میں ۱۸۲۶ء میں شروع ہوتی ہے - باقی بیس برس گذشتہ زمین تیار کرنے اور تمام لوازمات کے پورے کرنے میں خرچ ہوتے ہیں - چھ برس متواتر جنگ رہنے اور بکثرت فتحمند ہونے اور اپنوں کی غداریوں کی بنا پر جبکہ ۱۸۳۱ء میں حضرت سید صاحب اور مولانا محمد اسماعیل صاحب اور

بہت سے مجاہدین شہید ہو جاتے ہیں اور باقیماندہ لوگوں میں سے بہت سے حضرات اپنے اپنے اوطان کو واپس آجاتے ہیں تب بھی ایک جماعت مسلمان مجاہدین کی وہاں باقی رہتی ہے اور اپنی تمام جدوجہد کی کارروائیوں کو سرگرمی کے ساتھ عمل میں لاتی رہتی ہے۔ وہ مایوس نہیں ہوتی اس پر نامردی اور نامرادی کا اندھیرا موثر نہیں ہوتا اس کی جماعت ہزاروں سے بڑھتے بڑھتے بعض اوقات میں لاکھ تک پہونچ جاتی ہے۔ عام مسلمانان ہند میں وہی جذبہ اور جوش آزادی اور جہاد کا اس قدر زوروں پر قائم اور موثر ہے کہ رنگروٹ مہیا کرتے ہیں۔ مالی امداد نہایت مخفی طریقوں پر سالہا سال سے جاری کئے ہوئے ہیں۔ گورنمنٹ برطانیہ انتہائی سختی سے اس سب کو اپنی ہمہ گیر قوت سے دبانا چاہتی ہے مگر باوجود شدید مظالم اور زمانہ کی درازی کے کامیاب نہیں ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ہنٹر ۱۸۵۲ء کے متعلق کہتا ہے:۔

"روپیہ اور آدمی ہمارے علاقہ سے ستیانا کیمپ کو متواتر جا رہے تھے۔ اس سلسلہ میں حکومت پنجاب نے ہماری فوج کے ساتھ سازشی خط و کتابت بھی پکڑلی تھی۔ یعنی انہوں نے (مجاہدین نے) کمال عیاری کے ساتھ ہماری ایک دیسی پیادہ فوج کے ساتھ سازش کی تھی جو اس وقت راولپنڈی میں مقیم تھی اور منتصب نو آبادی کے بہت ہی قریب تھی اگر وہ ہمارے صوبہ پر چڑھائی کرتے تو یہی رجمنٹ تھی جو سب سے پہلے ان کے مقابلہ کے لئے بھیجی جاتی۔ ان خطوط سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی تھی کہ بنگال سے باغی کیمپ تک روپیہ اور آدمی پہونچانے کے لئے ایک باقاعدہ نظام موجود ہے"

(ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۳۷)

"۱۸۵۳ء میں ہمارے بہت سے سپاہی غداروں کے ساتھ خط و کتابت کرنے کے جرم میں سزایاب ہوئے" (ص۳۰)

"میں ان بے عزتیوں، حملوں اور قتل و غارت کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا ہوں جو ۱۸۵۶ء میں سرحدی جنگ کا باعث ہوئے۔ اس دوران میں مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکسائے رکھا۔ ایک ہی واقعہ تمام حالات کو واضح کر دے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ (۱۶) فوجی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے جس

سے باقاعدہ فوج کی تعداد ۲ ہزار ہوگئی تھی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۳ء تک ان مہمات کی گنتی بیس تک پہونچ گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار تک ہوگئی تھی بےقاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی (ص ۳۹ ہندوستانی مسلمان)

ان مہمات کے علاوہ ۱۸۵۸ء، ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۸ء میں بڑی فوجوں کے ساتھ مجاہدین پر چڑھائی کی گئی اور اگرچہ حسب عادت اپنی کامیابی اور مجاہدین کی موت کے راگ گائے گئے مگر خود ڈاکٹر ہنٹر اقرار کرتا ہے :۔

"۱۸۶۳ء کی لڑائی میں ہم نے کافی نقصان اٹھانے کے بعد یہ سبق حاصل کیا تھا کہ مجاہدین کے کیمپ کے خلاف مہم روانہ کرنا دنیا کے (۵۳۰۰) جنگجو اور بہادر انسانوں کی مجموعی طاقت کے ساتھ جنگ کرنا ہے" (ص ۴۷)

۱۸۶۳ء میں ایک موقعہ پر ہمارے خلاف ان جنگجوؤں کی تعداد ساٹھ ہزار ہوگئی تھی۔ (حاشیہ ص ۴۷)

انگریزی گورنمنٹ نے ان مجاہدین کو نیست و نابود کر دینے کی انتہائی کوشش کی اور ایڑی سے چوٹی تک زور لگایا اور بسا اوقات اپنی فتحمندی کے شادیانے بھی خوب بجائے۔ روپئے پانی کی طرح بہائے ہندوستانی فوجیوں کو بھیڑ اور بکری کی طرح ذبح کرایا اور کامیابی کے ڈنکے بھی بجائے مگر حقیقت معلوم کرنیکے لئے مندرجہ عبارت گورنمنٹ پنجاب کی ملاحظہ فرمائیں۔

"پنجاب گورنمنٹ نے مہم کے نتائج کو بیان کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا کہ مہم ختم بھی ہوگئی اور ہم اس قابل نہ ہوئے کہ ہندوستانی مجاہدین کو وہاں سے نکال باہر کریں یا ان کو اس بات پر ہی آمادہ کر سکیں کہ وہ اطاعت قبول کرلیں اور ہندوستان میں اپنے گھروں کو واپس آجائیں (ہندوستانی مسلمان ص ۴۷ پنجاب گورنمنٹ کا خط الخ)

ڈاکٹر ہنٹر اپنی کتاب کے باب اول کے خاتمہ کو مندرجہ ذیل عبارت سے پورا کرتا ہے۔

"اب میں نے اپنی سرحد پر اس باغی کیمپ کی تمام تاریخ ۱۸۳۱ء سے جبکہ اس کی ابتدا ہوئی ۱۸۶۸ء تک جبکہ آخری مرتبہ انہوں نے ہم کو جنگ میں دھکیلا بیان کر دی ہے۔ وہ تمام مصیبتیں جو انہوں نے سکھ حکومت کے وقت سرحد پر نازل کی تھیں وہ تمام ایک تلخ وراثت کی صورت میں ہم تک پہونچیں اس نے تمام سرحد میں تعصبی جذبات کو برقرار رکھنے کے علاوہ تین مرتبہ قبائل کو یکجا اکٹھا کر دیا جس کی وجہ سے

برطانوی ہند کو ہر ایک موقعہ پر بہت ہی مہنگی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ یکے بعد دیگرے ہر گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ یہ ہمارے لئے ایک مستقل خطرہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کے تباہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اب تک بھی یہ ہماری غیر وفادار رعایا اور ہمارے سرحد پار کے دشمنوں کی امیدوں کا مرکز بنا ہوا ہے ہم نہیں جانتے کہ کس وقت ہم قبائل کی خانہ جنگیوں کی لپیٹ میں آجائیں گے جو وسط ایشیا میں ہر وقت جاری رہتی ہیں مگر اس وقت یہ عین ممکن ہے کہ اس سال کے ختم ہونے سے پہلے ایک اور افغانی جنگ لڑنی پڑے۔ یہ جنگ جب کبھی بھی ہوگی (اور جلد یا بدیر یہ ہو کر رہے گی) تو ہماری سرحد پر غدار آبادی ہمارے دشمنوں کو ہزارہا آدمی مہیا کر سکے گی۔ ہمیں ان غداروں کی اپنی ذات سے کوئی ڈر نہیں۔ اگر ہمیں ڈر ہے تو ان شورش پسند عوام سے ہے جن کو یہ مجاہدین ہمارے خلاف جہاد کرنے کے لئے بار بار اکٹھا کرتے ہیں نو صدیوں کے دوران میں ہندستانی لوگ شمال کی طرف سے حملہ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں اور کوئی شخص اس اہمیت کے متعلق پیشگوئی نہیں کر سکتا جسے یہ باغی کیمپ مغربی مسلمان خانہ بدوش گروہوں کی مدد سے ایک ایسے لیڈر کی سرکردگی میں جو اپنے اندر ایشیا کی قوموں کو جہاد کرنے کے لئے اکٹھا کر سکتا ہو حاصل کر سکتا ہے۔"

(رسالہ ہندستانی مسلمان از ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۶۴ و ۶۵)

مذکورہ بالا نوٹ صاف بتلاتا ہے کہ یہ تحریک اور اس کے چلانے والے اس قدر عالی ہمت، مستقل مزاج، جفاکش اور منظم تھے کہ انگریزوں کی انتہائی بربریت اور درندگی بھی ان کو فنا نہ کر سکی۔

(۴) اس تحریک میں رازداری اور اخلاص و دیانت داری اعلیٰ پیمانہ پر تھی بے شمار مقدمات چلائے گئے اور ہر قسم کی شیطانی تدبیریں کام میں لائی گئیں مگر انگریزوں کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۲۶ پر لکھتا ہے:۔

"بہت مدت تک مجاہدین سرحد کی اس حیرت انگیز قوت کا سرچشمہ ایک راز بنا رہا۔ اس ہندستانی حکومت نے جو ہم سے پہلے پنجاب پر حکمراں تھی اُسے تین مرتبہ منتشر کیا اور تین دفعہ یہ انگریزی فوج کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے لیکن باوجود اس کے یہ ابھی تک زندہ ہیں اور دیندار مسلمان

ان کے معجزانہ طور پر زندہ رہنے کو ہی آخر کار غالب ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت اس سرحدی نوآبادی کو ہم فوجی قوت کے بل بوتے پر تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس وقت ہماری مسلمان رعایا کے متعصب عوام ان کو لاتعداد آدمیوں اور روپیوں سے مدد دیکر گویا ان چنگاریوں کو ہوا دیتے رہتے ہیں جنہیں ہم نے خاک سمجھ کر چھوڑ دیا تھا مگر جن کی بجھی ہوئی راکھ سے ایک دفعہ پھر شعلے اٹھنے لگتے ہیں۔"

مقدمات بہت سے چلائے گئے اور لوگوں کو سزائیں نہایت بے دردی اور بربریت سے دی گئیں۔ بالخصوص پانچ مقدمے بڑے پیمانہ پر ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۰ء تک سازشوں کے چلائے گئے جن کا تعلق اسی مجاہدین کے کیمپ اور اس کی امداد سے تھا۔[۵]

ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۱۲۳ میں لکھتا ہے۔

"گذشتہ سات سال کے دوران میں ان غداروں کو یکے بعد دیگرے مجرم ثابت کر کے عمر قید بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔"

مجاہدین یا اُن سے تعلق رکھنے والوں یا مشتبہ لوگوں پر مقدمات میں جس قدر مظالم، ایذا رسانی، توہین و تذلیل، مار پیٹ وغیرہ خلاف انسانیت اور خلاف تمدن کارروائیاں کی جاتی تھیں اُن کو سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ برطانیہ کی تواریخ ان وحشیانہ اعمال کی وجہ سے نہایت گندی اور سیاہ ہے۔ پولیٹیکل قیدیوں کے ساتھ جن امور کا تصور بھی متمدن حکومتوں میں ناجائز شمار کیا جاتا ہے اُن پر عملدرآمد کرنے میں انگریزان شریف النفس

---

۵ اس زمانہ میں مسلمانوں کی اس قدر تنظیم تھی کہ ایک صوبہ میں وہابیوں کی نگرانی کے لئے انتظامی اور عدالتی اخراجات تک پورے ایک ضلع کی آمدنی صرف ہو جاتی تھی اور تب بھی سرکاری گواہ نہ ملتے تھے اس لئے کہ وہ مجرموں کے خلاف گواہی دینے پر موت کو ترجیح دیتے تھے۔ انجام کار حکومت نے مسلمانوں کے بارہ میں اپنی پالیسی کی غلطی محسوس کی اور انگریز مدبران ملک نے تسلیم کیا کہ مسلمانوں پر زیادتیاں ہوئی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے ۱۸۷۰ء میں اپنی حکمت عملی بدلی اور طے کیا کہ مسلمانوں کو پڑھا کر وفادار بنایا جائے اس طرح ۱۸۷۰ء میں بارہ سال کا وہ زمانہ ختم ہوا (یعنی ۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۰ء تک) جس میں خالص مسلمان حکومت (برطانیہ) کے مقابلہ میں اس قدر قربانیاں کرتے رہے جن کی تفصیل کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں اور اس زمانہ میں ہندو نہ صرف آرام کرتے رہے بلکہ حکومت کی برکات سے مستفیض ہوتے رہے۔ (روح روشن مستقبل صـ ۱۹۱)

انسانوں کے لئے جھجک بھی محسوس نہیں کرتے تھے اور ایسے ایسے ملعون اور منحوس معاملات ان شرفاء کے ساتھ عمل میں لایا کرتے تھے جو کہ بدترین اخلاقی قیدی کے ساتھ بھی گوارا نہیں کئے جا سکتے تھے کچھ تفصیلات ان امور کی مولانا محمد میاں صاحب نے شاندار ماضی کی جلد ثالث میں نقل فرمائی ہیں۔ طوالت کی وجہ سے ہم ان کو چھوڑتے ہیں۔

الحاصل یہ مجاہدین اور اُن کے مددگار مسلمان وہ شریف النفس اور شریف اخلاق والے لوگ تھے جن کو ڈاکٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر بار بار مجبور ہو کر انتہائی تعریفی کلمات سے یاد کرتا ہے مگر اُن کو ہر طرح ستایا گیا۔ اُن کو سخت سے سخت سزائیں، پھانسی، عبور دریائے شور، عمر قید، توہین و تذلیل وغیرہ کی دی گئیں۔ تاہم نتیجہ کیا ہوا، خود ڈاکٹر ہنٹر سے پوچھیے۔ صفحہ ۴۴ پر لکھتا ہے:۔

لیکن ۱۸۶۴ء کا سیاسی مقدمہ غداروں کے جوش کو ٹھنڈا کرنے میں ویسا ہی ناکام ثابت ہوا جیسا کہ ۱۸۶۳ء کی تادیبی مہم۔ اُن کے اندرونی اختلافات نے کچھ سالوں کے لئے انہیں سرحد پر خاموش رکھا مگر اس کے باوجود ہمارے علاقہ میں جہاد کی تبلیغ بدستور جوش و خروش کے ساتھ ہوتی رہی مشرقی بنگال کے ہر ضلع میں بغاوت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ دریائے گنگا کی وادی میں پٹنہ سے لیکر سمندر تک کے مسلمان کسان مجاہدین کے کیمپ کے لئے ہفتہ واری امداد کے نذرانے مخصوص کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔"

صفحہ ۱۵ پر لکھتا ہے۔

" سرحد پر تباہ کن جنگیں اور اندرون ملک میں عدالتی سزائیں اس قابل نہ ہوئیں کہ مجاہدین کے اتحاد کو توڑ سکیں۔"

مندرجہ بالا تاریخی اقتباسات جو کہ عموماً صحیح ہیں مبالغہ کا ان میں شائبہ بھی نہیں ہے بلکہ واقعات سے بہت کم ہیں ناظرین غور فرمائیں اور دیکھیں کہ مسلمانوں کی جدوجہد اور تحریک آزادی ہند میں جانبازی اور سرفروشی کس قدر عظیم الشان اور کس بلندی پر پہونچی ہوئی اور کس قدر پرانی ہے کیا کوئی دوسری جماعت اس کے مقابل تاریخی اعتبار سے اپنا یا اپنی جماعت کا نام پیش کر سکتی ہے۔

(۱) یہ جماعت ۱۸۱۸ء سے وجود میں آئی (۲) اس جماعت نے کھلے بندوں آزادی کی تحریک کی اور

لوگوں کو جہاد کے لئے آمادہ کیا (۳) اس جماعت کا مقصود فرقہ وارانہ آزادی نہ تھا (۴) اس جماعت کا مقصد خود حکومت کرنا نہ تھا (۵) اس جماعت نے ملک کے اکثر حصہ میں دورہ کر کے آزادی کا جوش وخروش پیدا کیا (۶) اس جماعت نے باقاعدہ تنظیم کی ہر ہر ضلع، صوبہ اور قصبات وغیرہ میں مراکز بنائے اور عہدہ دار مقرر کئے۔ (۷) یہ جماعت سرحد تک کئی ہزار میل سفر کر کے جبکہ ریل، ہوائی جہاز، موٹریں نہ تھیں ہر قسم کی تکالیف جھیلتی ہوئی ہزاروں جانفروشوں کو لئے ہوئے پہاڑوں، دشوارگذار دروں، ریگستانوں کو عبور کرتے ہوئے براہ سندھ قندھار، کابل درۂ خیبر صوبہ سرحد میں پہونچتی ہے (کیونکہ انگریز نے کسی دوسرے راستہ سے جانے نہیں دیا تھا) اور آزادی کی جدوجہد عملی طور پر شروع کرتی ہے۔ (۸) یہ جماعت غریبوں کی ہے اس کے پاس رسد وغیرہ کا پورا سامان نہیں ہے فاقوں پر آدھے پیٹ کھاتے پر پاؤ پیٹ کھانے پر سوکھے چھوٹے کھانے پر گذر کرتی ہے اور پھر دشمن پر یلغار کرتی ہے (۹) اس جماعت کی پارٹیاں تقریباً ڈیڑھ ہزار میل سے مالی اور جانی امداد کرتی ہیں۔ راستہ میں انگریز پکڑتے ہیں سزائیں دیتے ہیں مگر یہ نظام جاری ہے (۱۰) یہ جماعت انگریزوں کی طرف سے ہر قسم کی ہلاکتوں اور ..... ایذاؤں کا نشانہ بنتی ہے اور تحمل کرتی ہے مگر آزادی کی جدوجہد اور انگریز دشمنی سے باز نہیں آتی۔ انگریز لالچ دیتا ہے قبول نہیں کرتی۔ انگریز ڈراتا ہے مگر نہیں ڈرتی (۱۱) اس جماعت کو سرحدی قبائل نے انگریزی سازشوں میں آکر برباد کرنا چاہا۔ اس کے امام کو زہر دیا۔ میدان جنگ میں غدر کیا۔ کئی مرتبہ متفق ہو کر اس جماعت کے منتشر لوگوں کو جہاں پایا قتل اور شہید کیا۔ دشمنوں سے مل گئے مگر یہ سخت جان جماعت آزادی کی متوالی آج تک اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح جمی ہوئی ہے۔ (۱۲) انگریزوں نے بارہا اس پر چڑھائی کی اور اس کے گھر بار کو بزعم خود جلا کر اور فنا کر کے چلے آئے پھر بھی وہ باقی ہے اور لڑائیوں میں وہ پچاس ہزار ساٹھ ہزار حتیٰ کہ ایک لاکھ تک مردانِ میدان انگریزوں کے مقابلہ میں کھڑے کر دیتی ہے (۱۳) کابل کی جنگ میں ایک ہزار مردانِ میدان کو انگریزوں کے خلاف افغانیوں کی مدد میں پیش کر دیتی ہے۔ (۱۴) اس حال پر ایک صدی سے زیادہ اس پر گذرتا ہے۔ ہندوستان کے آزاد ہونے تک یہ اسی طرح جمی رہتی ہے (۱۵) اس جماعت کا مقصد غیر وطنیوں کو نکالنا اور ہندوستان میں جمہوری حکومت قائم کرنا۔

میں اہلِ انصاف وعقل سے بزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ سوچیں اور مدعیانِ پیشقدمی دربارہ جدوجہد

آزادی کی غلطیوں اور مسلمانوں کی انسانی مخلصانہ اور سرفروشانہ خدمتوں کو طشت از بام کریں

جہاد حریت ۱۸۵۷ء

اب ہم ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کے متعلق کچھ عرض کریں گے مگر چونکہ اس بارہ میں بہت سی تحریرات مختصر اور طویل لکھی جا چکی ہیں اس لئے ہم غیر ضروری تفصیلات اور غیر مناسب واقعات کو درج کر کے ناظرین کے اوقات ضائع نہ کریں گے۔ اگرچہ انگریزوں کے خوف سے اس زمانہ میں بلکہ ابعد تک پورے اور صحیح واقعات کا لکھنا اور شائع کرنا ممکن نہ تھا اس لئے عام طور پر لوگوں کے علم میں سب واقعات نہیں آئے ہاں اس زمانہ کے موجود لوگوں سے روایتیں پہونچیں جن کو کسی کتاب میں استیعاب کے ساتھ جمع ہونا میرے علم میں نہیں آیا۔ انگریزوں نے اپنی وحشیانہ درندگیوں کو چھپانے اور اہل ہند (ہندو اور مسلمانوں) کو شیطان اور وحشی وغیرہ ثابت کرنے کے لئے سو سے زیادہ تصانیف کیں مگر سب کی سب تقریباً جھوٹے اتہامات سے پُر اور حقیقت سے خالی ہیں۔ صرف ایڈورڈ ٹامسن کی تصنیف انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ کسی قدر بلکہ بڑے درجہ تک قابل اعتبار معلوم ہوتی ہے۔

جہاں تک واقعات اور احوال خبر دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو انگریز اپنی کامیابیوں اور بڑھتی ہوئی قوت کے نشہ میں اس قدر چور اور بدمست ہو گئے تھے کہ نہ کسی عہد نامے کا خیال رہا تھا نہ کسی راجہ مہاراجہ نواب بادشاہ کو خیال میں لاتے تھے۔ تمام ہندوستانیوں کو خواہ ہندو ہو یا مسلمان انتہائی ذلت کی نظر سے دیکھتے تھے اور بات بات پر تحقیر و توہین سے بھرے ہوئے کلمات اور اعمال استعمال کرتے تھے جیسا کہ وارن ہیسٹنگز کا مقالہ ہم پہلے نقل کر آئے ہیں " انگریز ہندوستان میں آکر ایک نیا انسان بن جاتا ہے جن جرائم کو وہ انگلستان میں خیال میں بھی نہ لا سکتا تھا ان کے کرنے کے لئے یہاں صرف اپنا انگریز ہونا کافی سمجھتا ہے " اسی طرح لارڈ سدنہم بھی اسی کے قریب کہتا ہے۔

الغرض جس قدر بھی زمانہ آگے بڑھتا جاتا تھا انگریزی عہد شکنیاں اور نئے نئے مظالم طرح طرح کے روپ میں ظاہر ہوتے جاتے تھے۔ دوسری طرف ہندوستانیوں کی ہر قسم کی زندگی روز بروز ایسی قلاکتوں

اور مصیبتوں کے گڑھوں میں گرتی چلی جاتی تھی کہ جس کا پہلے لوگوں کو وہم وگمان بھی نہ ہوتا تھا۔ ریاستیں حلاف معاہدہ ضبط ہو رہی تھیں اور ان کو اپنے خالص علاقہ میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ گدی نشین کو طرح طرح کے حیلوں سے برطرف اور محروم کر دیا جاتا تھا۔ معمولی معمولی حیلوں بلکہ غلط اور جھوٹے پروپیگنڈوں سے جن کے یہ بین لوگ عموماً اور انگریز قوم خصوصاً عادی ہیں والیان ریاست پر حملہ یا ان کی معزولی عمل میں آتی رہتی تھی۔ وغیرہ وغیرہ

حسب قول مشہور "تنگ آمد بجنگ آمد" مجبور ہو کر آزادی کے لئے کوشش کرنا ضروری سمجھا گیا۔ نیز وہ لوگ جو کہ سید صاحب کی تحریک میں داخل ہو کر سرحد پر پہونچے تھے اور وہاں کی لڑائیوں اور جہادی کارروائیوں میں شریک رہے تھے اور بالاکوٹ میں سید صاحب کے شہید ہو جانے کے بعد اپنے اوطان کو واپس آ گئے تھے اور وہ لوگ جو کہ حضرت سید صاحب کے مریدا ور ان کی تحریک میں کسی درجہ تک شریک تھے ان لوگوں کے قلوب ہمیشہ آزادی کی تڑپ سے بے چین رہتے تھے اس لئے تمام ہندوستانیوں نے عموماً اور مسلمانوں نے خصوصاً اس انقلاب ۱۸۵۷ء کو ضروری سمجھا اور مقرر کیا گیا کہ ۱۱ر مئی کو تمام ہندوستان میں انقلابی کارروائی عمل میں لائی جائے اور علم جہاد بلند کیا جائے مگر افسوس اس پر عمل نہیں ہوا۔ بلکہ ۲۲ر مارچ کو مدم (صوبہ بنگال) میں منگل پانڈے کے ہاتھوں (تقریباً دوماہ پہلے) یہ آتشیں مادہ بھڑک اٹھا۔ ابھی دوسری جگہ تیاریاں نہیں ہوئی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی میں باقاعدہ جہاد کے شروع ہونے تک بنگال کی تحریک تقریباً ختم ہو چکی تھی اور پھر پنجاب میں تحریک اس وقت شروع ہوئی جب دہلی اور کانپور کے حالات پر انگریز قابو پا چکے تھے۔ مدراس، بمبئی، حیدرآباد یعنی جنوبی ہند میں اس وقت تک کچھ کام نہ ہو سکا تھا۔ ان صوبوں میں نہایت خفیف سا اثر ہوا۔ جس پر بآسانی قابو پا کر شمالی ہند کی اصلاح کے لئے فوجیں روانہ کی گئیں۔ بہرحال وقت مقررہ پر شروع نہ ہونا ناکامی کا بڑا سبب تھا[۱]۔ (شاندار ماضی ج ۴ ص ۲۳۰ و ص ۲۹۹)

---

[۱] دوسری وجہ سکھوں کی مخالفت تھی۔ ابھی دس سال نہیں ہوئے تھے کہ انگریز نے سکھوں کی آزادی سلب اور ان کی حکومت غصب کی تھی اس تازہ مصیبت پر سکھوں کو سب سے زیادہ مشتعل ہو جانا چاہیئے تھا لیکن وہ تلخ تاریخ جس کی بنا پر ہندو اور مسلمان دونوں کو سکھوں سے سخت شکایت اور بہت زیادہ تلخی تھی۔ سکھوں کے پیش نظر تھی اور انھوں نے انگریز کی وفاداری ہی میں اپنی جماعت کا فائدہ تصور کیا سکھوں کے اسی طرز عمل کا اثر تھا کہ پنجاب میں تحریک کمزور رہی۔ البتہ صوبہ سرحد نے نہایت پامردی اور مستعدی کے ساتھ حق وفا ادا کیا اور وطن دوستی کا کامل ثبوت دیا۔ (۳) نظام حیدرآباد مرہٹوں اور دوسری حریف قوموں سے مقابلہ کے لئے ابتدا ہی سے

ہمارے اکابر کا ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لینا

ہمارے تمام اکابر (علماء دیوبند و سہارنپور و مظفر نگر) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور اُن کے تلامیذ کے شاگرد اور خوشہ چین رہے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ حضرت شاہ صاحب اور اُن کے خاندان کے مسلک اور حکم کے خلاف چلیں۔ چنانچہ جب سید صاحب کی تحریک جہاد شروع ہوئی تو حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب شہید ولایتی (دادا پیر حضرت حاجی امداداللہ صاحب مکی) اور حضرت شاہ نصیرالدین صاحب دہلوی (سابق پیر و مرشد حضرت حاجی امداداللہ صاحب) اور بہت سے حضرات (اطراف سہارنپور مظفر نگر وغیرہ کے) شریک تحریک ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ سرحد میں جا کر شہید ہوئے۔ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے اعلیٰ جذبات

(بقیہ حاشیہ ص۴۰) انگریزوں کا حامی تھا اس سلسلہ میں وہ سلطان ٹیپو کے برخلاف انگریزوں کا مددگار رہا تھا اس وقت مرہٹے اور دربار دہلی اور اودھ (یعنی نظام حیدرآباد کی حریف طاقتیں) انگریزوں کے خلاف تھیں اور اس بنا پر لازم تھا کہ نظام حیدرآباد انگریزوں کی مخالفت میں کوئی دلچسپی نہ لے۔ لیکن اس کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ پورا جنوبی ہند انگریز کے لئے پناہ گاہ بن گیا (۴) کابل پر کچھ فوجیں انگریزوں کی پہونچی ہوئی تھیں۔ اسی طرح چین پر حملے کے لئے دیگر ممالک سے برطانوی فوجیں آرہی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس، روس اور دیگر ایشیائی حکومتوں کا راستہ بھی بند ہو گیا۔ اور تازہ دم فوجیں انگریزوں کو فوراً دستیاب ہو گئیں۔ جس کا نتیجہ ہندوستان کی غلامی اور شکست تھا۔ اگرچہ خوشگوار نتیجہ یہ رہا کہ چین اور افغانستان و ایران کو برطانوی اقدام سے نجات مل گئی۔ خیر یہ بھی اچھا ہوا ہم تباہ ہو گئے مگر ہمارے پڑوسی تو نجات پا گئے۔ ایک دوسرا خوشگوار نتیجہ اور بھی ہے وہ یہ کہ اس وقت جس شدومد سے عیسائی بنانے کی تحریک جاری تھی وہ بند کر دی گئی۔ اگرچہ اس کے بعد لامذہب بنانے کی پالیسی پر قوت سے عمل ہوتا رہا اور ہو رہا ہے مگر پادریوں کا زور یقیناً کم ہو گیا۔ (شاندار ماضی ص۴۹)

(۵) آپس کی مخالفت اور رقابت جو کہ انتہائی جہالت اور رذالت پر مبنی تھی۔ ہم عنقریب ذکر کریں گے کہ دہلی میں خود بادشاہ کا بیٹا مرزا مغل اور سمدھی مرزا الٰہی بخش ہر قسم کی امداد انگریزوں کو دے رہے تھے اور جنرل بخت خاں کی اور مجاہدین کی ہر قسم کاٹ میں مصروف تھے جسکی وجہ سے فوج میں پھوٹ پڑ گئی اور کامیابی نہ ہو سکی۔ حالانکہ انگریزوں نے مرزا مغل کو قبضہ پاتے ہی معاس کے دو بھائیوں (مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر) کے قتل کر کے ان کا سر طباق میں رکھ کر بادشاہ کو بطور تحفہ پیش کیا۔ البتہ مرزا الٰہی بخش (سمدھی بادشاہ) کو تھوڑے سے وظیفہ کے ساتھ ذلت میں باقی رکھا۔

حریت و جہاد اور ان کی تعلیمات روحانیہ سے ان حضرات کو انتہائی شغف اور حسن اعتقاد رہتا تھا۔ سرحد کی ناکامی اور آپس کی غداریوں سے ان حضرات کے قلب میں انتہائی قلق اور اضطراب ہمیشہ محسوس ہوتا رہتا تھا جب انقلاب ۱۸۵۷ء کی تحریک اطراف و جوانب ہند خصوصاً اطراف دہلی میں چلنی شروع ہوئی تو ان حضرات کے جوش حریت میں نئی حرکت پیدا ہوئی ان بزرگوں نے محسوس کیا کہ اس انقلاب میں حصہ لینا فرض اور لازم ہے۔ انگریزوں کے افعال ماضیہ اور احوال حاضرہ پر بخوبی مطلع تھے اس تمام جماعت میں حضرت حافظ ضامن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز زیادہ پیش پیش تھے (حضرت حافظ صاحب قطب العالم میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اولین اور اعلیٰ ترین خلفاء میں سے تھے نسبت روحانیہ نہایت قوی اور بے مثل پائی تھی۔ میانجی صاحب مرحوم کی وفات کے وقت تک حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی تکمیل سلوک تصوف پوری نہیں ہوئی تھی تو میانجی صاحب نے حضرت حاجی صاحب کو تکمیل کے لئے حافظ ضامن صاحب ہی کے سپرد کیا تھا) حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریک انقلاب میں حافظ صاحب کے ہم نوا ضرور تھے مگر پیش پیش اور اس قدر زیادہ جوش میں نہ تھے۔ اسی قصبہ تھانہ بھون میں میاں جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تیسرے خلیفہ مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے چونکہ تینوں حضرات پیر بھائی اور ایک ہی مقدس ہستی میاں جی صاحب کے دریوزہ گر تھے۔ اس لئے آپس میں میل جول اتحاد و اتفاق بڑے پیمانہ پر رہتا تھا۔ مگر مولانا شیخ محمد صاحب علوم عربیہ کے باقاعدہ فاضل تھے۔ علماء دہلی سے تمام نصاب علم ظاہر پڑھ چکے تھے۔ بخلاف حضرت حافظ صاحب اور حاجی صاحب کے کہ دونوں حضرات نے علوم عربیہ کی تکمیل نہیں کی تھی۔ اگرچہ نسبت باطنیہ میں بدرجہا بڑھے ہوئے تھے۔ اس بنا پر مسائل شرعیہ میں ہر دو حضرات مولانا شیخ محمد صاحب ہی کا اتباع کرتے تھے۔ بد قسمتی سے مولانا کی رائے یہی تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔ اس اختلاف اور فتویٰ کی بنا پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو اُن کے اوطان سے دونوں حضرات نے بلوایا (یہ دونوں حضرات اس سے بہت پہلے حضرت شاہ عبد الغنی صاحب مجددی اور حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی اور حضرت مولانا مملوک علی صاحب اور دیگر اساتذہ دہلی سے سند فراغ علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کر چکے تھے اور اپنی ذکاوت اور مہارت میں پوری شہرت حاصل کر کے سلوک و طریقت کی منازل بھی طے کر چکے تھے) جب ہر دو حضرات (مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما)

پہونچ گئے تو ایک اجتماع میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا (چونکہ وہ پچا پیر تھے اس لئے ہمیشہ اُن کا ادب کیا جاتا تھا) کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنان دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے تو اُنھوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سر و سامان ہیں۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوہ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب مرحوم نے سکوت فرمایا۔ اس پر حافظ ضامن صاحب نے فرمایا کہ مولانا بس سمجھ میں آگیا اور پھر جہاد کی تیاری شروع ہوگئی اور اعلان کر دیا گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو امام مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو قاضی بنایا گیا۔ اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو میمنہ میسرہ (دائیں اور بائیں) کا افسر قرار دیا گیا۔ چونکہ اطراف و جوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے تقویٰ، علم (تصوف اور تشریع) کا بہت زیادہ شہرہ تھا ان حضرات کے اخلاص اور للّٰہیت سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے۔ ہمیشہ سے ان کی دین داری اور خدا ترسی دیکھتے رہے تھے اس لئے لوگ ان پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ علاوہ مریدین اور تلامذہ کے عام مسلمان بھی بیحد معتقد تھے اس لئے بہت تھوڑی مدت میں جوق جوق لوگوں کا اجتماع ہونے لگا۔ اس وقت تک ہتھیاروں پر پابندی نہ تھی۔ عموماً لوگوں کے پاس ہتھیار تھے جس کو رکھنا اور سیکھنا مسلمان ضروری سمجھتے تھے مگر یہ ہتھیار پرانے قسم کے تھے۔ بندوقیں توڑے دار تھیں۔ کارتوسی رائفلیں نہ تھیں۔ یہ صرف انگریزی فوجوں کے پاس تھیں۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے اور تھانہ بھون اور اطراف میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی۔ اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیئے گئے۔

خبر آئی کہ توپخانہ سہارنپور سے شاملی کو بھیجا گیا ہے ایک پلٹن لا رہی ہے۔ رات کو یہاں سے گذرے گی۔ اس خبر سے لوگوں میں تشویش ہوئی۔ کیونکہ جو ہتھیار ان مجاہدین کے پاس تھے وہ تلوار، بندوق توڑے والی اور برچھے وغیرہ تھے مگر توپ کسی کے پاس نہ تھی توپخانہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا۔ حضرت گنگوہی نے فرمایا فکر مت کرو۔

سڑک ایک باغ کے کنارے سے گذرتی تھی۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو تیس یا

) چالیس مجاہدین پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے افسر مقرر کر دیا تھا۔ آپ اپنے تمام ماتحتوں کو لیکر باغ میں چھپ گئے اور سب کو حکم کیا کہ پہلے سے تیار رہو جب میں حکم کروں سب کے سب ایک دم فیر کرنا۔ چنانچہ جب پلٹن معہ توپخانہ باغ کے سامنے سے گذری تو سب نے یکدم فیر کیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ توپخانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے توپخانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کی مسجد کے سامنے لاکر ڈالدیا۔ اس سے لوگوں میں ان حضرات کی فراست، ذکاوت، فنون حربیہ کی مہارت، معاملہ فہمی اور ہر قسم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔

شاملی اس زمانہ میں مرکزی مقام تھا۔ ضلع سہارنپور سے متعلق تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی۔ کچھ فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی۔ قرار پایا کہ اس پر حملہ کیا جائے چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کر لیا گیا۔ جو طاقت پولیس اور فوج کی وہاں تھی وہ مغلوب ہوگئی۔ حضرت حافظ ضامن صاحب اسی ہنگامہ میں شہید ہو گئے۔ حضرت حافظ صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ اُن کی شہادت سے پہلے روزانہ خبر آتی تھی کہ آج فلاں مقام انگریزوں سے چھین لیا گیا۔ آج فلاں مقام پر ہندوستانیوں کا قبضہ ہوا مگر حافظ صاحب مرحوم کی شہادت کے بعد پہلے پہل خبر آئی کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور یہی حال ہر جگہ کی خبروں کا تھا۔ اس سے پہلے گورے فوجی چھپتے پھرتے تھے، ایک ایک ہندوستانی سپاہی گوروں کی جماعتوں کو بھگائے پھرتا تھا مگر بعد میں معاملہ بالکل برعکس ہوگیا۔

پہلے کسی کھیت میں گورا سپاہی چھپا ہوا تھا تو کاشتکار عورت نے اپنے کھرپے سے اس کو قتل کر ڈالا مگر بعد میں معاملات اُلٹے ہو گئے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام معاملہ جوش و خروش جنگ و جدال کا حضرت حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے لئے کیا گیا تھا۔ بہرحال حافظ صاحب کی شہادت اور دہلی کے سقوط کی خبر سے لوگوں کی ہمتیں بالکل پست ہوگئیں اور سب اپنے اپنے اوطان کو واپس آگئے۔

تقدیر تدبیر پر غالب آگئی۔ ہندوستانیوں کو اپنے اعمال سابقہ کی سزا ملنی تھی گذشتہ مصائب پاداش کے لئے احکم الحاکمین کے دربار عدالت میں کافی نہ تھے اس لئے باوجود اس قدر رجال بازیوں کے برٹش شہنشاہیت کو ہندوستانیوں پر اس طرح مسلط کر دیا گیا جس طرح کوڑے لگانے والے بھنگی جلاد کو مجرم پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔

جس میں نہ شرافت ہوتی ہے نہ رحم و انسانی ہمدردی۔ ہندوستانیوں کو سپید برطانوی بھیڑیوں کے سامنے سرنگوں کرنا قدرت کی تجویز تھی وہ ہو کر رہی۔ تحریک انقلاب و آزادی ناکام کر دی گئی۔ غلامیت کا طوق پہلے سے ہزاروں درجہ بوجھل کر کے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی گردن میں ڈلوا دیا گیا۔ قصبہ تھانہ بھون اور اُس کے اطراف و جوانب کے وہ مقامات جن کی شکایت کسی دشمن نے کر دی برباد کر دیئے گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

دارو گیر و پکڑ دھکڑ کا بے پناہ زمانہ آیا۔ چاروں طرف سختیاں بیجد و بے نہایت وحشی درندوں کی طرح عمل میں لائی جانے لگیں۔ پُرانی دشمنیوں کو نکالنے کا لوگوں کو موقعہ مل گیا جس کو جس سے کوئی بھی پرخاش یا رنجش ہوتی انگریز افسر کے یہاں شکایت کر دیتا کہ یہ شخص بغاوت میں شریک تھا۔ علیٰ ہٰذا القیاس اگر کسی کی زمینداری یا نقدی کی حرص ہوتی تو اس کی شکایت انگریز کے پاس کر دیتے۔ وہاں نہ تحقیق تھی نہ گواہ کی تلاش تھی۔ نہ مجسٹریٹ کے فیصلہ کا انتظار تھا۔ وہاں تو یہ مقالہ معمول بہ تھا۔

جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے

یا تو ابتدا میں انگریز چھپتے اور ہندوستانیوں سے پناہ مانگتے پھرتے تھے یا دنیا یکبارگی پلٹ گئی اور ہندوستانیوں کا قتل عام ہونے لگا۔ تحریک انقلاب ۵۷ء دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس انقلاب میں حصہ لینے والے ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے۔ فوجیوں میں بھی اور امراء میں بھی، عوام میں بھی اور علماء غیر علماء خواص میں بھی۔ امراء میں اگر بیگم حضرت محل اور نواب باندہ عظیم اللہ خاں نواب عبدالرحمان خاں صاحب والی جھجر، نواب مظفر الدولہ نواب امیر خاں پنشن دار و جاگیر دار پلول، نواب اکبر خاں بن فیض اللہ خاں بنگش نواب احمد قلی خاں وغیرہ مسلمان نظر آتے ہیں تو ہندوؤں میں جھانسی کی رانی، نانا راؤ، تانتیا ٹوپی کالپی والے راجہ جگدیش پور، کنور سنگھ آف بہار۔ راجہ ناہر سنگھ رئیس بلب گڑھ، راجہ اجیت سنگھ عم راجہ نریندر سنگھ رئیس پٹیالہ لالہ رامجی داس گڑوالے وغیرہ نظر آتے ہیں اسی طرح ہر طبقہ میں اشتراک تھا۔ علماء میں مولانا احمد اللہ شاہ صاحب دلاور جنگ مدراسی[1]۔ مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی[2] جنہوں نے دہلی میں بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علماء کے

---

[1] - [2] - ہر دو حاشئے صفحہ ۴۹ پر ملاحظہ فرمایئے۔

4621
Institute of Islamic Research

کے سامنے تقریر کی تھی اور استفتاء پیش کیا تھا۔ مفتی صدر الدین خاں صاحب۔ آزردہ صدر الصدور دہلی۔ مولوی عبد القادر صاحب۔ قاضی فیض اللہ صاحب دہلوی مولانا فیض احمد صاحب بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی سید مبارک شاہ رامپوری نے اس پر دستخط کر دیے تھے۔ اور اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی تھی۔ دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی۔ (الثورۃ الہندیہ ص۱۵۶ از تاریخ ذکاء اللہ) ے

حاشیہ متعلق ص۴۵ ۔ ۱ے مولانا نہایت جوشیلے اور خوش بیان تھے سلسلہ نسبی میں سلطان ٹیپو مرحوم سے تعلق رکھتے تھے ان کی تقریروں میں جو کہ آگرہ، فیض آباد، لکھنؤ وغیرہ میں ہوئی تھیں کئی کئی ہزار ہندو اور مسلمان جمع ہو جاتے تھے۔ اخیر میں لکھنؤ آئے اور بادشاہ بیگم حضرت محل لکھنؤ پر قابض ہو گئے تھے۔ جبکہ لکھنؤ میں ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۵ رجولائی ۱۸۵۷ء بروز یکشنبہ مرزا رمضان علی عرف برجیس قدر ابن واجد علی شاہ کو حضرت محل کی منظوری سے مموخاں کی سرکردگی میں فوجی سالاروں نے باقاعدہ تخت نشین کرا دیا تو احمد اللہ شاہ صاحب (مدراسی دلاور جنگ) جو کہ پہلے سے قابض ہو کر شہر کا بندوبست کر چکے تھے۔ اب تلنگے جا بجا متعین ہوئے۔ شاہ جی سخت شکست کھا کر چپ بھگئے۔ بیلی گارد پر انگریزوں سے چھ روز تک لڑائی ہوتی رہی۔ ۱۰ رجولائی کی شام جمعہ کے دن پسپا ہو کر لوٹ آئے۔

(باغی ہندستان ص۱۵۴ از قیصر التواریخ جلد ص۲۲۵ تا ۲۳۰)

۲ے حضرت علامہ الورے نشر و اشاعت کرتے ہوئے اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی پہونچے یہاں فوج نے ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو حملہ کر دیا تھا بادشاہ دہلی سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ علامہ بھی شریک مشورہ ہوتے رہے۔ منشی جیون لال اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں ۱۶ر اگست ۱۸۵۷ء (مولوی فضل حق سہ شنبہ یک دربار ہوئے۔ انھوں نے اشرفی نذر پیش کی اور صورت حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی) ۲ر ستمبر ۱۸۵۷ء (بادشاہ دربار عام میں تشریف فرما ہوئے مولوی فضل حق، میر سعید علی خاں اور حکیم عبد الحق آداب بجا لائے) ۶ر ستمبر ۱۸۵۷ء (مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے۔ اندا انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے) ۷ر ستمبر ۱۸۵۷ء (بادشاہ دربار خاص میں رہے (حکیم عبد الحق میر سعید علی خاں مولوی فضل حق جمال الدین خاں اور دیگر تمام امراء دو سا شریک دربار ہے۔ ر

(باغی ہندوستان ص۱۵۵)

۳ے بادشاہ سراسیمہ تھے شہزادوں کی لوٹ کھسوٹ اور تخت کی تمناؤں نے باہمی رقابت کا میدان گرم کر رکھا تھا۔ عمائد شہر میں دو گروہ تھے ایک بادشاہ کا ہمنوا اور دوسرا کمپنی کا بہی خواہ۔ فوجوں میں طمع اپنے گھر کر لیا تھا۔ دو جماعتوں نے (باقی ص۴۷ پر)

الحاصل ان علماء نے آخر وقت تک اپنے فتویٰ کے مطابق عمل کیا۔ جنرل بخت خاں اور اس کی فوج اور مجاہدین نے پوری دادِ شجاعت دی مگر آپس کے غداروں نے (جن کے سرغنہ مرزا الٰہی بخش اور مرزا مغل شہزادہ تھے) ہر قسم کی ابتری پھیلادی اور نتیجہ وہی ہوا جو ایسی باتوں کا ہوتا ہے۔ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو پوری دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور انتہائی سفاکی سے دہلی میں قتل عام جاری کر دیا گیا۔

اسپنسر وال پول لکھتا ہے:۔

"وحشی نادر شاہ نے بھی وہ لوٹ نہیں مچائی تھی جو فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج نے جائز رکھی۔ شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے اور پانچ پانچ یا چھ چھ آدمیوں کو روزانہ سزائے موت دی جاتی تھی۔ وال پول کا بیان ہے کہ تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ جن میں سے اُنتیس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤلف تبصرۃ التواریخ لکھتا ہے کہ ستائیس ہزار مسلمان قتل کئے گئے۔ اور سات دن تک برابر قتل عام جاری رہا۔" (شاندار ماضی ص ۶۹ از افسانۂ غم ص ۲۸ و ۲۹)

۱۸۵۷ء میں انگریز جیسی دعویدار تمدن و تہذیب قوم نے یہ شرمناک اور انسانیت سوز حرکات جوش میں نہیں ہوش میں کیں۔ غلامی کی لعنت سے متاثر ہو کر نہیں فاتح و قابض ہونے کے بعد کیں۔ جہالت و حماقت سے نہیں،

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶ - مقصد اعلیٰ سامنے رکھ رکھا تھا۔ ایک جماعت مجاہدین کی تھی دوسری روہیلوں کی یہ جنرل بخت خاں کی سرداری میں دادِ شجاعت دے رہی تھی۔ جنرل بخت خاں کی اسکیموں میں مرزا مغل صاحبزادہ بادشاہ آڑے آتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش (سمدھی بادشاہ نے بادشاہ سے سرکار میں (کمپنی میں) معافی کا خط بھی بھجوا دیا تھا۔ کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ مرزا مغل کی وجہ سے فوج میں پھوٹ پڑ گئی جنرل بخت خاں سے لوگ بگڑ گئے کمپنی کی فوج نے ۱۴ ستمبر کو شہر دہلی پر حملہ کر دیا۔ اور ۱۹ ستمبر کو انگریز مکمل طور پر قابض ہو گئے بادشاہ جو اس درمیان میں قلعہ سے نکل کر مقبرہ ہمایوں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے مع متعلقین گرفتار کر کے قلعہ میں نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ تین شہزادوں کو قلعہ میں داخل ہوتے ہی گولی کا نشانہ بنایا گیا اور ان کے سروں کو خوان پوش سے ڈھک کر خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے بطور تحفہ پیش کیا گیا انہیں میں مرزا مغل بھی تھے۔ جنرل بخت خاں اپنی فوج اور توپخانہ کو نکال لے گئے۔ بادشاہ سے کہا کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں مگر وہ زینت محل اور مرزا الٰہی بخش کے ہاتھوں میں کھلونا بن چکے تھے۔ (الثورۃ الہندیہ ص ۱۵۷)

بزعم خود دانش مندی و فرزانگی کے ماتحت کیں۔ غفلت و نادانستگی سے نہیں بلکہ قصداً اور دانستہ کیں۔ خصوصیت سے مسلمانوں کے ساتھ جو ذلت آمیز اور جگر خراش برتاؤ کیا وہ بیان سے باہر ہے۔ زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سلوا کر گرم تیل کے کڑھاؤ میں ڈلوانا۔ سکھ رجمنٹ سے علی روس الاشہاد اغلام کرانا۔ فتحپوری کی مسجد سے قلعہ کے دروازے تک درختوں کی شاخوں پر مسلمانوں کی لاشوں کا لٹکانا، مساجد کی بے حرمتی خصوصاً شاہجہانی جامع مسجد دہلی کے حجروں میں گھوڑوں کا باندھنا، عبادت کی جگہ دفاتر قائم کرنا اور حوض میں وضو کے پانی کی جگہ گھوڑوں کی لیدڈالنا ناقابل معافی اور ناممکن التلافی جرم ہے۔ منصف مزاج انگریز بھی اس کی مذمت کئے بغیر نہ رہ سکے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ ترجمہ شیخ حسام الدین۔ از کتاب مسٹر ایڈورڈ ٹامسن مسمّی بہ "تصویر کا دوسرا رخ"[۵۱]

(الثورۃ الہندیہ صـ ۱۶۱-۱۶۲)

جو تفصیلات ہم نے خود انگریزوں کے حوالہ سے مندرجہ بالا صفحات میں درج کی ہیں وہ صاف طور پر بتلاتی ہیں کہ ہندوستانیوں کی یہ تحریکِ انقلاب، بغاوت ہرگز نہ تھی بلکہ حق طلبی کی تھی۔ ہندوستانی غدار ہرگز نہ تھے بلکہ انگریز غدار تھے جنھوں نے معاہدات کو یکے بعد دیگرے توڑنے اور مظالم شاقہ کا شیوہ اختیار کر رکھا تھا۔ اس طرح کے انقلابات ان سے بہت معمولی وجوہات کی بنا پر خود انگلینڈ، فرانس، امریکہ، روس، جرمنی وغیرہ میں واقع ہوئے اور سب کے سب حق بجانب تسلیم کئے گئے مگر افسوس ہندوستان میں سخت سے سخت اور انتہائی حالات پر یہ تحریک چلائی گئی اور بقول "برعکس نہند نام زنگی کافور" ہندوستانیوں ہی کو غدار اور باغی کہا گیا اور اُن پر بالکل وحشیانہ درندگی سے بھرے ہوئے مظالم کے پہاڑ ڈھائے گئے اور بے شرمی سے اپنے آپ کو مہذب اور متمدن کہا گیا اور اسی بنا پر مسٹر لیکی کہتا ہے:۔

"اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جا سکتی ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کی بغاوت تھی۔" (حکومت خود اختیاری صـ ۳۲)

ہم نے پہلے ذکر کیا تھا کہ اس تحریک انقلاب آزادی ۱۸۵۷ء میں ہندو اور مسلمان اور علماء سب شریک

---

[۵۱] اس رسالہ میں اگرچہ بہت کم واقعات ذکر کئے گئے ہیں جو کہ اصل واقعات کے سامنے وہ نسبت رکھتے ہیں جو کہ ذرہ کو پہاڑ سے ہو سکتی ہے مگر پھر بھی ناظرین کے دل کو ہلا دینے والے اور انگریزوں کی درندگی اور وحشیت و بربریت پر پوری روشنی ڈالنے والے ہیں۔

تھے چنانچہ ہم ہندو امراء اور مسلمان امراء مشہورین کے نام عنقریب ذکر کر چکے ہیں جن کی ماتحتی میں ہر قسم اور ہر مذہب کے سپاہی اور تنخواہ دار ملازم کام کر رہے تھے چند مشہور علماء کرام کے نام بھی ہم پیش کر چکے ہیں۔ عام فوجیوں کے متعلق یہ ہے کہ کارتوسوں پر گائے اور سور کی چربی کا استعمال کیا جانا خود انگریزوں کے اقرار سے ثابت ہے چنانچہ مسٹر ایڈورڈ ٹامسن "تصویر کے دوسرے رُخ" صفحہ ۲۷ پر لکھتا ہے۔ "دوسرا بڑا سبب جس سے بغاوت کی آگ فی الفور بھڑک اٹھی جیساکہ ہر ایک کو معلوم ہے چربی والے کارتوسوں کا قصہ ہے"...... انگریز مورخین اگر غور سے اس واقعہ پر نظر ثانی کریں تو اُن کو نہایت ندامت اور شرمندگی سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر کسی بغاوت کے لئے کوئی جائز وجہ کا امکان ہو سکتا ہے تو موجودہ حادثہ میں اس سے بدرجہا مضبوط اور قوی وجہ ہندوستانی سپاہیوں کے لئے موجود تھی۔ لارڈ برانٹس مسٹر اینس کی ایک چھٹی کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو اُس نے غدر کے ایام میں بہ حیثیت سپہ سالار لارڈ کیننگ وائسرائے ہند کو لکھی تھی۔

"کارتوسوں کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے سپاہیوں کے اعتراضات پر مطلقاً کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ کارتوسوں میں ایسی چکنی چیز کا استعمال کیا جائے گا جو بالکل چربی ہے۔ گولی کے دبانے کے بعد بندوق کے منہ کی جالی اسی چربی سے ڈھکی ہوئی ہوتی ہے"

اس کے بعد اپنی رائے کو ذیل کے الفاظ میں ظاہر کرتا ہے

"میری رائے میں ان کارتوسوں کے استعمال سے سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو ناقابل یقین طریق سے ٹھکرا دیا گیا ہے۔ جب اس ناقابل استعمال چیز کے استعمال پر اصرار کیا گیا تو سپاہی آپے سے باہر ہو گئے اور سوار فوج کی پلٹن ۳ کے (۸۵) جوانوں نے اس کے استعمال سے صاف انکار کر دیا۔ الخ

(تصویر کا دوسرا رُخ ص ۲۷-۲۸)

ظاہر ہے کہ ان چربی والے کارتوسوں پر ہندوؤں کو اعتراض بہ نسبت مسلمانوں کے بہت زیادہ ہو سکتا ہے کیونکہ اُن کے مذہبی جذبات کو مسلمانوں سے زیادہ ٹھیس لگتی ہے۔ چنانچہ دم دم کلکتہ میں منگل پانڈے کے ہاتھوں سب سے پہلے ۲۹ مارچ کو یہ آتشیں مادہ بھڑک اُٹھا — صاحب حکومت خود اختیاری صفحہ ۸۴ پر لکھتا ہے

"جہاں تک ہمیں علم ہے ۱۸۵۷ء تک ملی اختلاف کا وجود نہ تھا۔ جب فوجوں میں بغاوت شروع ہوئی تو ہر مقام

کے سپاہی اپنی چھاؤنی میں آگ لگا کر اور برباد کر کے دہلی کے معزول اور معطل بادشاہ کی طرف دوڑ پڑے یہ سپاہی بہار تک سے آئے تھے اُن میں ہر ایک مذہب و ملت کے ہندستانی تھے۔ ہندو سپاہی بادشاہ کی جے پکارتے تھے اگر موجودہ زمانہ کے سے تعصبات اس وقت ہوتے تو مسلمان سپاہی مسلمان بادشاہ یا نواب کے پاس جاتے اور ہندو سپاہی کسی راجہ کے پاس جاتے مگر سب کے سب بلا تفریق مذہب و ملت۔ معزول اور بے جان مسلمان بادشاہ کے گرد جمع ہو گئے۔"

(حکومت خود اختیاری ص۵۴)

مگر افسوس کہ انگریزوں نے تیرہ سو برس کا تاریخی بغض "عیسائیت اور اسلام" کا پھیلا کر مسلمانوں کو عموماً برباد کیا۔ اور اس قدر ظلم اور وحشت کا برتاؤ کیا جس کی نظیر کبھی ہندوستان بلکہ دنیا میں نہیں پائی گئی۔ ہنری ہیرنگٹن طامس جو کہ بنگال کا سویلین تھا اپنے رسالہ (ہندوستان میں گذشتہ بغاوت اور ہماری آئندہ پالیسی) میں (خلاف واقع) لکھتا ہے۔

"میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ غدر ۵۷ء کے بانی اور اصل محرک ہندو نہ تھے اور اب میں یہ دکھلانے کی کوشش کروں گا کہ یہ غدر مسلمانوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ہندو اگر وہ اپنی مرضی اور ذرائع تک محدود ہوں تو وہ کسی ایسی سازش میں شرکت نہ کر سکتے تھے نہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ (مسلمان) خلیفہ اوّل کے وقت سے موجودہ زمانہ تک یکسانیت کے ساتھ مغرور غیر روادار اور ظالم رہے ہیں ہمیشہ ان کا مقصد یہ رہا ہے کہ جس ذریعہ سے بھی ہو اسلامی حکومت قائم ہو اور عیسائیوں کے ساتھ نفرت کے خیالات کی نشو ونما ہو۔ مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہو سکتے اس لئے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں۔ غالباً اسی خیال کے انگریزوں نے غدر کے بعد مسلمانوں کو پھانسیاں دیئے اُن کی جائدادیں ضبط کرتے اور ہر طرح انہیں برباد کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔" (حکومت خود اختیاری ص۵۵-۵۶)

بہر حال مسلمان علماء میں سے مولانا احمد اللہ شاہ صاحب دلاور جنگ مدراسی اور مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی اور مولوی امام بخش صاحب صہبائی مفتی صدر الدین صاحب آزردہ صدر الصدور۔ قاضی

فیض اللہ دہلوی۔ مولانا فیض احمد صاحب بدایونی مولوی عبد القادر صاحب مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ صاحب رام پوری، مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی کوئلی، سید اسمٰعیل صاحب منیر شکوہ آبادی، مفتی مظہر کریم صاحب دریابادی۔ مولانا لیاقت علی صاحب الہ آبادی۔ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی، حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی اور ان حضرات کے تلامیذ وغیرہ نے جہاد حریت ۱۸۵۷ء میں بڑے پیمانہ پر حصہ لیا تھا۔

باقیماندہ مسلمان علماء اور مجاہدین کا معاملہ

جنرل بخت خاں صاحب ڈاکٹر وزیر خاں صاحب مولوی فیض احمد صاحب معہ اپنے ماتحتوں اور فوجیوں کے حالت خطرناک دیکھ کر دہلی سے نکل کر لکھنو چلے گئے تھے اور مولوی احمد اللہ شاہ صاحب دلاور جنگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے اور وہاں انگریزوں کی فوج سے خوب مقابلے کئے مگر اپنوں ہی کی غداریوں سے شکست کھانی پڑی اس لئے جب حالت خطرناک دیکھی تو شاہجہان پور کو روانہ ہو گئے محمدی پور میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی۔ نانا صاحب پیشوا، مولوی عظیم اللہ صاحب کانپوری شہزادہ فیروز شاہ وغیرہم سب یہاں جمع ہو گئے۔ آخری جنگ انگریزوں سے شاہ جہان پور میں ہوئی۔ یہاں بھی مختلف وجوہ سے شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور یہ سب لوگ نیپال چلے گئے۔ مولوی احمد اللہ شاہ صاحب دلاور جنگ کو راجہ پوائین بلدیو سنگھ نے دعوت کے بہانہ سے بلا کر دھوکہ سے ۱۵ر جون ۱۸۵۸ء مطابق ۲ر ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ میں شہید کر دیا۔ (یہ شخص انگریزوں سے ملا ہوا تھا انہیں کے اشاروں پر اس نے یہ شرمناک معاملہ کیا۔

مولانا فضل حق صاحب کا معاملہ

۱۹ر ستمبر کو دہلی میں انگریزوں کا تسلط ہوا تو مولانا دہلی ہی میں تھے۔ انگریزوں کے قبضہ کے بعد پانچ دن تک بھوکے پیاسے مکان کے اندر بند رہے پانچویں روز اہل وعیال کو لیکر معہ ضروری سامان شب میں چھپ کر نکلے۔ دریا عبور کیا۔ میدان قطع کئے اور بھیکن پور ضلع علیگڈھ تشریف لائے وہاں ۸ روز قیام فرمایا۔ صاحبزادہ مولانا عبد الحق صاحب بھی ساتھ تھے۔ ۸ یوم کے بعد نواب عبد الشکور خاں صاحب رئیس بھیکن پور نے سانکرہ کے گھاٹ سے جو کہ بھیکن پور سے ۲ میل ہے اور نواب صاحب اور ان کے عزیزوں کی

عملداری میں واقع تھا اپنے انتظام سے بدایوں اور بریلی کی طرف اُتروا دیا۔ بخیر و عافیت وطن مالوف پہونچ گئے ۱۸۵۹ء میں مولانا کو انگریزوں نے باغی قرار دیا۔ ماخوذ ہو کر سیتا پور سے لکھنؤ لائے گئے اور باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا صاحب سیر العلماء لکھتا ہے۔

"۱۸۵۹ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں مولانا ماخوذ ہو کر سیتا پور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا۔ مولانا موصوف کے فیصلہ کے لئے بھوری بیٹھی ایک اسیر نے واقعات سنکر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کئے اور پھر خود ہی مثل تار عنکبوت عقلی و قانونی ہولے سے توڑ دیئے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور اُن سے ہمدردی بھی تھی۔ جج نے صدر الصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام بھی سیکھا تھا وہ مولانا کی عظمت و تبحر سے بھی واقف تھا وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں۔ کرے تو کیا کرے۔ ظاہر یہ ہو رہا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے سرکاری وکیل لاجواب تھے۔

دوسرا دن آخری دن تھا۔ مولانا نے اپنے اوپر جس قدر الزام لئے تھے ایک ایک کر کے سب رد کر دیئے جس مخبر نے فتویٰ کی خبر کی تھی اس کے بیان کی تصدیق و توثیق کی فرمایا کہ

پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور جھوٹ بولا وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے۔ اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔

جج بار بار علامہ کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مخبر نے عدالت کا رُخ اور علامہ کی بارعب و پُروقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ ہی دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں وہ دوسرے تھے۔ گواہ حسن صورت اور پاکیزگی سیرت سے بے انتہا متاثر ہو چکا تھا۔ مگر علامہ کی شان استقلال کے قربان جایئے۔ خدا کا شیر گرج کر کہتا ہے۔

"وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے۔ اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے"

نالہ از بہر رہائی نکند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

شیر میسور سلطان ٹیپو کے رزمگاہ شہادت کا یہ نعرہ کبھی نہیں بھلایا جا سکتا: "شیر کی ایک روزہ زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے" علامہ کے اقرار و توثیق کے بعد گنجائش ہی کیا رہ گئی تھی۔ بجید رنج کے ساتھ عدالت نے حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم سنایا آپ نے کمال مسرت اور خندہ پیشانی سے سنا۔ علامہ کے استاد بھائی اور رفیق خاص مفتی صدر الدین صاحب آزردہ صدر الصدور نے بھی علامہ کی خاطر سے فتوی پر شہادت بالجبر لکھ کر دستخط کر دیئے تھے۔ گرفتاری کے بعد مفتی صاحب نے بتایا کہ میں نے تو پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ جبراً دستخط کرنا پڑ رہے ہیں۔ بالجبر پر نقطے نہ لگائے تھے۔ علمائے وقت نے اسے بالخیر پڑھا اور مفتی صاحب نے بالجبر بتا کر جان چھڑائی۔ البتہ جائداد و املاک کا کافی حصہ ضبط کر لیا گیا۔ آخرش جزیرۂ انڈمان روانہ کر دیئے گئے۔

(الثورۃ الہندیہ از ص۱۶۸ تا ص۱۷۲)

صاحبزادگان مولانا عبد الحق صاحب اور مولوی شمس الحق صاحب نے اپیل لندن میں دائر کر دی تھی۔ خواجہ غلام غوث صاحب میر منشی لفٹنٹ مغربی و شمالی صوبہ اودھ سرگرم سعی تھے۔ بالآخر ولایت سے رہائی کا حکم آ گیا اس کو لیکر مولوی شمس الحق صاحب جزیرہ انڈمان روانہ ہو گئے۔ جب وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو مولانا فضل حق صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ جنازہ حاضر ہے۔ بصد حسرت و یاس شریک دفن ہوئے اور بے نیل مرام واپس ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ آمین۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی رحمہم اللہ تعالیٰ کے واقعات

مخبروں کی ریشہ دوانیوں سے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اور ان کے دونوں خلفاء حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہما اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ حضرت حاجی صاحب ہندوستان سے بقصد مکہ معظمہ روانہ ہو گئے راستہ میں مختلف مقامات پر جہاں پہلے سے تعلقات

تھے ٹھہرتے جاتے تھے مگر جاسوس پیچھے لگے ہوئے تھے۔ راستہ میں مختلف واقعات عبرتناک پیش آئے۔ پنجلاسہ (پنجاب میں) مقیم تھے۔ کسی نے حکومت کے یہاں مخبری کر دی (اس زمانہ میں باغیوں کی تفتیش اور دارو گیر بہت سختی سے ہو رہی تھی) کہ حضرت حاجی صاحب فلاں شخص کے اصطبل میں مقیم ہیں۔ کلکٹر ضلع جو کہ انگریز تھا خود سوار ہو کر آدھی رات کے قریب اصطبل کے دروازہ پر پہونچ گیا۔ اور کواڑ کھلوانے چاہے۔ بڑے بھائی نے جو کہ مالک مکان تھے انگریز سے کہا کہ آپ نے اس وقت کیوں تکلیف فرمائی۔ کلکٹر نے کہا کہ گھوڑے دیکھنے کے لئے آیا ہوں کواڑ کھولو چنانچہ کواڑ کھولے گئے۔ دیکھا تو بستر لگا ہوا ہے اور سب سامان لیٹنے کا درست ہے۔ لیکن حضرت حاجی صاحب موجود نہ تھے۔ ادھر ادھر دیکھا کہیں پتہ نہیں لگا۔ مالک مکان سے پوچھا کہ یہ بستر کس کا ہے۔ اس نے کہا کہ میرے چھوٹے بھائی کا ہے۔ مگر خوف کے مارے پیشاب خطا ہو گیا تھا۔ لیکن انگریز نے اور کچھ نہ پوچھا اور گھوڑوں کو دیکھتے ہوئے واپس ہو گیا۔ (غالباً حضرت کو کشف سے یہ حال آمد انگریز کا معلوم ہو گیا ہوگا کہ پہلے سے تشریف لے گئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت بھی وہاں ہی تشریف رکھتے ہوں اور اللہ تعالیٰ نے ابصار سے پوشیدہ فرما دیا ہو کما فسر بعضہم قولہ تعالیٰ وجعلنا بینک وبین الذین لایومنون بالاٰخرۃ حجابا مستورا الآیۃ) (امداد المشتاق ص۱۷۳ و ص۱۷۴)

(اسی پنجلاسہ کا دوسرا واقعہ) تینوں حضرات (حضرت حاجی صاحب، مولانا گنگوہی مولانا نانوتوی رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکا ہے اور گرفتار کنندہ کے لئے صلہ (انعام) تجویز ہو چکا ہے۔ لوگ تلاش میں ساعی اور حراست کی تگ و دو میں پھرتے ہیں اور حضرت حاجی صاحب راؤ عبد اللہ خاں رئیس پنجلاسہ کے اصطبل خانہ کی ایک اندھیری کوٹھری میں مقیم ہیں۔ چاشت کی نماز کا وقت ہے (یعنی ۹ یا ۱۰ بجے صبح کا) ایک روز اسی کوٹھری میں وضو فرما کر چاشت کی نماز کے ارادہ سے مصلیٰ بچھایا اور جاں نثار حضار جلسہ سے فرمایا کہ آپ لوگ جائیں میں نفلیں پڑھ لوں۔ راؤ عبد اللہ خاں اعلیٰ حضرت کے بڑے جاں نثار خادم اور مشہور مرید ہیں۔ گھر کے خوشحال زمیندار اور سرکار کے نزدیک باوجاہت شخص سمجھے جاتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ اعلیٰ حضرت پر جو الزام لگایا گیا ہے اس کے قائم ہوتے ہوئے حضرت کے لئے اپنا مکان کھول دینا دنیاوی حیثیت سے کس درجہ خطرناک ہے۔ کیونکہ باغی کی اعانت بھی سرکاری بغاوت میں شمار ہے مگر اس کے ساتھ ہی غلبہ حب دین

اور فرطِ عشق میں اس درجہ مغلوب تھے کہ نہ مال کی پرواہ تھی نہ جان کی۔ خدا کی شان کہ جس وقت راؤ عبداللہ خاں حضرت کو تحریمہ باندھے نوافل میں مشغول چھوڑ کر کوٹھری سے باہر نکلے اور پٹ بند کر کے اصطبل کے دروازہ کے قریب پہونچے ہیں تو سامنے سے ڈوش کو آتے دیکھا اور ہکا بکا کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ خدا جانے مخبر کون تھا اور کس بلا کا پتلا تھا جس نے عین وقت پر روپوشی کی کوٹھری تک تعیین کر دی تھی۔ چنانچہ ڈوش اصطبل کے پاس پہونچی اور افسر نے مسکرا کر راؤ صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں گویا اپنے آنے کی وجہ کو چھپایا۔ جہاں دیدہ و تجربہ کار راؤ صاحب دور ہی سے تاڑ گئے تھے کہ "ایں گل دیگر شگفت" مگر نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن" اپنی جان یا عزت کے جانے، ریاست و زمینداری کے ملیا میٹ ہونے اور ہتھکڑیاں پڑ کر جیلخانہ پہونچنے یا پھانسی پر چڑھ کر عالم آخرت کا سفر کرنے کی تو مطلق پرواہ نہ تھی اگر ان کو رنج یا حزن و افسوس تھا تو یہ کہ ہائے غلام کے گھر سے اور آقا گرفتار ہو، اور عبداللہ خاں کے گھر میں اس کا جان سے زیادہ عزیز شیخ پابہ زنجیر کیا جائے مگر اس کے ساتھ ہی راؤ صاحب ایک جوانمرد مستقل مزاج نہایت دلیر قوی القلب راجپوت تھے۔ تشویش کو دل میں دایا اور چہرہ یا اعضاء پر کوئی بھی اثر اضطراب کا محسوس نہ ہونے دیا۔ مسکرا کر جواب دیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ ڈوش کا افسر گھوڑے سے اُترا اور یہ کہہ کر میں نے آپ کے یہاں ایک گھوڑے کی تعریف سُنی ہے اس لئے بلا اطلاع یکایک آنے کا اتفاق ہوا۔ اصطبل کی جانب قدم اُٹھا لئے۔ راؤ صاحب بہت اچھا کہہ کر ساتھ ساتھ ہو لئے اور نہایت ہی اطمینان کے ساتھ گھوڑوں کی سیر کرانی شروع کی۔ افسر بار بار راؤ صاحب کے چہرہ پر نگاہ جماتا اور اس درجہ مطمئن پا کر کبھی مخبر کی دروغ گوئی کا غصہ اور گاہے اپنی ناکامی و تکلیف سفر کا افسوس لاتا تھا۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا ہوا حاکم اس حجرہ کی طرف بڑھا جس میں اعلیٰ حضرت کی سکونت کا مخبر نے پورا پتہ دیا تھا اور یہ کہہ کر کہ "اس کوٹھری میں کیا گھاس بھری جاتی ہے" اس کے پٹ کھولدیجئے۔ راؤ عبداللہ خاں کی اس وقت جو حالت ہوئی ہوگی وہ انہیں کے دل سے پوچھا چاہیئے۔ سمجھتے تھے کہ تقدیر کے آخری فیصلہ کا وقت آگیا اور پیمانہ حیات لبریز ہو کر اُچھلا چاہتا ہے اس لئے راضی برضاء الٰہی ہو کر جی ہاں کہا اور حکم گرفتاری کے منتظر کھڑے ہو گئے۔ خداوندی حفاظت کا کرشمہ دیکھئے کہ جس وقت کوٹھری کا دروازہ کھلا ہے تخت پر مصلیٰ ضرور بچھا ہوا تھا۔ لوٹا رکھا ہوا اور نیچے وضو کا پانی البتہ بکھرا ہوا پڑا تھا۔ مگر اعلیٰ حضرت حاجی صاحب

کا پتہ بھی نہ تھا۔ افسر متحیر و حیران، اور راؤ عبد اللہ خاں دل ہی دل میں شیخ کی عجیب کرامت پر فرحاں و شاداں، کچھ عجیب سماں تھا کہ حاکم نہ کچھ دریافت کرتا ہے نہ استفسار کبھی ادھر دیکھتا ہے کبھی ادھر آخر مخبر کی دھوکہ دہی سمجھ کر بات کو ٹالا اور کہا کہ خاں صاحب یہ لوٹا کیسا اور پانی کیوں پڑا ہے۔ راؤ صاحب بولے جناب اس جگہ ہم مسلمان نماز پڑھتے ہیں اور وضو میں منہ ہاتھ دھویا کرتے ہیں۔ چنانچہ ابھی آپکے آنے سے دس منٹ قبل اسی کی تیاری تھی۔ افسر نے ہنس کر کہا آپ لوگوں کی نماز کے لئے تو مسجد ہے یا اصطبل کی کوٹھری۔ راؤ صاحب نے فوراً جواب دیا کہ جناب مسجد فرض نماز کے لئے ہے اور نفل نماز ایسی ہی جگہ پڑھی جاتی ہے۔ جہاں کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ جواب لاجواب سنکر افسر نے پٹ بند کر دیئے اور اصطبل کے چاروں طرف غائر نظر دوڑانے کے بعد باہر نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو یہ کلمات کہہ کر رخصت ہوا" راؤ صاحب معاف کیجئے آپکو اس وقت ہماری وجہ سے بہت تکلیف اوٹھانا پڑی اور پھر بھی ہمیں کوئی گھوڑا پسند نہ آیا" راؤ عبد اللہ خاں کی نظر سے دوش کے سوار جب اوجھل ہوئے تو واپس ہوئے اور کوٹھری کھول دی۔ دیکھا کہ اعلیٰ حضرت سلام پھیر چکے اور مصلے پر مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں۔ (امداد المشتاق ص ۲۹-۳۰ از تذکرۃ الرشید ص ۷۶)

اس قسم کے متعدد واقعات حضرت حاجی صاحب اور مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی قدس اللہ اسرارہم کے پیش آتے رہے اور باوجود سخت احکام اور مخبروں کی دوادوش اور خود غرضوں اور دشمنوں کی انتہائی جدوجہد کے تینوں حضرات محفوظ رہے۔ کسی کا بال بیکا نہ ہوا۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ غالباً گڑھی پختہ ضلع مظفر نگر میں جو کہ اس زمانہ میں ضلع سہارنپور میں تھا ایک رئیس کے یہاں جو کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین میں سے تھے مقیم تھے۔ مخبر نے افسر اعلیٰ انگریز کو خبر دی۔ اُس نے سپرنٹنڈنٹ پولیس انگریز کو حکم لکھا کہ تم فوراً چند سواروں کو لیکر پہونچو۔ چونکہ اس علاقہ کے تھانیدار خواجہ احمد حسن صاحب مرحوم سہارنپوری والد ماجد خواجہ اطہر صاحب سہارنپوری ایڈوکیٹ کے والد ماجد تھے اور ان کو حضرت حاجی صاحب سے عقیدت تھی اس لئے یہ تاکید کر دی کہ تھانیدار کو نیچے کی سطریں جن میں موضع اور رئیس کا نام درج تھا مت دکھانا فقط اوپر کی سطریں جن میں سپرنٹنڈنٹ کو حکم تلاشی لینے کا اور تھانیدار کو حکم سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ جانے کا تھا دکھلانا (اس خوف سے کہ چونکہ تھانیدار ہندوستانی اور مسلمان ہے ممکن ہے کہ

فورس کی روانگی سے قبل خفیہ طور سے کہیں اطلاع نہ کرنے، چنانچہ سپرنٹنڈنٹ تھانہ میں پہونچا اور کہا کہ میرے ساتھ فورس لیکر فوراً چلو۔ خواجہ صاحب نے جگہ اور مکان کو پوچھا تو اس نے وہی اوپر کی سطریں دکھلائیں اور نیچے کی سطریں نہیں دکھلائیں اور ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ خواجہ صاحب فورس لیکر ساتھ چل دیئے جب گاؤں میں پہونچے تو سمجھ گئے کہ ہو نہو فلاں شخص کے مکان پر جانا ہے۔ آواز اُن کی بہت بلند تھی۔ گاؤں کے اندر داخل ہونے سے پہلے بلند آواز سے اُس رئیس کو گالیاں دینی شروع کیں اور کہا کہ تو سرکار کا نمکحرام اور باغی ہے ہم تجھ کو یہ کریں گے وہ کریں گے تو باغیوں کو اپنے یہاں رکھتا اور پناہ دیتا ہے۔ یہ آواز اُن کے پہونچنے سے پہلے پہونچ گئی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ رات کا وقت تھا۔ مکان پر پہونچے اور دروازہ کھلوایا۔ مردانہ اور زنانہ مکان کی تلاشی لی۔ مکان کا محاصرہ کر لیا۔ مگر حضرت حاجی صاحب نہ ملے کیونکہ آواز کے پہونچتے ہی حضرت حاجی صاحب کو دوسرے مکان میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ باوجود شدت تلاشی کے ناکام واپس گئے۔ ایک دوسرے گاؤں میں اسی طرح واقعہ پیش آیا۔ بالکل بے خبری میں دوش پہونچ گئی۔ فوراً حضرت کو ایک رضائی اوڑھا کر مردانہ ہی مکان میں لٹا دیا گیا تھا۔ افسر کو زنانہ مکان کے متعلق زیادہ شبہ تھا اُس نے کہا کہ میں تمہارے مکان کی تلاشی لوں گا۔ مالک مکان نے کہا کہ حضور چلیئے یہاں کوئی مشتبہ چیز یا شخص نہیں ہے اندر لے گیا اور لیجاتے ہوئے اپنے لوگوں سے بآواز بلند کہا کہ اس بڈھے بیمار کو چارپائی سمیت کہیں کھیت میں ڈال آؤ۔ اُس نے کھانس کھانس کر اور کھنکار نکال نکال کر تمام مکان گندہ کر دیا ہے۔ وہ مکان میں معہ افسر داخل ہوا اور گاؤں والے چارپائی مثل جنازہ اٹھا کر گاؤں کے باہر کھیت میں ڈال آئے۔ حصار کرنے والی پولیس نے سمجھا کہ یہ تو کوئی واقع میں قریب المرگ بیمار ہے تعرض نہ کیا۔ حضرت وہاں جا کر دوسرے مکان میں چلے گئے اور افسر معہ فورس باوجود سخت تفتیش ناکام واپس ہوئے۔ بہر حال فضل خداوندی شامل حال تھا۔ اس قسم کے متعدد واقعات پیش آتے رہے مگر ہر جگہ حکومت کو ناکامی ہی رہی۔ اور حضرت حاجی صاحبؒ صحیح و سالم مکہ معظمہ پہونچ گئے۔

صاحب امداد المشتاق صہ ۳۲ پر لکھتا ہے۔

"حال۔ ایام غدر ہندوستان میں بوجہ بے نظمی دین و تغلب معاندان دین قیام ہند گراں خاطر ہوا اور ارادہ سابقہ ہجرت و اشتیاق بالفعل زیارت روضہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم

جوش و خروش میں آیا اور ۱۲۷۶ھ میں براہ پنجاب روانہ ہوئے اور اثنائے راہ میں پاک پٹن وحیدآباد سندھ وغیرہ مواضع میں زیارت بزرگان مقامات مذکور سے مشرف اور فیوض و برکات سے مالا مال ہوتے ہوئے کراچی بندر پہونچے۔ وہاں سے جہاز پر سوار ہوئے اور انوار و برکات ہجرت ابتدائی سفر سے مشاہدہ فرمانے لگے اور بعد طے منازل خیر البلاد مکہ معظمہ پہونچے اور انوار و برکات اس مقام متبرک سے فیضیاب ہوئے اور اس مقام مقدس کو مسکن و ماویٰ بنایا"

الحاصل عنایات خداوندی شامل حال ہیں اور اس طویل سفر میں محفوظ و مصئون رہ کر انگریزی حدود سے نکل گئے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ وارنٹ کے بعد تین دن تک بتقاضائے احباب و اعزہ روپوش رہے اس کے بعد مکان سے باہر نکل آئے لوگوں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف تین دن تک غار حرا میں روپوش رہے ہیں وہ سنت پوری ہو گئی۔ اب روپوش ہونا خلاف سنت ہوگا کسی کی نہ مانی اور قرب و جوار کے مواضع میں کبھی نانوتہ میں کبھی دیوبند میں کبھی انبیٹھہ میں کبھی رامپور منیہاران میں کبھی آبادی میں کبھی جنگل میں پھرتے رہے ہر جگہ دشمن بھی تھے اور دوست بھی۔ ہر قسم کی کوششیں جاری تھیں مگر حفاظت الٰہی ساتھ تھی کوئی کامیاب نہ ہوا۔ چھتہ کی مسجد میں دیوبند میں اکثر رہا کرتے تھے ایک مرتبہ مسجد میں تھے کہ دوش آگئی۔ آپ اپنی جگہ سے کچھ ہٹ گئے۔ افسر مسجد میں داخل ہوا اور پوچھا کہ مولوی قاسم کہاں ہیں۔ آپ پہلی جگہ کی طرف اشارہ کرکے بولے کہ ابھی تو یہاں تھے دیکھو کہیں مسجد میں ہی ہونگے وہ ڈھونڈنے دوسری طرف گیا آپ مسجد کے دوسرے دروازہ سے نکل کر جنگل کو چلے گئے۔ اُس نے اور سپاہیوں نے مسجد میں چاروں طرف کونے کونے کو اور حجروں کو خوب دیکھا مگر نہ ملے۔ اس طرح ہر جگہ پر مخبریاں ہوتی رہیں اور دوشیں آتی رہیں مگر مولانا ہاتھ نہ آئے البتہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ آپ کے شبہ میں گرفتار کرلئے گئے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب ایام انقلاب میں اجمیر شریف میں تھے پہلے ہی سے وہاں ملازم تھے جس وقت یہ جہاد اور اس کی کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ وہ وہاں ہی تھے۔ امن ہونے کے بعد اپنے وطن نانوتہ میں پہونچے۔ چونکہ بہت بڑے عالم اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے قریبی رشتہ دار اور اُستاد زادہ اور ہم درس تھے اس لئے لوگ اُن کی بہت تعظیم و تکریم کرتے

تھے۔ مخبر نے اُن کی رپورٹ کر دی۔ دوش آئی اور مولانا محمد قاسم سمجھ کر گرفتار کر کے لے گئی۔ اس پر مولانا محمد یعقوب صاحب کو بہت غصہ تھا اور فرمانے لگے کہ جو لوگ ان تمام کارروائیوں میں شریک تھے انہوں نے جہاد کیا تھا وہ تو آزاد پھر رہے ہیں اور میں جو کہ یہاں تھا بھی نہیں نہ میں نے اس میں کوئی حصہ لیا مجھ کو گرفتار کیا گیا ہے یہ مجھ کو تنبیہ ہے کہ تو نے کیوں جہاد میں شرکت نہ کی۔ بہر حال تحقیق و تفتیش کے بعد ان کو رہا کر دیا گیا۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنی جگہ گنگوہ شریف سے نہیں ٹلے۔ بالآخر گرفتار ہوئے اور گنگوہ سے سہارنپور اور وہاں سے مظفر نگر لائے گئے۔ آپ پر علاوہ شرکت جہاد شاملی یہ بھی الزام تھا کہ سپاہیوں کی رائفل اُن کے پاس ہے آپ نے دونوں سے بالفاظ توریہ انکار کیا۔ حاکم نے پوچھا کہ تم نے خلاف گورنمنٹ ہتھیار اُٹھایا آپ نے فوراً جیب سے تسبیح نکالی اور فرمایا کہ یہ میرا ہتھیار ہے اس نے کہا کہ وہ بندوق کہاں ہے آپ نے فرمایا کہ مجھ کو بندوق سے کیا سروکار۔ غرضکہ اس کے تمام الفاظ کا جواب اسی طرح دیتے رہے۔ جب اس کی مقصد برآری نہیں ہوئی تو اس نے سپاہیوں کو حکم کیا کہ ننگی تلواریں لیکر اس کے سر پر کھڑے ہو جاؤ۔ آپ کے ماموں مولانا محمد شفیع صاحب گنگوہی جو کہ پنجاب میں عرصہ دراز تک ملازم گورنمنٹ رہ چکے تھے ہتھکڑیاں اور انگریز حاکم کی سختیاں اور دھمکیاں دیکھ کر پہلے ہی سے سراسیمہ ہو رہے تھے۔ اس حکم کو سُنکر سخت پریشان ہو گئے۔ آپکو علیحدہ لیجا کر کہنے لگے بیٹا بتلا دے کہ وہ بندوق کہاں ہے۔ بندوق کے ملجانے پر حاکم تجھ کو چھوڑ دیگا۔ وہ بندوق اب کیا کام آئے گی۔ دیکھ ننگی تلواروں کا تجھ پر پہرا بٹھا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ماموں جان آپ گھبرائیے نہیں ایک تلوار نہیں سیکڑوں تلواروں کا بھی اگر پہرا قائم کر دیا جائے تو کیا خوف ہے۔ بندوق کا بتانا الزام کو سر پر لینا ہے اس کو سُنکر وہ بھی چپکے ہو گئے۔ الغرض جب آپ ان تمام تخویفات اور دھمکیوں سے متاثر نہیں ہوئے اور نہایت استقلال سے جوابات دیتے رہے۔ سپاہی ننگی تلواروں سے آپ پر پہرہ دینے لگے تو آپکو مظفر نگر جیل میں بھیجدیا گیا اور شہادتوں کے حصول کے لئے پولیس اور حکومت کوشش کرتی رہی تاکہ ثبوت بہم پہونچا کر مقدمہ چلایا جائے۔ ماموں صاحب مرحوم جو کہ گنگوہ سے اسی اعلان اور ارادہ پر نکلے تھے اور ساتھ تھے کہ مولوی رشید احمد جب تک رہا نہ ہو جائیں گے میں گنگوہ واپس نہ ہوں گا۔ انہوں نے ضمانت پر رہائی کی درخواست کی حاکم نے تین ہزار کی تین سال کے لئے ضمانت طلب کی۔ تین شخص ضمانت مطلوبہ کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر حاکم نے

قبول کرنے سے اس حیلہ سے انکار کر دیا کہ یہ سب گنگوہ کے باشندہ نہیں ہیں ان کی ضمانت قانوناً درست نہیں۔

صاحب امداد المشتاق صـ۱۵۳ پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی نقل کرتے ہیں۔

"جب میں قید خانہ میں تھا تو میری تین سال کے لئے تین ہزار کی ضمانت طلب ہوئی تھی چنانچہ تین شخص ضامن ہوئے۔ لیکن انگریز سخت مزاج تھا اس نے یہ کہہ کر کہ تینوں گنگوہ کے باشندے نہیں ہیں، ضمانت نامنظور کر دی۔ ماموں صاحب نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اس کو نہ چھڑا لوں گا گنگوہ نہ آؤں گا۔ چنانچہ وہ ساعی تھے۔ اسی اثنا میں ہمارے حضرت گنگوہ تشریف لائے اور یہاں خبر تھی کہ ہیں اب رہا ہوا، اب رہا ہوا۔ حضرت (حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز) نے فرمایا چھوٹنے میں ابھی دیر ہے۔ ہم اس سے مل آئے ہیں۔ انہیں ایام میں کہ میں قید خانہ میں تھا خواب میں آپ تشریف لائے، گویا میرے پاس تشریف رکھتے ہیں اور تسلی فرماتے ہیں۔ پھر حضرت یہاں سے تشریف لے گئے اور میں ایک ماہ بعد چھوٹ آیا۔ (امداد المشتاق صـ۱۸۳ از تذکرۃ الرشید صـ۲۶۹)

قید ہونے کے اوائل زمانہ میں یہی مشہور ہو گیا تھا کہ مولانا رشید احمد صاحب کو پھانسی دیدی جائے گی اور انگریزوں کی بوکھلاہٹ بھی اسی کی موید تھی۔ ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو پھانسی دینا، گولی سے اڑا دینا انگریزوں کے یہاں اس زمانہ میں نہایت معمولی بات تھی اس کے لیے جرم اور اس کے ثبوت کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ اپنے رعب کے جمانے بلکہ پھانسی دیئے ہوئے ہندوستانی انسان کے تڑپنے کا تماشہ دیکھنے کے لئے بھی بے شمار پھانسیاں دی گئی تھیں جس کو مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے بھی انگریزوں کے ہی حوالوں سے نقل کیا ہے۔ تو حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پر بغاوت وجہاد وغیرہ کا الزام جبکہ تھا ہی تو کس کو یقین ہو سکتا تھا کہ مولانا کی برأت ہو جائے گی۔ تمام تھانہ بھون کو اُجاڑ ہی دیا گیا تھا بار بار تلاشیاں رام پور، گنگوہ، تھانہ بھون اور ہر مشتبہ آبادی کی ہو رہی تھیں۔

انقلاب آزادی اور فتویٰ جہاد اور شاملی پر چڑھائی میں شرکت وغیرہ امور سب کو معلوم تھے اس لئے سب کو یہی خیال تھا کہ جبکہ گرفتار ہو چکے ہیں تو انگریز بجز پھانسی دینے کے اور کوئی دوسری صورت عمل میں نہیں لائے گا۔ جبکہ اس کا یہی عملی کارنامہ سب جگہ جاری ہے۔ اسی بنا پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی بہت تشویش تھی۔ رسالہ امداد المشتاق صفحہ ۷۲ پر تحریر ہے۔

" حال۔ حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد صاحب) سے ایک مرتبہ کسی شخص نے دریافت کیا تھا اعلیٰ حضرت (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب) نے تو آپ سے وعدہ فرمایا تھا کہ اطمینان رکھو میں عرب روانہ ہوتے وقت تم سے مل کر جاؤں گا مگر آپ گرفتاری و حوالات میں رہے۔ آپکی رہائی سے قبل ہی اعلیٰ حضرت نے بیت اللہ کی جانب ہجرت فرمائی گویا سائل کا مطلب یہ تھا کہ ملاقات کے خوش کن الفاظ محض تسلی کے لئے تھے جس کا وقوع نہیں ہوا۔ حضرت نے بہت ہی ہلکی آواز سے فرمایا" اعلیٰ حضرت وعدہ خلاف نہ تھے" چنانچہ دوسرے طرق سے معلوم ہوا کہ باوجود سنگین پہرہ کے اعلیٰ حضرت نے جیلخانہ کے اندر قدم رکھا اور کئی گھنٹہ باتیں کر کے شب ہی میں واپس ہوئے اور عرب کو روانہ ہوئے۔ مولوی ولایت حسین صاحب کی روایت ہے کہ حکیم صاحب جو اعلیٰ حضرت کے مرید انبالہ کے رہنے والے بندہ کے ساتھ سفر حج میں شریک تھے فرمایا جس زمانہ میں مولانا گنگوہی جیلخانہ میں تھے۔ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب ایک دن فرمانے لگے کہ میاں کچھ سنا کیا مولوی رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہو گیا۔؟ خدام نے عرض کیا کہ حضرت کچھ پتہ نہیں۔ ابھی تک تو کوئی خبر آئی نہیں فرمایا ہاں حکم ہو گیا چلو۔ یہ فرما کر اٹھو کھڑے ہوئے۔ حکیم صاحب کا بیان تھا کہ برسات کا زمانہ تھا مغرب کے بعد اعلیٰ حضرت اور میں غالباً مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی غرض تین آدمی چلے۔ شہر سے باہر نکل کر تھوڑی دور جا کر اعلیحضرت گھاس کے قدرتی سبز مخملی فرش پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر سکوت فرما کر گردن اوپر اٹھائی اور فرمایا چلو مولوی رشید احمد کو کوئی پھانسی نہیں دے سکتا۔ خدا تعالےٰ کو ابھی ان سے بہت کام لینا ہے۔ چنانچہ چندروز بعد اس کا ظہور ہو گیا۔ والحمد للہ علیٰ ذالک (امداد المشتاق صفحہ ۱۶۲-۱۶۳ از تذکرۃ الرشید صفحہ ۸۵)

یہ سب باطنی تصرفات تھے ورنہ ظاہری حیثیت سے کسی صاحب کی ان میں سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی مگر قدرت کو ان سے کام لینا تھا ان کی تعلیم و تربیت سے ایسے لوگ تیار کرانے تھے جو کہ بیدھڑک ہو کر بلا خوف و خطر میدان آزادی اور تحریک انقلاب میں جان کو ہتھیلی پر رکھ کر باوجود انگریز کے آہنی پنجہ اور انتہائی سفاکیت کے کود پڑیں۔ یعنی مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند مرحوم اور ان کے تلامذہ اور متوسلین کو پیدا کرنا اور بنانا تھا اس لئے ان

حضرات کو بچایا گیا اور ہر طرح حفاظت عمل میں لائی گئی جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے دشمن کے گھر میں پیدا کیا گیا اور اسی سے پرورش کرائی گئی اسی طرح مولانا محمود حسن صاحب کو انگریز کے زیر حکومت پرورش کرایا گیا حضرت کے والد ماجد انگریزی ملازم تھے۔ مسٹن گورنریو۔پی کہتا تھا کہ ہم اگر مولوی محمود حسن کو جلا کر خاکستر کردیں تو اس کی خاکستر بھی ہم سے نفرت کریگی۔ مولانا سے مالٹا کی واپسی پر جبکہ مولانا انگریزوں کی قبائح کو ذکر کر رہے تھے بعض حاضرین مجلس نے کہا کہ حضرت انگریزوں میں کچھ اچھائیاں بھی تو ہونگی تو فرمایا کہ ہاں ایک اچھائی ہے انھوں نے پوچھا وہ کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ ان کے کباب نہایت مزیدار ہونگے۔

امداد المشتاق ص ۱۲۸ میں ایک دوسرا واقعہ خود حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ العزیز سے نقل کیا ہے فرمایا کہ راؤ عبداللہ خاں صاحب (حضرت کے چچا پیر) مغرب کی نماز پڑھتے تھے اپنے بیٹے امیر علی خاں کو پکارنے لگے۔ امیر علی امیر علی! میرے خاوند (حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتی شہید مرحوم) نے آج مجھ کو دکھایا ہے کہ حاجی میاں (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب) کو مسجد میں بند کرکے قفل لگا دیا ہے اور مولوی رشید احمد کے ہاتھ میں کتاب دیکر درس کو کہہ دیا ہے۔ یہ بات حاجی میاں کو کہدو کہ وہ اس کا مطلب سمجھ لیں گے۔ مینوں (بزبان پنجابی مجھے) کچھ خبر نہیں ہے۔ اس کا کشف پورا نکلا۔ مجھے تو مکہ مکرمہ میں کہ اشرف المساجد ہے مقید کردیا۔ ہند کا خواب وخیال بھی نہیں آتا اور مولوی رشید احمد صاحب کو کتاب دیکے مدرس بنادیا۔ ہمیشہ احادیث نبوی کا درس دیتے ہیں۔" (امداد المشتاق ص ۱۲۸)

الغرض یہ قدرت کے غیبی ہاتھ تھے جو کام کر رہے تھے۔ تاکہ دارالعلوم دیوبند وغیرہ مراکز علم وعمل قائم ہوں اور ان حضرات کی تعلیم وتربیت سے ہزاراں ہزار درجہ بدرجہ علماء وصلحاء وجود میں آئیں۔ دین اسلامی کا چاروں طرف چرچا ہوجائے۔ دشمنان اسلام کے ملعون ارادے اسلام کا چراغ بجھانے کے کامیاب نہو سکیں۔ یہی قدرت کے غیبی ہاتھ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز امام مجاہدین تھانہ بھون اور حضرت مولانا نانوتوی سپہ سالار مجاہدین اور مولانا رشید احمد صاحب قاضی مجاہدین کو محفوظ رکھ رہے تھے۔ یہی حضرت حاجی صاحب مرحوم بعد میں مولانا محمود حسن صاحب کے پیر ومرشد بنے اور یہی مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی استاد اور مربی بنے جنکی تعلیمات اور ارشاد وتربیت سے ایسا شیر دل انقلاب لانے والا مرد میدان ظاہر ہوا اور اس نے انگریزوں کے قصر استبداد

ومظالم کے آہنی قلعہ میں زلزلہ ڈال دیا۔ ایام تحریک خلافت میں ایک بزرگ نقشبندی صاحب کشف دیوبند آئے مولانا کا وصال ہوچکا تھا حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہوکر مراقب ہوئے دیر تک مراقبہ میں رہے۔ بعد کو فرمایا کہ میں نے مراقبہ میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت کی تحریک میں حکام کی سختیوں کا تذکرہ کیا تو حضرت نے مولانا محمود حسن صاحب کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ مولوی محمود حسن عرش خداوندی کو پکڑے ہوئے اصرار کررہے ہیں کہ انگریزوں کو جلد ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ واقعہ یہی ہے کہ مولانا مرحوم کی معنوی اور روحانی جدوجہد انگریزوں کے نکالنے اور ہند کو آزاد کرانے میں ظاہری اور مادی جدوجہد سے بدرجہا زائد اور فائق تھی۔ اس کو معنوی امور کے پرکھنے اور جاننے والے خوب سمجھتے ہیں۔ اسی معنوی جدوجہد کا یہ اثر ہوا کہ انگریز باوجود ہر قسم کی مادی قوتوں کے اور باوجود اس کے کہ ہندوستان کی آزادی اس کی عظیم الشان مصلحتوں کے لئے پیغام فنا تھی، ہندوستان سے چلا گیا۔ اور خود چھوڑ کر چلا گیا۔ ورنہ کسی کے قیاس اور گمان میں بھی نہ آتا تھا کہ وہ یہاں سے نکلیگا اور اگر نکلا بھی تو اس طرح بلا خون خرابہ کے بیک بینی و دوگوش یہاں سے منہ کالا کرے گا۔ قدرت کے مخفی ہاتھوں کی کارگذاریوں کو مادہ پرست ظاہر بیں اشخاص نہیں مانتے مگر واقعات عالم ان کو بعض حدود پر لیجا کر ماننے پر مجبور کردیتے ہیں۔

ذٰلک تقدیر العزیز العلیم۔ قل اللّٰھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علیٰ کلّ شیٔ قدیر۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

حضرات علماء دیوبند اور کانگریس کی تائید

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں جو وحشیانہ مظالم اور جس درندگی کا مظاہرہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سخت دل اور وحشی انگریزوں نے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ جاری کیا تھا اس سے برطانوی حکومت بھی متاثر ہونے سے باز نہ رہ سکی۔ وہاں کی ذمہ دار جماعتوں اور سمجھدار حکام کو ضروری معلوم ہوا کہ ہندوستان کی حکومت کی باگ اُن تجارت پیشہ لوگوں اور خود غرض حریصوں کے ہاتھ سے نکالنی ضروری ہے ورنہ تمام انگلش قوم اور برطانوی تاج دنیا بھر میں بدنام ہو جائیں گے اور تمدن و تہذیب کا دعویٰ نیست و نابود ہو جائے گا۔ نیز ملک ہندوستان قبضہ سے نکل جائے گا۔ کلایو اور ہسٹنگس وغیرہ کی سیاہ کاریوں کا بھانڈا کوڑوں میں پھوٹ چکا تھا جو کہ برٹش قوم کے لئے انتہائی سیاہ دھبہ تھا۔ انہیں امور کی بنا پر امریکہ قریبی زمانہ میں آزاد ہو چکا تھا اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ تاج برطانیہ کمپنی سے ہندوستان کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور وہاں ملکہ وکٹوریہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا جائے۔ نیز ہندوستانیوں کو اطمینان بخش امور کا یقین دلا دیا جائے تاکہ آئندہ اس قسم کی بغاوتوں اور بے چینیوں کا احتمال باقی نہ رہے[۱]۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں کوئن وکٹوریہ کا مشہور اعلان نافذ کیا گیا۔

---

[۱] ڈائرکٹران کمپنی نے عذر کیا کہ کمپنی کا بہت بڑا سرمایہ ہندوستان میں لگا ہوا ہے تو قرار پایا کہ سرمایہ کا حساب کر کے کمپنی کو دیدیا جائے اور ہندوستان کو اس کے معاوضہ میں خرید لیا جائے۔ حساب کیا گیا تو ثابت ہوا کہ پونے چار کروڑ پونڈ کمپنی کا سرمایہ ہندوستان میں لگا ہوا ہے اُس کے دینے کا وعدہ کیا گیا۔ اور انگلستان سے قرض لیکر کمپنی کو ادا کر دیا گیا جس کو بطور قرض ہندوستان ہی کے کندھے پر رکھا گیا۔ اور سود در سود کی صورت میں وصول کیا جانے لگا۔ جبکہ تاج برطانیہ نے خریدا تھا تو ضروری تھا کہ شہنشاہی خزانہ سے روپیہ ادا کیا جاتا جیسا کہ نائیگیریا وغیرہ میں عملدرآمد کیا گیا تھا مگر ہندوستان کی بدقسمتی یہاں بھی رنگ لائے بغیر نہ رہ سکی۔ صاحب علم المعیشۃ لکھتا ہے "ہندوستانی قرض عامہ کی بنیاد ۱۸۵۷ء سے پڑی جبکہ کمپنی سے ہندوستان خریدنے کی قیمت اور غدر

(باقی ص ۶۵ پر)

مجرمین اور مشتبہین کے معاف کر دینے کا عام اعلان ہوا اور حسب قابلیت بغیر تفرقہ مذہب و نسل و رنگت تمام عہدہ ہائے ملکیہ سب کو دینے کا اور سب کے ساتھ برابر برتاؤ کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ آئندہ کسی صوبہ یا ریاست پر حملہ کرنے اور اپنے مقبوضہ ملک کو بڑھانے کی مخالفت کی گئی اور اطمینان دلایا گیا کہ ہم کسی قطعۂ زمین کو اپنی ملکیت میں شامل نہ کریں گے نیز وعدہ کیا گیا کہ ہم ہندوستان کو ہمیشہ اپنا مقبوضہ ملک نہیں رکھنا چاہتے۔ جب بھی ہندوستانی باشندے حکومت کے قابل ہو جائیں گے ہم وہاں سے چلے آئیں گے وغیرہ وغیرہ۔

اعلان مذکور کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

"اعلان ملکہ معظمہ بنام والیان و سرداران و جمہور انام ہند" جناب ملکہ معظمہ وکٹوریہ بفضل خدا خدیو مملکت گریٹ برٹن و آئرلینڈ و آبادی ہائے و مضافات واقع یورپ و ایشیا و افریقہ و امریکہ و آسٹریلیا کی طرف سے خاص و عام کی اطلاع کے لئے حسب تفصیل ذیل مشتہر کیا جاتا ہے کہ:۔

(۱) واضح ہو کہ بوجوہ کاملہ ہمارے اس ارادہ کا کہ ہم نے بصلاح و اتفاق رائے امرائے ملی و ملکی و مختاران عام

(۶۴ کا حاشیہ):۔ زد کرنے کے کل مصارف ہندوستان سے وصول کرنے قرار پائے اور یہ کل رقم بطور قرض عامہ انگلستان میں لیکر ہندوستان کے نام لکھدی گئی۔ اور اس روز سے آج کے دن تک ایک رقم کثیر بطور سود ہندوستان سے انگلستان وصول کر رہا ہے ذرا خیال تو کرو کہ گذشتہ نصف صدی میں ہندوستان کتنی رقم بطور سود انگلستان کو ادا کر چکا ہوگا۔" صفحہ ۶۱۶ — دوسری جگہ لکھتا ہے "جب ۱۸۵۸ء میں اس کے (کمپنی کے) مقبوضات سرکار برطانیہ نے اپنے تحت میں لئے تو اس کو معاوضہ کیا دیا اور کیونکر دیا۔ کمپنی کا ہندوستان میں جس قدر روپیہ صرف ہوا تھا وہ سب قرض لیکر ادا کر دیا گیا اور یہ قرض ہندوستان کے نام لکھا گیا جس پر اب تک ہندوستانی محاصل میں سے منجانب ہندوستان سود دیا جا رہا ہے گویا سرکار برطانیہ نے انگریزی کمپنی سے سلطنت ہند خریدی اور زر قیمت ہندوستانیوں نے ادا کیا۔ ایسی خرید و فروخت کی مثال تاریخ عالم میں ملنا دشوار ہے۔ ابھی حال میں یعنی ۱۹۰۰ء میں اسی طرح ایک انگریزی کمپنی سے سرکار برطانیہ نے نائیجیریا خریدا مگر قیمت خود اپنی جیب سے ادا کی۔ ہندوستان کی طرح اس کا بار نائیجیریا پر نہیں ڈالا۔ جنوبی افریقہ میں جو برطانوی مقبوضات حاصل کئے گئے تو وہاں بھی آخر الذکر اصول برتا گیا۔ لیکن ہندوستان کی تو تمام دنیا سے بات ہی نرالی ہے۔ جو کچھ بھی ہو کم ہے۔" صفحہ ۵۷۸

حاضرین جلسہ پارلیمنٹ اس ارادہ کو مصمم کر لیا ہے کہ ممالک ہند کا انتظام جس کا انصرام آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کو آجتک ماشاء مفوض تھا اپنے اہتمام میں لیویں پس اس قرطاس کی رو سے ہم اطلاع دیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ بصلاح واتفاق رائے مذکورہ بالا کے ہم نے انتظام ملک مذکور کا اپنے اہتمام میں لیا اور اس قرطاس کی رو سے اپنی تمام رعایا کو جو قلمرو مذکور میں موجود ہیں تاکید فرماتے ہیں کہ ہماری اور ہمارے وارثوں اور جانشینوں کی وفاداری اور اطاعت کریں اور جس کسی کو ہم اپنے نام اور اپنی طرف سے ملک کے انتظام کے لئے وقت آئندہ مقرر کرنا مناسب سمجھیں اس کی فرمانبرداری کیا کریں اور جو فرزندار جمند مقرر ومعتمد علیہ مشیر خاص نواب چارلس جان والی اکاونٹ کیننگ صاحب کی وفاداری قابلیت اور فہم و فراست کی نسبت ہم کو اطمینان اور خاطر جمعی کلّی حاصل ہے اس لئے ہم نے صاحب موصوف یعنی والی کاونٹ کیننگ صاحب کو واسطے کرنے انتظام ممالک مذکور کے ہماری طرف اور ہمارے نام سے برعایت ہمارے احکام اور اُن آئین کے جو اس کے پاس معرفت ہمارے وزیر اعظم کے بھیجے جائیں قائم مقام اوّل اور ممالک مذکور کا گورنر جنرل مقرر کیا - اور جو لوگ بالفعل کسی عہدہ پر کیا ملکی اور کیا فوجی سرکار آنریبل ایسٹ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مامور ہیں ان کو اس قرطاس کی رو سے اپنے اپنے عہدہ پر بحال اور قائم فرماتے ہیں لیکن وہ ہماری مرضی آئندہ کے مطیع رہیں اور سب آئین و قوانین کی اطاعت کرتے رہیں جو آئندہ نافذ کئے جاویں گے

(۲) اور والیان ہند کو اطلاع دیجاتی ہے کہ جس جس عہد و پیمان کو خود آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے کیا یا اس کی اجازت سے منعقد ہوا ان سب کو ہم پذیرا اور قبول کرتے ہیں اور اُن کا ایفا بکمال احتیاط ہوتا رہے گا - اور چشم داشت ہے کہ ان والیوں کی طرف سے بھی اسی طرح تعمیل ہوتی رہے گی - (۳) جو ملک بالفعل ہمارے قبضہ میں ہے اُسے زیادہ کرنا نہیں چاہتے اور جب ہم کو یہ گوارا نہیں ہے کہ کوئی شخص ہماری مملکت یا حقوق میں دست اندازی کرے تو ہم بھی پیشقدمی کی اپنی طرف سے بہ نسبت ملکیت یا حقوق اوروں کے اجازت نہ دیں گے اور والیان ہند کے حقوق و منزلت اور عزت مثل اپنے حقوق و منزلت اور عزت کے عزیز سمجھیں گے (۴) اور ہم کو آرزو ہے کہ والیان ہند اور ہماری رعایا کو بھی وہ سعادت اور حُسن اخلاق کی ترقی حاصل ہو جو ملک میں صلح اور حُسن انتظام سے حاصل ہوتی ہے - جو لوازم بہ نسبت اپنی دوسری رعایا کے ہم پر واجب ہیں وہی لوازم بہ نسبت اپنی رعایائے ہند کے ہم اپنے ذمہ لازم بنائیں گے اور بفضل خدا، وفاداری اور راستی کے ساتھ ہم لوازم مذکور کا لحاظ کرتے رہینگے

(۵) اگرچہ ہم کو مذہب عیسوی کے صدق کی نسبت یقین کلی حاصل ہے اور جو تسلی خاطر اس سے ہوتی ہے اس کا بکمال شکر گذاری اعتراف ہے تو بھی ہم کو نہ یہ منصب نہ یہ آرزو ہے کہ کسی نوعیت سے خواہ مخواہ اپنے عقیدہ کو تسلیم کرائیں بلکہ یہ حکم ہمارا اور شاہانہ مرضی ہے کہ نہ کسی اہل مذہب کی بوجہ ان کے مذہب کے تائید کی جائے اور نہ کسی کو بوجہ اس کے اعتقادات کے تکلیف دیجائے ۔ بلکہ سب رعیت کی موجب قانون کے بغیر طرفداری حفاظت ہوتی رہے اور جو لوگ ہمارے فرمان پذیر انتظام ملک ہند کے لئے مامور ہیں ان کو بکمال تاکید ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمارے کسی رعیت کے اعتقاد اور عبادت مذہبی کی نسبت دست اندازی والا ہمارا نہایت موجب غضب ہوگا (۶) اور یہ بھی ہمارا حکم ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہماری سب رعیت کو گو کسی قوم اور مذہب کی ہو بلا تعرض وطرفداری کے ہماری ملازمت میں اور عہدوں پر جنکو وے اپنی علمیت اور قابلیت اور دیانت سے انجام دے سکتے ہوں مقرر کرتے ہیں ۔ (۷) اس کا ہم کو بخوبی علم ہے کہ اہل ہند اس آراضی کو جوان کے بزرگوں سے انہیں وراثتاً پہونچی ہے بہت عزیز رکھتے ہیں اس لئے ہم کو بھی اس کا بڑا لحاظ ہے بلکہ چاہتے ہیں کہ یہ حقوق ان کے جو آراضی سے متعلق ہیں بشرط ادا کرنے مطالبہ سرکاری کے محفوظ رہیں اور ہمارا حکم ہے کہ بوقت تجویز و نفاذ قانون کے عموماً حقوق قدیمی اور ملک کے رسم ورواج پر لحاظ کامل ہوتا رہے (۸) بہ اجتماع اس حال کے بعض مفسدین نے جھوٹھ موٹھ افواہیں اڑا کر اپنے ہم وطنوں کو ورغلا کر ان سے بغاوت فاش کرائی اور ملک ہند پر ایک بلا نازل کرائی ۔ ہم کو نہایت افسوس ہوا اور ہمارے اقتدار کی کیفیت تو لوگوں کو فرو کرنے فساد باغیوں میں بیچ میدان کارزار کے معلوم ہوگئی ہے ۔ لیکن اب ہمارا یہ منشاء ہے کہ ان لوگوں کو عفو جرائم کرکے جو اس طرح دھوکا کھا گئے ہیں اور پھر اطاعت میں آنا چاہتے ہیں اپنا اظہار ترحم کریں اس نیت سے کہ آئندہ خونریزی نہ ہونے پائے اور ہمارے ممالک ہند میں جلدی سے امن وامان ہو جائے ۔ قائم مقام اور گورنر جنرل بہادر ایک علاقہ میں کہ جہاں لوگوں کے ایام غدر مکرر میں جرم مخالفت سرکار کئے تھے ان میں سے اکثروں کو مترصد عفو قصورات کا بشرائط مخصوص کیا ہے اور جن کی تقصیر نے ان کو احاطہ ترحم سے باہر کر دیا ہے ان کی سزاؤں کی بھی تشریح کر دی ہے ۔ چنانچہ ہم اپنے قائم مقام اور گورنر جنرل کے اس عمل مذکور کو پذیرا اور قبول کرتے ہیں ۔ علاوہ اس کے حسب ذیل اعلان فرماتے ہیں یعنی سوائے ان لوگوں کے جن کی نسبت ثابت ہوا یا اب ثابت ہو کہ وہ رعیت سرکار انگریزی کے قتل میں بذات خود شریک ہوئے اور باقی جملہ مجرموں کی نسبت اظہار ترحم کیا جائے گا ۔ مگر بہ نسبت سرکار قتل کے انصاف مقتضی اس بات کا ہے کہ ان پر ترحم نہ ہو ۔ جن لوگوں نے جان بوجھکر

قاتلوں کو پناہ دی ہو یا جو لوگ باغیوں کے سردار ہوئے ہوں یا ترغیب دیتے ہوں اُن کی نسبت صرف یہی وعدہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی جان بخشی ہوگی۔ لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں اُن سب احوال پر جن کے اعتبار سے وہ اپنی اطاعت سے پھر گئے کامل غور کیا جائے گا۔ اور اُن لوگوں کی نسبت جو بے سوچے سمجھے مفسدوں کی جھوٹی باتوں میں آکر مجرم ہو گئے بڑی رعایت کی جائے گی۔ باقی اور سب اشخاص سے جو سرکار کے بالمقابل ہتیار بند ہیں بموجب اس فرمان کے وعدہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے اپنے گھر چلے جاویں اور اپنے اپنے پیشہ صلح وسداد میں مصروف ہوں تو اُن کے قصورات جو ہماری نسبت اور ہماری سلطنت اور منزلت کی نسبت سرزد ہوئے بلا شرط معاف اور درگذر اور فراموش کر دیئے جائیں گے۔ ہماری یہ مرضی شاہانہ ہے کہ رحم وعفو کی شرائط مذکور اُن سب شخصوں کے متعلق ہوں جو قبل از یکم جنوری ۱۸۵۹ء کی شرائط کی تعمیل کریں۔ (۹) ہماری بدل وجان یہ تمنا ہے کہ جب ملکِ ہند میں امن ہو جائے تو وہ فلاح ومصالح کی ترقی کریں اور فائدہ خلائق کے لئے کام مثل تیاری سڑک ونہر وغیرہ جاری کریں۔ اور ملک کا ایسا انتظام کیا جائے کہ جس سے ہماری ساری رعایا باشندہ ملک مذکور کو فائدہ ہو کیونکہ اُن کی فارغ البالی ہمارے لئے موجب اقتدار اور اُن کی فراغت ہمارے لئے باعث بے خطری اور اُن کی شکر گذاری ہمارے لئے پورا صلہ ہے اور خدائے قادر ہم کو اور ہمارے فرمانبرداران ماتحت کو ایسی توفیق دے کہ یہ ہماری مرادیں واسطے فائدہ رسانی خلائق کے اچھی طرح حُسن اختتام کو پہونچیں۔ (یکم نومبر ۱۸۵۸ء کے گزٹ میں یہ اعلان شائع ہوا)[1]

---

[1] مسٹر گلیڈسٹن نے ہاؤس آف کامنس میں یکم مئی ۱۸۹۳ء میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔ "اور نہ صرف مصر بلکہ ہندوستان کے متعلق بھی میں یہ کہوں گا کہ کسی ملک پر دائمی قبضہ کر لینا برٹش گورنمنٹ کی قدیم روایات کے خلاف ہے۔ ہندوستانیوں کو بھی یہی اُمید رکھنا چاہئے کہ ہم ہندوستان کا قبضہ اسی وقت تک اپنے ہاتھ میں رکھیں گے جب تک کہ وہاں کی ضروریات اور ملکی ترقی وخوش حالی اس درجہ پر نہ پہونچ جائے کہ جو ایک مہذب ملک کے لئے ضروری ہے (رسالہ سرزمین فراعنہ میں ان دی لینڈ آف دی فیرونز مصنفہ دوست محمد ایڈیٹر امریکن ٹائمز لندن)

سرالیڈن گورسٹ نے ۷ مارچ ۱۹۰۹ء کو ہاؤس آف کامنس میں حسب ذیل تقریر کی" ہندوستان کی نیشنل کانگریس کے ممبروں کو یونین وکٹوریہ کی وہ مشہور تقریر نہیں بھولنا چاہیئے جس میں صاف صاف یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ہم اس ملک پر زبردستی کا قبضہ نہیں رکھنا چاہتے ہم وہاں کی خوش حالی اُن کی آزادی اور امن وامان کے خواہاں ہیں اور اگر ہم کو یقین دلایا جائے کہ تعلیم نے اس ملک میں ایسی ترقی کر لی ہے کہ وہاں والوں کو اپنے معاملات میں ہماری سرپرستی کی ضرورت نہیں ہے تو ہم آج اس کا اعلان کرنے کے لئے تیار ہیں کہ ہندوستان کو بھی مثل دیگر برطانوی مقبوضات کے خود مختار بنا دیا جائے گا۔" (رسالہ مذکورہ بالا)

اس اعلان پر ہندوستان میں امن اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی اس سے پہلے بہت سے اعلانوں اور معاہدوں کو توڑ چکی تھی اور اسی بنا پر اس کے کسی اعلان اور عہد نامہ پر ہندوستانیوں کو اعتماد ہوتا تھا مگر چونکہ یہ اعلان ملکہ وکٹوریہ اور ہاؤس آف کامنس (دار العوام) اور ہاؤس آف لارڈس (دار الخواص) اور انگلستان کی مذہبی جماعتوں کی طرف سے ہوا تھا اس پر اعتماد کیا گیا اور بڑے درجہ تک بے چینی دور ہو گئی۔ چاروں طرف رعایا مطمئن ہو گئی مگر بعد کے کچھ عرصہ کے معاملات نے واضح کر دیا کہ یہ اعلان محض ہاتھی کے دانت کی طرح تھا جو محض دکھلاوے کا کام کرتا ہے۔ تمام حکام وہی رکھے گئے جن کے ہاتھ ہندوستانیوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ اور جن کی سرشت میں درندگی اور بربریت بھری ہوئی تھی۔ اور جو کہ ہندوستانیوں کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور مساوات گورے اور کالے کے انتہائی مخالف تھے۔ چنانچہ حکام کی ان چیرہ دستیوں کو دیکھ کر گورنروں اور وائسرائے کو برابر واقعات اور مظالم کی عرضداشتیں پیش کی گئیں مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ عاجز آکر ہندوستانیوں نے ان امور کی اطلاعات پارلیمنٹ ہاؤس آف کامنس اور وزراء تک پہونچائیں مگر وہاں سے بھی کوئی دستگیری اور اشک شوئی نہ ہوئی تو اضطراب اور بے چینی بڑھنے لگی۔ چنانچہ ان بے عنوانیوں کی شکایت حکام رس لوگوں نے وائسرائے وقت لارڈ ڈفرن تک زبانی پہونچائی تو جواب یہ ملا کہ ابتک تم لوگوں نے جو کارروائی کی ہے وہ انفرادی ہے تم کو اپنی جماعت بنانی چاہیئے اور اجتماعی طور سے مطالبات پیش کرنے کی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ حکومت برطانیہ کے لوگ اجتماعی مطالبات کو وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد رکھی گئی اور پہلا اجلاس اس کا بمبئی میں کیا گیا اور اس میں بلا تفریق مذہب و نسل ہندوستانیوں کو ممبر بنانے کا اعلان کیا گیا اور شکایات اور مطالبات کو رزولیوشنوں کی صورت میں تمام اہل ہند کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اس اجلاس میں اکہتر ممبر شریک ہوئے جن میں دو مسلمان اور تین بنگالی اور باقی بمبئی کے باشندے ہندو اور پارسی وغیرہ تھے۔ مسلمانوں میں مشہور تاجر بمبئی سیٹھ رحمت اللہ سیانی تھے۔ اس اجلاس کی صدارت مسٹر سریندر ناتھ بنرجی نے کی۔

چونکہ ۱۸۵۷ء کے واقعہ پر انگریزوں نے اس قدر اور ایسے ملعون اور شرمناک مظالم چاروں طرف ہندوستان میں کیے تھے جن کی نظیر وحشی قوموں اور جاہل سے جاہل ملکوں میں بھی نہیں پائی جاتی تھی توپوں کے منہ پر باندھ کر گولے سے اڑا دینا، ہاتھی کے پیر سے باندھ کر کچلوا دینا زندہ آدمی کو لوہے کی گرم سلاخوں سے داغ کر آگ میں جلانا

دغیرہ وغیرہ معمولی باتیں تھیں اس لئے عام ہندوستانی اور بالخصوص مسلمان انتہائی درجہ خوف وہراس میں مبتلا ہو گئے تھے اس لئے باوجود ہر قسم کی ناانصافیوں کے معائنہ کرنے کے تمام پبلک میں آزادئ وطن کے لئے کھڑے ہونے کی ہمت نہ تھی۔ اگرچہ ہر سمجھدار شریف النفس غیر تمند ہندوستانی کے دل میں آزادی کی چنگاری بھڑکتی رہتی تھی مگر خوف وہراس کے تسلط کی بنا پر کسی قسم کی ظاہری کارروائی کام میں لانا احاطہ قدرت سے باہر سمجھا جاتا تھا یہ ضرور تھا کہ کچھ مسلمان جن پر خصوصی طور پر محبت قوم ووطن اور دین کا غلبہ تھا ان انسانیت سوز مظالم کے باوجود خفیہ کارروائیاں ہتھیلی پر سر رکھکر جاری کئے ہوئے تھے جن کا تذکرہ ہم ڈبلو ڈبلو ہنٹر کے اقتباسات میں کر چکے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے انگریزوں کو سرحد میں بار بار جنگیں ۱۸۶۳ء تک جاری کرنی پڑیں اور متعدد مقامات عدالتہائے ہند میں چلائے گئے۔ جن میں انبالہ کا مشہور مقدمہ بھی ہے۔ انھیں جیسے مسلمانوں کے متعلق ۷ ار فروری ۱۸۷۲ء میں سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر نے کہا تھا۔

> "لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ مسلمانوں کو بے جان اور ضعیف بیان کرتے ہیں۔ شاید ایسا ہو۔ مگر بہت سے شکاریوں کو خطرہ برداشت کرنے کے بعد یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ اگر کسی عالی نسب شیر پر زخم لگایا جائے گا تو گو وہ کیسا ہی ضعیف اور ناتوان بلکہ قریب المرگ ہی کیوں نہ ہو مگر پھر بھی اپنی اصلی حرارت کے ساتھ ایک مرتبہ جست کریگا اور چاروں طرف ہلاکت اور تہلکہ مچا دیگا"
>
> (روح روشن مستقبل ص۲۲)

بہر حال عام پبلک ہندو اور مسلم اور بالخصوص مسلمان انتہائی درجہ میں خائف اور ہراساں ہو گئے تھے چونکہ سب کا یہی خیال تھا کہ آزادی بجز تشدد اور قتل وقتال کے نہیں حاصل ہو سکتی اس لئے مایوسی ہر ایک پر چھائی ہوئی تھی۔ کوئی دم مارنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ کانگریس کے اجلاس اول کے بعد لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ آزادی حاصل کرنے کی دوسری صورت بھی ہے۔ اس لئے لوگ جوق در جوق اس میں شامل ہونے لگے کیونکہ اس میں اطمینان تھا کہ انگریزوں کو اپنی درندگی اور بربریت کا موقعہ ہاتھ نہیں آئے گا اور ہم اپنی محبوبہ آزادی سے وصال حاصل کر سکیں گے اگرچہ دیر میں اور تدریجاً ہو۔ چنانچہ ۱۸۸۶ء میں جب کانگریس کا دوسرا اجلاس کلکتہ میں دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں منعقد ہوا تو ممبروں کی تعداد (۷۰) سے بڑھ کر

ایک ہی سال میں (۴۳۶) ہوگئی جس میں مسلمان ممبر (۳۳) تھے - اور پھر ۱۸۸۷ء میں جب اس کا تیسرا اجلاس مدراس میں زیر صدارت بدرالدین طیب جی منعقد ہوا تو ممبروں کی تعداد (۶۰۴) تھی جن میں مسلمان (۳۸) تھے - کانگریس کی اس بڑھتی ہوئی حالت اور مقبولیت کو دیکھ کر ممکن نہ تھا کہ مستبد اور سیاہ دل انگریزوں کے دماغ ماؤف نہ ہوں اور سینہ اور دل میں کپکپی پیدا نہ ہو - مسٹر بیگ پرنسپل علیگڈھ کالج اور دوسرے انگریزوں کو انتہائی بےچینی نے گھیر لیا - چنانچہ انھوں نے انجمن محبان وطن (انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن) کی بنیاد ڈالی - کانگریس کی مخالفت میں آرٹیکل بار بار شائع کئے - مختلف مقامات پر سفر کئے اور لکچر دیئے اور سرسید پر اس قدر اثر اور دباؤ ڈالا کہ وہ انتہائی درجہ کانگریس کے مخالف ہو گئے اور مسلمانوں پر زور ڈالنے لگے کہ وہ ہرگز ہرگز کانگریس میں شرکت نہ کریں اور انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں شریک ہو کر انگریزوں کی وفاداری کا ثبوت دیں - اس میں شرکت مسلمانوں کے لئے فرض اور ضروری ہے اور کانگریس میں جانا مسلمانوں کے لئے سم قاتل اور زہر ہلاہل ہے - چند علماء کو اپنا ہم خیال بنا کر فتویٰ شائع کرایا جس کی رو سے مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت حرام قرار دیدی گئی - اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی شرکت فرض بتائی گئی - یہ تمام معاملہ ۱۸۸۸ء سے پر زور طریقہ پر جاری ہوا - اس پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمود حسن صاحب اور مدرسین دارالعلوم دیوبند اور بہت سے علماء حقانی اطراف وجوانب ہند نے پر زور مخالفت کی - اور کانگریس کی شرکت کی حمایت اور انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی شرکت کی ممانعت میں فتوے لکھے - اس بارہ میں پیش پیش علماء لدھیانہ مولانا محمد صاحب اور ان کے دو بھائی مولانا عبدالعزیز صاحب اور مولانا عبداللہ صاحب مرحومین تھے انھوں نے اطراف وجوانب ہندوستان سے فتاوی منگائے اور ان سب کو ایک رسالہ "نصرۃ الابرار" میں جمع کیا - اور خود کھلی کھلی اور زوردار دلیلوں سے کانگریس کی شرکت کا جواز اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں شرکت کا عدم جواز ثابت کیا - چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی (قدس اللہ سرہ العزیز) کا فتویٰ اسی رسالہ نصرۃ الابرار میں صفحہ ۱۹-۲۰ اور صفحہ ۲۶ میں اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اور دیگر علماء دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ صفحہ ۲۳ و ۲۴ میں درج ہے اور مولانا محمد صاحب مرحوم لدھیانوی اور ان کے دونوں بھائیوں مرحومین کے تفصیلی فتوے صفحہ ۱۳ سے لیکر ۹۰ تک میں مذکور ہیں - اس رسالہ میں تقریباً سو علماء ہند کے فتاوے نقل کئے گئے ہیں -

انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں مسٹر بیگ اور اُن کے ہمنواؤں کی جدوجہد سے ہندو امرا اور تعلقدار بھی شریک ہوئے تھے اس کی ممبری کسی خاص فرقہ کے لئے مخصوص نہ تھی مگر ہندو رُوسا بہت جلد تاڑ گئے کہ یہ جال ہندوستانیوں کو ہمیشہ غلام رکھنے کے لئے بچھایا گیا ہے۔ اس لئے وہ رفتہ رفتہ ایسوسی ایشن سے نکل گئے مگر مسلمان سر سید اور مسٹر بیگ کے جادو کی بنا پر بالکل نہ سمجھ سکے۔ مسٹر بیگ نے جب دیکھا کہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن سے ہندو بالکل نکل گئے ہیں تو دوسری انجمن دسمبر ۱۸۹۳ء میں مسلمانوں اور انگریزوں کی بنائی اور اس کا نام "محمڈن اینگلو اورنٹیل ایسوسی ایشن" رکھا۔ اور پہلی انجمن "پیٹریاٹک کو دفن کر دیا۔ اس نئی ایسوسی ایشن کے مقاصد حسب ذیل تھے۔ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت، مسلمانوں میں سیاسی شورش پھیلنے کو روکنا، سلطنت برطانیہ کے استحکام کی تدابیر کرنا۔ لوگوں میں سلطنت برطانیہ کی وفاداری کے جذبات پیدا کرنا۔ اس انجمن کے سکریٹری خود مسٹر بیگ بنے اور تفرقہ اندازی (ہندو مسلم پھوٹ)، مسلمانوں کو بزدل بنانے، اُن میں انگریزوں کی غلامی کی زوردار اسپرٹ پیدا کرنے اور کانگریس سے علیحدگی بلکہ دشمنی رکھنے کے کھیل خوب کھل کر کھیلے۔ جس سے رفتہ رفتہ مسلمانوں میں مستقل طور پر مایوسی چھا گئی اور بالخصوص تعلیم یافتہ مسلمان جو کہ ان انجمنوں کے ممبر اور جوشیلے کارکن تھے یہ دیکھ کر کہ کانگریس کامیاب ہوتی جا رہی ہے امتحانات مقابلہ رک نہیں سکتے، کونسلوں کی توسیع ہوتی جاتی ہے اور دیگر امور میں بھی کانگریس کی آواز کچھ نہ کچھ اثر انداز ہو رہی ہے، اُن کے دماغ معطل اور اُن کے قلوب ضعیف اور اُن کے قویٰ مضمحل ہو گئے۔ سر سید ۱۸۹۸ء میں اور مسٹر بیگ ۲ر دسمبر ۱۸۹۹ء میں انتقال کر گئے۔ اس کے بعد مسٹر مارلیسن علیگڈھ کالج کے پرنسپل بنا دیئے گئے۔ اُنھوں نے وہاں کی سیاست میں بھی قائمقامی کی۔ ۱۹۰۰ء میں لفٹنٹ گورنر یو پی مسٹر میکڈانلڈ نے اُردو ہندی کا نیا جھگڑا پیدا کیا جس سے ہندو مسلمانوں کا اتحاد کافور کر دیا گیا اور افتراق کا زہر تمام ملک میں پھیلا دیا گیا۔ یہ دوسری انجمن بھی "محمڈن اینگلو اورنٹیل" مسٹر مارلین نے دفن کر دی۔ اُردو ہندی کے جھگڑے میں نواب مہدی علی خاں محسن الملک کو سخت زک اُٹھانا پڑی۔ ۱۹۰۱ء میں محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن بنائی گئی جس کی وجہ سے نواب وقار الملک کو بہت زیادہ تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ انہیں دنوں کے بعد تقسیم بنگال کا واقعہ پیش آیا جس نے مسلمانوں کو بالکل بے دم کر دیا۔

الغرض سر سید کی اس پالیسی اور مسٹر بیگ اور دیگر انگریزوں کی ان کارروائیوں کا اثر انگریزی تعلیم یافتوں پر

اس قدر زہریلا پڑا کہ مسلمان سیاسیات میں ہندوؤں سے بہت پیچھے پڑ گئے جس کا احساس مسلمانوں کو بہت بعد میں ہوا اسی زہریلی پالیسی کے ماتحت ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی۔ ان امور کی تفصیل روشن مستقبل اور روح روشن مستقبل میں پوری طرح دی گئی ہے۔ ہندوستانیوں کو اس شدت اور بے دردی سے پامال کر دینے کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کی سرحدوں کی طرف توجہ کرنا ضروری سمجھا۔

اپنے سامراج کو لازوال بنانے کیلئے انگریزی چالیں

دوسرے ممالک میں انگریزوں کا جارحانہ اقدام

کوئن وکٹوریہ کے اعلان ۱۸۵۸ء کی کھلی ہوئی مخالفت

باوجودیکہ ۱۸۵۸ء میں کوئن وکٹوریہ اور دارالعوام اور دارالخواص اور انگلستان کی مذہبی جماعت کے سربرآوردہ لوگوں کے اتفاق سے منجملہ دیگر وعدوں کے یہ وعدہ پختہ طور پر کیا گیا تھا کہ ہم آئندہ کسی دوسرے ملک پر قبضہ اور دست درازی نہ کریں گے۔ مترجم کے الفاظ حسب ذیل تھے "جو ملک بالفعل ہمارے قبضہ میں ہے اُسے زیادہ کرنا نہیں چاہتے اور جب ہم کو یہ گوارا نہیں ہے کہ کوئی شخص ہماری مملکت یا حقوق میں دست اندازی کرے تو ہم بھی پیشقدمی کی اپنی طرف سے بہ نسبت ملکیت یا حقوق اوروں کے اجازت نہ دیں گے اور والیان ہند کے حقوق و منزلت اور عزت مثل اپنے حقوق و منزلت اور عزت کے عزیز سمجھیں گے۔" مگر کیا اس پر عمل[1] کیا گیا۔ واقعات مندرجہ ذیل اس پر روشنی ڈالیں گے۔

---

[1] اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے اسباب انقلاب وجدوجہد آزادی میں سے ایک امر یہ بھی تھا کہ کمپنی نے مختلف ریاستوں پر خلاف معاہدہ قبضہ کر لیا تھا اور ہمیشہ توسیع مملکت اور فارورڈ پالیسی اس کے زیر نظر رہتی تھی جس کے ماتحت جنگ وجدل اور الحاق ممالک ہند شرمناک طریقوں اور حیلوں سے جاری رہتا تھا باوجودیکہ بہت سے والیان ریاست کے انتہائی وفاداری امداد اور اطاعت کے پھر بھی الحاق کی پالیسی عمل میں لائی جاتی تھی جیسا کہ اودھ اور اس کے والی نواب واجد علی شاہ اور جھانسی کی رانی وغیرہ کے ساتھ کیا گیا تھا اس لئے ہندوستانیوں کی بے چینی دور کرنے اور آئندہ کے خطرات کو مٹانے کی غرض سے یہ اعلان (باقی ۷۴ پر

(۱) ۱۸۶۵ء میں دوار آف بھوٹان پر قبضہ کر کے برطانوی ہند سے الحاق کیا گیا۔

(۲) ۱۸۸۵ء میں برہما کا شمالی حصہ فتح کر کے سلطنت میں شامل کیا گیا۔

(۳) ۱۸۹۰ء میں منی پور انگریزی انتظام میں لیا گیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد پھر ہندوستانی ریاست زیر سایہ برطانیہ بنا دیا گیا۔

(۴) ۱۸۹۵ء میں چترال پر چڑھائی کی گئی اور تمام علاقہ سلطنت میں شامل کیا گیا۔

(۵) تیرہ کی سرحدی مہم بھی اسی سال میں واقع ہوئی۔

(۶) ۱۸۸۰ء میں کابل کی دوسری لڑائی کی گئی جس میں چالیس لاکھ پونڈ خرچ ہوا۔

(۷) ۱۸۹۷ء میں پھر جنگ سرحدی گئی جس میں بیالیس لاکھ پونڈ خرچ ہوا

(۸) ۱۸۹۸ء میں تبت اور چین پر حملہ کیا گیا جس میں ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ خرچ ہوئے۔

(۹) ہم ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۸ء کے ستھانہ اور اُن مقامات پر حملوں کا ذکر کر چکے ہیں جہاں آزادی ہند کے متوالے

حاشیہ متعلق صفحہ ۷۳۔ ضروری سمجھا گیا تھا جس کی بنا پر تمام والیان ریاست ہائے ہند مطمئن ہو گئے اور بیرون حدود برطانوی ہند کے رہنے والے باشندوں کو بھی یقین ہو گیا کہ انگریز آئندہ امن و امان سے رہیں گے اور ہماری ملکیتیں محفوظ رہیں گی۔ مگر جوں ہی ذمہ داران برطانیہ کو اس اعلان کے بعد محسوس ہونے لگا کہ اب ہندوستانیوں کی بے چینی ہماری طرف سے دور ہو گئی ہے اور ہماری قوت اور گرفت بھی مکمل ہو گئی ہے اسی وقت سے آنکھیں بدل لیں اور اس عہد نامہ کو ردی کی ٹوکری میں ڈالنا اور فارورڈ پالیسی کو زندہ کرنا ضروری معلوم ہونے لگا۔ سر بارتھ فیسر اور ان کی پارٹی نے فارورڈ پالیسی کے لئے پارلیمنٹ میں آوازیں بار بار اٹھائیں اور اپنے ہم خیال بنانے شروع کئے تا ایک اپنی اکثریت بنا کر وائسرائے ہند پر عملدرآمد کا زور ڈلوایا اس وقت میں لارڈ نارتھ بروک وائسرائے تھے انہوں نے اس کی مخالفت کی اور اس کے خطرات اور مضرات کو ظاہر کیا مگر ایک نہ سُنی گئی اور برابر زور پڑتا رہا۔ چونکہ وہ اس پالیسی کو ہندوستان اور انگلستان کے لئے بہت مضر سمجھتے تھے اس لئے ۱۸۸۰ء میں استعفا دیکر انگلستان واپس چلے گئے اور انکی جگہ پر لارڈ لٹن آئے وہ اس پالیسی کے موافق تھے چنانچہ انہوں نے آتے ہی کابل کو مشن بھیجا اور بالآخر ۱۸۷۸ء کی کابل کی چڑھائی عمل میں آئی جس میں برطانیہ اور گورنمنٹ ہندوستان کو بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ دو کروڑ پونڈ اس مہم میں خرچ ہوا جس میں سے برطانیہ نے اپنے انگلینڈ کے خزانہ سے صرف پچاس لاکھ پونڈ دیا اور باقی ڈیڑھ کروڑ پونڈ ہندوستان کے سر ڈالا گیا۔ پھر بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ (حکومت خود اختیاری ص ؟)

حضرت سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کے تابعداروں کا قیام رہتا تھا۔

غرضکہ ہندوستان کی بیرونی حدود پر رہنے والے قبائل اور ممالک پر جو ۱۸۵۷ء تک کے مقبوضہ ممالک سے باہر تھے حملہ کرنے اور اُن کے برباد اور کمزور کرنے کے بے شمار واقعات جاری کئے گئے۔ بلوچستان، یاغستان (آزاد قبائل کا ملک) افغانستان، تبت، چین، برہما وغیرہ پر برابر فوج کشی جاری رہی جس سے ہمیشہ ہندوستانی فوجیں، ہندوستانی خزانے، ہندوستانی رسد وغیرہ موت کے گھاٹ اُترتے رہے اور پڑوس کے ممالک اور قوموں کی بربادی ہوتی رہی ان کو ہندوستان اور باشندگان ہند سے بغض و عداوت بڑھتی رہی۔ اور اس طرح انگریزوں کی غلامی ہندوستانیوں کے لئے مضبوط ہوتی گئی۔ مندرجہ بالا واقعات تو بڑی بڑی جنگوں کے ہیں جن میں اس قدر مصارف واقع ہوئے کہ ہندوستانی قومی قرضہ کی نوبت آئی ورنہ ایسی مہمات جن میں قرض لینا نہیں پڑا وہ تو بے شمار ہیں۔ آفریدیوں، مسعودیوں، مہمندیوں، وزیریوں اور دیگر قبائل سے آئے دن فارورڈ پالیسی کی بنا پر چھیڑ چھاڑ عمل میں لائی جاتی اور پھر اُن پر فوج کشی عمل میں لائی جاتی تھی۔ جس سے ان بہادر قوموں کو فنا کرنا، ہندستان پر اپنے تسلط اور اقتدار کو مضبوط بنانا، باہر سے آنے والے خطرات کے لئے تحفظ اور سدراہ کی صورتیں پیدا کرنا اصلی مقصد تھا۔ ورنہ یہ ممالک ایسے زرخیز نہ تھے جن کے لئے اس قدر مصارف برداشت کئے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام کارروائیاں شہنشاہیت (برٹش ایمپائر) کے لئے عمل میں لائی جاتی رہتی تھیں اور برطانوی قوم اور ملک کا کوئی نقصان جانی یا مالی نہیں ہوتا تھا۔ آدمی ہندوستان کے مرتے تھے خزانہ ہندوستان کا کھپتا تھا۔ دوسرے نقصانات بھی ہندوستان ہی کے ہوتے تھے اور برٹش اقتدار روز افزوں ہوتا رہتا تھا۔ ہندوستان پر اپنا آہنی پنجہ اور اُس کی گرفت روز افزوں زیادہ ہوتی رہتی تھی۔ اس لئے کانگریس اور بیدار مغز ہندوستانی اس عملدرآمد کو ملک کے لئے انتہائی خطرناک سمجھتے تھے۔ فوجی مصارف کے بار گراں کی بنا پر ہندوستانیوں پر ٹیکس آئے دن بڑھائے جاتے تھے۔ اندرون ملک کی ضروریات کے لئے بجٹ میں روپیہ نہ ہونے کا بہانہ لیکر رعایا کی ضروریات داخلیہ کی انجام دہی سے معذوری ظاہر کی جاتی تھی۔ ۱۸۸۵ء میں جبکہ کانگریس کا پہلا اجلاس ہوا تو ایک رزولیوشن میں فوجی مصارف کی تخفیف کا مطالبہ کیا گیا۔ اور اس کے بعد کے اجلاس میں مندرجہ ذیل تجویز پاس کی گئی۔

"سرحد کی پیش قدمی کی پالیسی سلطنت برطانیہ کے لئے اور بالخصوص ملک ہندوستان کے مفاد کے لئے مضرت

رساں ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ہندوستان کی حدود کے باہر فوجی مہمات بھیجنی پڑتی ہیں جس سے قیمتی جانیں تلف ہوتی ہیں اور رعایا کا روپیہ ضائع ہوتا ہے اس لئے کانگریس مستدعی ہے کہ اس جارحانہ کاسوائی کو بند کیا جائے اور یہ امر قرار دیا جائے کہ دراں حالیکہ یہ مہمات شاہی اغراض کے لئے ضروری بھی جائیں تو ان کے صرف کا بڑا حصہ سلطنت برطانیہ کے خزانہ سے ادا کیا جائے "

نیز اس قرارداد کے بعد دوسری قرارداد میں کانگریس نے گورنمنٹ کی پیش قدمی کی پالیسی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ سرحدیوں کے ساتھ پرانی دوستانہ پالیسی کی طرف رجوع کیا جائے اور وادی صوات میں جو کثیر اخراجات کئے جاتے ہیں او نہیں بند کیا جائے ۔ چونکہ کانگریس کے سمجھ دار ممبر اور بیدار مغز لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ کارروائی ہندوستانیوں کی غلامی کو بڑھانے اور مضبوط کرنے اور ان کی آزادی کو زیادہ سے زیادہ دور بلکہ مستحیل بنانے کے لئے کی جا رہی ہے ۔ اور اس سے ہندوستان روز بروز کمزور و ناتوان اور غریب ہوتا جا رہا ہے لہذا اس کی مخالفت کرنا ضروری ہے ۔ مگر سادہ لوح مسلم افراد جو کہ سر سید کے تابعدار اور مسٹر بیگ کے جادو میں پھنسے ہوئے تھے وہ اس قسم کی تجویزوں کے مخالف رہے ۔ یہ بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھا کہ اس فارورڈ پالیسی کے عمل میں آنے سے کیا مسلمانوں ہی کی بربادی نہیں ہو رہی ہے ؟ ہندوستان کی مغربی و شمالی سرحد پر تو صرف مسلمان ہی آباد تھے اس پیش قدمی سے ہر روز انہیں موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے انہیں کے مال اور گھروں کو نیست و نابود کیا جا رہا ہے ۔ نیز زمانہ سابقہ میں آزادی کے لئے اس راستہ ہی سے ہمیشہ کامیابی ہوتی رہتی تھی ۔

مگر افسوس کہ ان مسحورین برطانیہ کی آنکھیں اس وقت نہ کھلیں ۔ افغانستان پر انگریزوں نے چار مرتبہ چڑھائی کی ۔ اگر علاقہ پہاڑی اور وہاں کے باشندے بہادر اور جنگجو نہ ہوتے اور انگریز کو یہ خطرہ نہ ہوتا کہ روس سے بلا واسطہ اور آمنے سامنے لڑائی کہیں نہ کرنا پڑ جائے تو بہت ممکن تھا کہ مثل ہندوستان افغانستان بھی غلامی کی ہولناک دلدل میں پھنس جاتا ۔ انگریز چاہتا تھا کہ میرے اور روس کے درمیان میں افغانستان لوہے کی دیوار بنا رہے ۔ چنانچہ ہندوستان کے خزانہ سے عرصہ دراز تک ایک معقول رقم امیر افغانستان کے لئے جاری رہی جس کو امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم جزیہ سے تعبیر کیا کرتے تھے ۔ بہر حال انگریزوں نے اپنی ان حدود سے جو کہ ۱۸۵۷ء میں تھیں ہر طرف آگے بڑھ کر وہاں کے باشندوں کو غلام اور ان کے ملکوں کو اپنے اقتدار اور تسلط کا آماجگاہ بنا لیا ۔ صرف افغانستان ہی مذکورہ بالا وجوہ سے

پوری کامیابی نہ ہو سکی۔ تاہم اس کو ہندوستان کی تمام حدود کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔

انگریز کا انگلستان کے بحری راستہ کو اپنے لئے صاف کرنا

چونکہ انگلینڈ سے ہندوستان آنے کے لئے اس زمانہ میں بجز بحری راستہ کے اور کوئی راستہ نہیں تھا اور قدیمی راستہ ساؤتھ افریقہ کا بہت دور پڑتا تھا اس لئے انگریزوں نے جبرالٹر سے بمبئی تک کے لئے اپنے تسلط کی ہمیشہ انتہائی کوششیں جاری رکھیں۔ سلطان عبدالمجید خاں مرحوم ۱۸۲۹ء میں تخت نشین ہوئے۔ محمد علی پاشا اس سے پہلے بغاوت کر کے تمام فلسطین اور شام کے علاقوں پر قابض ہو چکا تھا اور ترکی بیڑہ فوضی پاشا کی خیانت کی بنا پر محمد علی کے قبضہ میں آچکا تھا اس لئے سلطان کے لئے نہایت سخت دقتوں کا سامنا تھا انگریزوں اور اُن کے حلفا کی امداد سے ترکوں کو کامیابی اور محمد علی پاشا کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اور اس بنا پر سلطان عبدالمجید سے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے (حالانکہ یہ انگریزوں کی امداد اپنے مقاصد ہی کے لئے تھی اور حالانکہ انگریزوں نے صرف جہازوں سے مدد کی تھی۔ تمام جنگی کارروائیاں ترکی فوجیں ہی کر رہی تھیں۔ مگر انگریزوں نے اس دوستی سے بہت سے عظیم الشان فوائد حاصل کئے۔ منجملہ فوائد ایک فائدہ عدن پر قبضہ تھا جو کہ محض کوئلہ کے مخزن کے نام سے طلب کیا گیا تھا۔ سلطان مرحوم سے ظاہر کیا گیا کہ ہمارے جہازوں کی آمد و رفت کے لئے عدن میں کوئلہ کا مخزن ضروری ہے وہاں سے ہندوستان کی بندرگاہیں بہت دور پڑتی ہیں۔ جہازوں کے آتے وقت اور اسی طرح جاتے وقت جہازوں میں کوئلہ اور پانی کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے نیز وہ ایک ایسا مرکزی مقام ہے جہاں سے ہر طرف کی آمد و رفت اور تجارتی تعلقات اور کاروبار ہو سکتے ہیں اس کے لئے عدن میں ایسے مخزن کے لئے زمین اور اجازت دیجائے چنانچہ فرمان شاہی ہو گیا مگر انگریزوں نے بجائے مخزن کے تمام شہر اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں پر رفتہ رفتہ قبضہ کر لیا۔ عدن ایک عظیم الشان بندرگاہ اور جنگی مرکز ہو گیا۔ اس کے بعد باب المندب پر بھی قبضہ کیا گیا جس کے لئے سومالی لینڈ اور سوڈان اور مصر تک کی کوششیں کی گئیں اور ۱۸۸۵ء میں اس لڑائی کا خاتمہ ہوا جس کی تفصیل تو بہت زیادہ طویل ہے جو کہ مختلف تاریخی کتابوں میں درج ہے۔ مگر ہم نہایت اختصار کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں کہ پہلے پہل انگریز "راس امید" کے راستے سے جو کہ جنوبی افریقہ کا چکر کاٹ کر ہندوستان پہونچتا ہے آمد و رفت رکھتے تھے اس راستہ کی

مسافت بہت طویل ہے اس لئے جبکہ ۱۸۶۹ء میں نہر سوئز کو اسماعیل پاشا خدیو مصر نے کھدوا کر اس کا افتتاح کیا۔ تو انگریزوں کی آنکھیں کھلیں۔ انگریز مدبرین اس کی تعمیر کو ناممکن خیال کرتے تھے اس لئے اُنھوں نے ابتداء اس میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں لی مگر جب یہ تیار ہو گئی تب اس کی اہمیت سمجھی گئی اور اس پر قبضہ کرنے کی کوششیں طرح طرح عمل میں آنی شروع ہوئیں۔ انگریزوں نے اسماعیل پاشا سے خفیہ معاہدہ کر کے اسماعیل کے تمام حصے اونتالیس لاکھ چھتر ہزار پانچسو بیاسی (۳۹،۷۶،۵۸۲) پونڈ میں خرید لئے اور اس کے بعد مختلف طریقوں سے مصر میں مداخلت کرنے لگے[۱] جس کی تفصیل (تاریخ دولت عثمانیہ مصنفہ مسٹر محمد عزیز صاحب ایم اے علیگ جلد ثانی صفحہ ۲۱۲ تا ۲۴۳ پر درج ہے۔ بالآخر انگریزوں نے ۱۱ر جولائی ۱۸۸۲ء میں اسکندریہ پر بمباری کی اور انتہائی خفیہ اور علانیہ سازشوں اور غداریوں کے ساتھ اس جنگ کو دو برس تک جاری کر کے عرابی پاشا کو قید اور توفیق پاشا کو برسر اقتدار اس طرح لائے کہ وہ اُن کے ہاتھ میں بالکل کٹھ پتلی تھا۔ مورخ مذکور مسٹر عزیز مندرجہ ذیل الفاظ اس جنگ کے نتیجہ کے متعلق صفحہ ۲۴۳ پر لکھتے ہیں۔

"توفیق برٹش سنگینوں کے سایہ میں اسکندریہ سے قاہرہ آیا اور برطانیہ کی سرپرستی میں عنان حکومت ہاتھ میں لی۔ شریف پاشا نے وزارت قائم کی۔ نئے دور کا افتتاح یوں ہوا کہ وطنی تحریک کے علم بردار باغیوں کی حیثیت سے عدالت میں لائے گئے۔ عرابی پاشا کے لئے سزائے موت تجویز ہوئی لیکن مسٹر بلنٹ نے ایک کثیر رقم اپنی جیب سے خرچ کر کے اس مقدمہ کی پیروی جس انگریز بیرسٹر کے سپرد کی تھی اس نے صفائی میں ایسی شہادتیں پیش کیں کہ خدیو کو موت کی سزا منسوخ کر دینی پڑی تاہم عرابی پاشا تمام عمر کے لئے جلاوطن کر کے سیلون بھیجدیئے گئے۔ انگریزوں نے جس آسانی کے

---

[۱] انہیں مداخلتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسماعیل پاشا خدیو مصر کو معزول کرایا۔ مورخ مذکور کہتا ہے "برطانیہ اور فرانس کو سخت غصہ آیا اور انھوں نے باب عالی (سلطان عبدالحمید خاں ثانی مرحوم) پر دباؤ ڈالکر اسماعیل کو خدیو کے عہدہ سے معزول کرا دیا۔ ۲۶ر جون ۱۸۷۹ء کو باب عالی کا ایک تار اسماعیل کو ملا جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ وہ معزول کیا گیا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا توفیق خدیو مصر مقرر کیا گیا" صفحہ ۲۱۸۔

ساتھ مصر پر قبضہ پا لیا تھا اس کے لحاظ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ملک کی حکومت توفیق کے حوالہ کر کے خود واپس چلے جائیں گے۔ تل الکبیر کے بعد ہی انھوں نے مصر پر اپنا تسلط قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ مالیاتی امور کے انتظام میں بھی فرانس کو شریک کرنے پر تیار نہ تھے۔ توفیق اُن کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کام کر رہا تھا اُس نے ایک انگریز کالوین کو اپنی حکومت کا تنہا مُشیر مال مقرر کیا لارڈ ڈفرن جو اس وقت قسطنطنیہ میں برطانوی سفیر تھا بحیثیت ہائی کمشنر کے مصر آیا اور حکومت کے آئندہ انتظام کا خاکہ مرتب کر گیا۔ اس خاکہ کی تفصیلی خانہ پُری سر ایولین بیرنگ کے سُپرد ہوئی جس نے جنوری ۱۸۸۳ء میں بحیثیت قنصل جنرل کے چارج لیا یہی شخص ہے جو بعد میں لارڈ کرومر کے نام سے مشہور ہوا اُس کے آنیکے بعد مصر گویا سلطنت برطانیہ کا ایک صوبہ بن گیا۔ ملک کے ہر معاملہ میں برٹش جنرل قنصل کی رائے فیصلہ کن تھی مصری فوجیں انگریزی افسروں کے زیر کمان کر دی گئیں۔ انگریزی فوجیں جن کی تعداد چھ ہزار تھی پہلے ملک پر اپنا تسلط قائم کر چکی تھیں۔ برطانیہ نے اعلان کیا کہ مصر کی مالی حالت کے درست ہو جانے کے بعد انگریزی فوجیں واپس بلالی جائیں گی۔ لیکن مالی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی اور حکومت برطانیہ کی فرض شناسی نے کسی طرح گوارا نہ کیا کہ غریب مصریوں کو اپنے سایۂ عاطفت سے محروم کر دے "

بہر حال اس جنگ مصر اور سوڈان میں جو کچھ خرچ ہوا چونکہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیانی راستہ کے تحفظ کا ذریعہ تھا اس لئے وہ سب ہندوستان کے سر منڈھا گیا اور مبلغ ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ ہندوستان کے انڈین نیشنل ڈیبٹ (ہندوستانی قومی قرضہ) میں ڈالا گیا جس کا سود ہمیشہ ہندوستان ادا کرتا رہا۔ اس جنگ میں ہندوستانی فوج کے بیشمار آدمی جو کہ قتل کئے گئے یا زخمی ہوئے اور جو بے شمار سامان رسد و ہتھیار وغیرہ خرچ ہوا وہ سب اس نقد کے علاوہ ہے۔

اور چونکہ جنوبی افریقہ کے ممالک ٹرانسوال وغیرہ بھی ہندوستان اور انگلستان کے راستہ ہیں واقع ہیں قدیم راستہ راس اُمید کا انہیں ممالک سے گذرتا ہے۔ انگریز اسی راستہ سے ہندوستان آئے تھے اور نہر سوئز سے پہلے یعنی ۱۸۶۹ء سے قبل انہیں ملکوں پر ہو تے ہوئے آمد و رفت ہوا کرتی تھی اس لئے ان ملکوں کا تحفظ بھی ہندوستان ہی کے ذمہ قرار دیا گیا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۰ء میں جبکہ ساؤتھ افریقہ میں بغاوت ہوئی اور بوئیر کی لڑائی ظہور پذیر ہوئی تو اس کا خرچہ جو کہ دو کروڑ ساٹھ لاکھ (۲،۶۰،۰۰،۰۰۰) پونڈ تھا وہ بھی ہندوستان ہی پر ڈالا گیا اور ہندوستان کے قومی

قرضہ میں محسوب ہوا جس کا سود در سود ہندوستان برابر ادا کرتا رہا۔ جانی اور مالی مصارف اس کے علاوہ تھے۔

یہ قومی قرضہ (انڈین نیشنل ڈیٹس) ۱۸۵۷ء تک ۵ کروڑ دس لاکھ پونڈ تھا۔ ۱۸۶۲ء میں ۹ کروڑ ستر لاکھ پونڈ تک اور پھر ۱۹۱۰ء میں بیس کروڑ پونڈ تک پہنچ گیا۔ (خطبۂ صدارت مسٹر فضل حق از کتاب د ت)

اسی قومی قرضہ کی بنیاد جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء میں رکھی گئی تھی ہندوستان کے لئے (انگریزوں کے دعووں پر) جہاں بھی لڑائیاں ہوئیں خواہ ہندوستان کے اندر یا باہر وہ سب ہندوستان کے سر تھوپی گئیں اور ان کا صرفہ ہندوستان سے وصول کیا جاتا رہا۔ اور جو کچھ لوٹ میں وصول ہوتا تھا خواہ وہ کتنا بھی قیمتی ہوتا تھا وہ سب غنیمت شمار ہوتا رہا اس کی کوئی گنتی نہیں ہوئی چنانچہ

۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں	۳۰ لاکھ ۲۵ ہزار پونڈ
۱۷۸۲ء میں جنگ میر قاسم نواب بنگالہ میں	۵۲ لاکھ پونڈ
۱۸۰۷ء میں جنگ مرہٹہ میں	۲ کروڑ ۱۰ لاکھ پونڈ
۱۸۲۹ء میں جنگ کابل اول میں	۳۸ لاکھ پونڈ
۱۸۴۲ء میں جنگ نیپال میں	۱۰ لاکھ پونڈ
۱۸۵۸ء جنگ آزادیٔ ہند میں معہ جملہ مصارف و حصص کمپنی	۴ کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ

یہ سب اسی قرضہ میں شمار کئے گئے اور ہندوستان کے سر مڑھے گئے۔ ہندوستان ہمیشہ مقروض رہ کر سود ادا کرتا رہا۔ "اس قرضہ عامہ کی مقدار ۱۹۱۲ء میں ہندوستان پر چودہ ارب چودہ کروڑ تھی۔ ہندوستان کے قرضہ عامہ کا جزو اعظم انگریزوں سے انگلینڈ میں لیکر حکومت ہند کو دیا گیا اور سالانہ سود ہندوستان سے وصول کر کے اہل انگلینڈ کو دیا جاتا رہا۔ چنانچہ ۱۶ کروڑ پندرہ لاکھ سے زائد روپیہ صرف ایک سال سنہ ۱۲-۱۱-۱۹۱۱ء میں ہندوستان نے انگلستان کو محض بطور سود قرض عامہ ادا کیا" (علم المعیشۃ صفحہ ۶۰۵ - ۶۰۶) نیز وہ لکھتا ہے۔

"ہندوستانی قرض عامہ کی بنیاد ۱۸۵۷ء سے پڑی جبکہ کمپنی سے ہندوستان خریدنے کی قیمت اور غدر فرد کرنے کے کل مصارف (۴ کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ) ہندوستان سے وصول کرنے قرار پائے (مگر دت لکھتا ہے کہ اس کی بنیاد ۱۷۵۷ء یعنی جنگ پلاسی سے پڑی) یہ کل رقم بطور قرض عامہ انگلستان میں لیکر ہندوستان کے نام لکھدی گئی اور اس روز

سے آج کے دن تک ایک رقم بطور سود ہندوستان سے انگلستان وصول کرتا رہا ہے۔ ذرا خیال تو کرو کہ گذشتہ نصف صدی (بقول دت ڈیڑھ صدی سے زائد) میں ہندوستان کتنی رقم بطور سود انگلستان کو ادا کر چکا ہوگا۔"

ہندوستان سے وہ بے شمار دولت جو لوٹ کر انگلستان پہونچائی گئی تھی جس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں اور جس کو پراسپرس برٹش انڈیا میں مسٹر ڈگبی نے اور بروکس وغیرہ نے "مالا مال خزانوں، کروڑوں آدمیوں کی صدیوں کی کمائی، اور تمام دول یورپ کے مجموعی خزانوں سے زیادہ" لکھا ہے وہ کسی حساب میں نہیں لائے گئے۔)

اسی حفاظت راہ ہندوستان کے سلسلہ میں بحر ابیض (بحر روم) کو زیر تسلط اور اقتدار رکھنے کی غرض سے جزیرہ سائپرس (قبرص) پر قبضہ کرنا اور اپنی بحری قوت کا مرکز بنانا ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ باب عالی (سلطان عبدالحمید خاں مرحوم) سے ۱۸۷۸ء میں ایک خفیہ معاہدہ کے ذریعہ حاصل کیا گیا۔ جو کہ معاہدہ سان اسٹیفانو کی تنسیخ اور معاہدہ برلین کے انعقاد کے وقت بصورت امداد دولت علیہ واقع ہوا تھا۔ یہ جزیرہ معاہدہ برلن میں اس وقت تک کے لئے حوالۂ برطانیہ کیا گیا جب تک روس گذشتہ جنگ کی ایشیائی فتوحات سے اپنا قبضہ نہ اٹھالے نیز یہ جزیرہ برطانیہ کو اس غرض سے دیا گیا تھا کہ وہ روس کے مقابلہ کے لئے وہاں سامان جنگ تیار رکھ سکے۔ سلطان کی فرمانروائی کا حق قائم رکھنے کے لئے سالانہ خراج کی ادائیگی ضروری قرار دی گئی۔ (دولت عثمانیہ صفحہ ۱۷۱)

بالآخر یہ جزیرہ جو کہ تین سو برس سے ترکی سلطنت میں چلا آتا تھا اور زرخیز تھا اور بحیرہ روم میں بحری قوت کی مرکزیت کی شان رکھتا تھا انگریز ڈپلومیسی کی نذر بن گیا۔ اس کے علاوہ جبرالٹر اسپین سے اور مالٹا جمہوریہ وینس سے حاصل کیا گیا جس کی تفصیل کتب تاریخ میں موجود ہے۔ بہرحال بحیرہ روم پر برطانیہ نے مغربی کنارہ سے مشرقی کنارہ اور وسط پر پورا قبضہ کر لیا۔ واضح ہو کہ جبرالٹر اس بحیرہ کے مغربی سرے پر ہے اور سائپرس (قبرص) مشرقی سرے پر ہے اور مالٹا وسط میں واقع ہے۔ مالٹا کو شہنشاہی برطانوی بیڑہ کا مرکز بنایا گیا جس کے بڑے مصارف کا بوجھ ہندوستان پر رکھا گیا اور یہ ہی کہا گیا کہ یہ بیڑہ ہندوستان کا ہے اور اسی کے لئے ہم نے رکھ رکھا ہے ۔۔۔ ہندوستان کے لئے بحیرہ روم میں حفاظت اور راستہ کا امن و امان فوجوں اور تجارتی جہازوں کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ کچھ بحری قوت سائپرس میں اور کچھ جبرالٹر میں بھی ہمیشہ رکھی گئی۔ مگر اس پر کفایت نہیں کی گئی بلکہ ہمیشہ اس کی کوشش جاری رہی کہ بحر ابیض کے سواحل پر ہمارا یا ہمارے یورپین حلیفوں کا قبضہ ہو

جس کی کچھ تفصیل ہم عنقریب ذکر کریں گے۔

انگریزوں کا ممالک خارجہ پر قبضہ کرنا اور ایشیائی وافریقی قوموں اور بادشاہوں کے برباد کرنے کی سازشوں میں حصہ لینا

انگریزوں نے قوت پاتے ہی تمام ایشیائی اور افریقی ممالک کو غلام بنانے اور اپنے جبروت و اقتدار کے ماتحت کچلنے اور اُن کو لوٹ کر اپنے ملک اور قوم کو تنومند اور موٹا بنانے اور تمام باشندگان ایشیا وافریقہ کا خون ہمیشہ چوستے رہنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ بالخصوص جبکہ ۱۸۵۷ء میں اپنے جبر و استبداد کا وحشیانہ مظاہرہ کرنے کے بعد انھوں نے تمام ہندوستان کو اپنے گمان میں فنا کر دیا تھا تو دوسرے ممالک پر انتہائی چالاکی اور عیاری کے ساتھ پل پڑے۔ سب سے زیادہ انھوں نے حکومت عثمانیہ (ترک) کو اپنے تیر و نشتر کا نشانہ بنایا اور اسی طرح ایران، چین، ہند چینی، جاوا، برما، سماٹرا وغیرہ اور افریقہ کے سواحل اور ممالک پر چیرہ دستی شروع کی۔ مگر اُس کی تفصیل کے لئے ضخیم ضخیم مجلدات درکار ہیں۔ ہماری مختصر تالیف اس کی متحمل نہیں ہے۔ تاہم ہم مختصر نوٹ در بارہ سلطنت عثمانیہ وغیرہ پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین اس سے برطانیہ کی نیت اور طرز عمل سے وہ امور اندازہ کر لیں جن کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اندازہ کیا تھا۔

اس مقام پر ہم اقوام یورپ اور ترکی کی پرانی تاریخ کو پیش کرنے سے اعراض کرتے ہوئے صرف ۱۸۵۶ء سے واقعات کو اجمالاً شروع کرتے ہیں جبکہ برطانیہ کو کافی اقتدار اور قوت حاصل ہو گئی تھی۔ ۱۸۵۶ء ۲۵ر فروری کو پیرس میں ایک معاہدہ کی مجلس منعقد ہوئی جس میں دولت عثمانیہ، فرانس، انگلستان، روس، اسٹریا، ساڈینیا کے نمائندے شریک ہوئے آخر میں پرشیا کو بھی شریک کر لیا گیا تھا۔ ایک ماہ کے بحث و مباحثہ کے بعد ۳۰ر مارچ ۱۸۵۶ء کو صلحنامہ پیرس مرتب ہوا اور مذکورہ بالا سات حکومتوں کے نمائندوں نے اس پر دستخط کئے۔ اس کی خاص دفعات حسب ذیل تھیں۔

(۱) ان حکومتوں نے دولت عثمانیہ کو باضابطہ طور پر مجلس دول یورپ کا رکن بنا لیا اور اس کی آزادی اور اُس کے مقبوضات کی سالمیت کے لئے متحدہ طور پر ضمانت کی۔

(۲) سلطان نے بلا امتیاز نسل و مذہب تمام رعایا کی اصلاح حال کا وعدہ کیا اور یورپین حکومتوں نے صراحت کے ساتھ اعلان کیا کہ سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا مجموعی یا انفرادی طور پر انہیں کوئی

حق حاصل نہ ہوگا۔

(۳) بحر اسود تمام قوموں کے تجارتی جہازوں کے لئے کھول دیا گیا لیکن جنگی جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار پایا۔ روس اور دولت علیہ کو اس کے ساحلوں پر اسلحہ خانہ قائم کرنے کی بھی ممانعت کردی گئی۔

(۴) وہ تمام علاقے جو دورانِ جنگ میں فریقین نے فتح کرلئے تھے واپس کردیئے گئے۔ چنانچہ قارس دولت علیہ کے حوالہ کردیا گیا۔ اور کریمیا روس کے۔

(۵) ایک بین الاقوامی کمیشن کی نگرانی میں دریائے ڈینیوب بھی تمام قوموں کے جہازوں کے لئے کھول دیا گیا۔

(۶) جنوبی بسرابیا کا علاقہ جس پر روس نے قبضہ کرلیا تھا مولڈیویا میں شامل کردیا گیا۔ مولڈیویا اور ولاچیا کی ریاستوں پر باب عالی کی فرمانروائی بدستور رکھی گئی۔ روس ان ریاستوں کے حق سے جس کا وہ بلا شرکت غیرے دعویدار تھا دست بردار ہوگیا۔ اور ان کے حقوق کا تحفظ مذکورہ حکومتوں نے مجموعی طور پر اپنے ذمہ لے لیا۔ ان ریاستوں کو حکومت خود اختیاری کے حقوق عطا کئے گئے۔ انہیں مذہب، قانون سازی اور تجارت کی پوری آزادی اور ایک قومی مسلح فوج رکھنے کی اجازت دی گئی۔

(۷) سرویا کو بھی یہی حقوق دیئے گئے۔ البتہ قومی فوج رکھنے کی اجازت اسے نہ ملی۔ اس کے اندرونی معاملات میں باب عالی کی فوجی مداخلت دول یورپ کی اجازت کے بغیر ممنوع قرار دی گئی۔

ضمنی معاہدے

صلحنامہ پیرس کے تکملہ کے بعد اسی روز دو معاہدے اور مرتب ہوئے۔ ایک کی رو سے ۱۸۴۱ء کے معاہدہ کی تجدید کی گئی اور دردانیال اور آبنائے باسفورس میں غیر حکومتوں کے جنگی جہازوں کا داخلہ بند کردیا گیا۔ دوسرا صرف زار اور سلطان کے درمیان ہوا جس کی بنا پر ہر فریق کو چھ چھوٹے اسٹیمر اور چار ہلکی کشتیاں بحر اسود کی ساحلی ضروریات کے لئے رکھنے کی اجازت دی گئی۔

۵ اپریل کو ایک عہد نامہ اور ہوا۔ جس میں برطانیہ، آسٹریا، فرانس نے مجموعی اور انفرادی طور پر دولت عثمانیہ کی آزادی اور سالمیت کو قائم رکھنے کی ضمانت لی اور عہد کیا کہ صلحنامہ پیرس کے کسی جزو کی خلاف ورزی جنگ کا سبب قرار دیجائے گی۔ (دولت عثمانیہ جلد دوم صفحہ ۱۰۰-۱۰۱)

عہد نامہ پیرس کی خلاف ورزی

عہد شکنیاں ۱۔ ۱۸۷۰ء میں روس نے صلحنامہ پیرس کی خلاف ورزی کی اور اعلان کرتے ہوئے بحر اسود میں جنگی جہازوں کے ذریعہ اپنا تسلط پھر قائم کر لیا۔

۲۔ اور ۱۸۷۸ء میں بسرابیا کا وہ علاقہ جو ۱۸۵۶ء میں اس سے لیکر مولڈیویا میں شامل کر لیا گیا تھا واپس لے لیا اس وقت دول عظمیٰ میں سے کسی نے بھی صلحنامہ پیرس کی پرواہ نہ کی جس کی رو سے متفقہ طور پر انھوں نے سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کی ضمانت کی تھی۔

۳۔ مولڈیویا اور ولاچیا کی ریاستوں میں اتحاد و استقلال کی تحریک پیدا کی گئی اور ۱۸۵۹ء میں دول یورپ کی زیر حمایت الگزنڈر کوزا کو ان متحدہ ریاستوں کا پہلا امیر منتخب کیا گیا۔

۴۔ اس کے بعد کریٹ، سربیا، مونٹی نگرو، بوسینیا، ہرزی گوینا، بلغاریا میں بغاوت کی شورشیں برپا کرائی گئیں۔ معاہدہ پیرس پر دستخط کرنے والی حکومتوں میں سے کسی نہ کسی کی ہر ایک کو حمایت حاصل تھی۔ دولت علیہ کے مقبوضات کی حفاظت کا عہد ان شورشوں کے ساتھ پورا کیا گیا اور جب ان بغاوتوں کے فرو کرنے کے لئے عثمانی فوجیں روانہ کی جانے لگیں تو یورپین حکومتوں نے انہیں روکنے کی کوششیں کیں۔ چنانچہ فرانس اور روس نے ۱۸۵۸ء میں اپنے جہاز مانٹی نگرو کے ساحل پر اس لئے بھیجے تاکہ عثمانی فوجوں کو اس علاقہ میں داخل ہونے سے روکیں۔

۵۔ ۱۸۵۸ء میں کریٹ کے یونانیوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ یہ فتنہ وقتی طور پر دفع کر دیا گیا۔ لیکن ۱۸۹۶ء میں سلطان عبد العزیز خاں کے دور حکومت میں زیادہ قوت کے ساتھ پھر ابھرا اور ابکی مرتبہ حکومت خود اختیاری کے مزید حقوق دیکر باغیوں کو راضی کرنا پڑا۔

۶۔ جولائی ۱۸۵۸ء میں جدہ کے عیسائیوں اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوا۔ چند مسلمانوں نے فرانسیسی قنصل اور اس کے اسٹاف پر حملہ کر دیا۔ جس میں قنصل اور اس کا سکریٹری مجروح ہوا اور قونصل کی بیوی ماری گئی۔ فوراً ہی انگریزی اور فرانسیسی بیڑے قسطنطنیہ پہنچے۔ باب عالی نے اطمینان دلایا کہ مجرموں کو کافی سزا دیجائیگی

لیکن چونکہ سزا میں کچھ تاخیر ہوئی اس لئے انگریزی بیڑے نے جدہ پہونچکر نامق پاشا والی مکہ سے جو جدہ آ گئے تھے اور انھوں نے مجرموں کو گرفتار کر لیا تھا مطالبہ کیا کہ مجرموں کو فوراً پھانسی دیدی جائے۔ ورنہ چوبیس گھنٹوں کے بعد گولہ باری شروع کر دیجائے گی۔ نامق پاشا کو باب عالی کے حکم کا انتظار تھا۔ اس لئے انھوں نے فوراً پھانسی دینے میں تامل کیا۔ اس پر انگریزی بیڑے نے گولہ باری شروع کر دی۔ اسی اثنا میں اسماعیل پاشا عثمانی بیڑے کے ساتھ جدہ پہونچ گئے۔ انھوں نے گولہ باری بند کرا کے مجرموں کو پھانسی کا حکم سنایا۔ اگر اسماعیل پاشا کا بیڑہ وقت پر نہ پہونچ گیا ہوتا تو جدہ تباہ ہو جاتا اور برطانیہ سے باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی۔

ے۔ ۱۸۶۰ء میں شام میں دروزیوں اور مارونیوں میں جھگڑا ہوا۔ دروزی مسلمان تھے اور مارونی کیتھولک عیسائی تھے۔ کشت و خون کی نوبت آئی۔ کسان مارونیوں نے ابتدا کی اور چونکہ یہ ہنگامہ نظام جاگیرداری کی بنا پر ہوا تھا اس لئے انھوں نے اپنے ہم مذہب جاگیرداروں پر پہلے حملہ کیا۔ دروزی شیوخ نے بھی مارونی جاگیرداروں کا ساتھ دیا۔ مگر چند دنوں کے بعد پادریوں کے بھڑکانے سے اس شورش نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔ اور نہایت تیزی سے شام کے اکثر حصوں میں پھیل گئی۔ خصوصاً لبنان میں اس کے شعلے ہر طرف پھیل گئے۔ مارونیوں نے قتل و غارت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن چونکہ دروزی نسبتاً زیادہ طاقتور تھے اس لئے بالآخر غلبہ انہیں کو حاصل ہوا۔ اور انتقام کے جوش میں انھوں نے ہزاروں عیسائیوں کو قتل کر ڈالا دمشق میں عیسائیوں کا قتل زیادہ ہوا۔ فرانسیسی مورخ دلاژون کیر کہتا ہے کہ "دمشق میں اگر امیر عبدالقادر الجزائری نہ ہوتا تو ایک عیسائی کی بھی صورت دکھائی نہ دیتی۔ یہ عرب بہادر جس نے سولہ سال تک فرانسیسیوں سے نہایت بیدردی سے جنگ کی تھی دمشق میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ آگ کے شعلے پہلے ہی دفعہ بھڑکے تھے اور درماندوں کی صدا پہلی ہی دفعہ بلند ہوئی تھی اُس نے بلا کسی پس و پیش کے عیسائیوں اور اُن کے قاتلوں کے درمیان اپنے آپ کو ڈال دیا۔ ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ اُس نے عیسائیوں کو عوام الناس سے چھڑایا اور اپنا محل انہیں رہنے کو دیا جو ہزاروں سے آگے پناہ لینے لگے۔ اور عیسائیوں کے سکونتی مقام پر عرب سواروں کی پہرہ بندی کر دی۔ اس شخص نے جو مسلمان اور اولاد پیغمبر اسلام تھا اور فرانس کا قدیم دشمن تھا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ان خونخوار ٹولیوں کو پسپا کیا

جو اسلام اور ترکی کے لئے باعث ننگ تھیں اُس نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان بدقسمتوں پر پوشاک کے لئے بے دریغ روپیہ خرچ کیا جنھیں اُس نے موت کے پنجہ سے رہائی دی تھی۔ اُس نے خود اپنی نگرانی میں عیسائی محافظین کو بیروت پہونچایا جہاں اُنہیں کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ اس کا یہ ایثار اس کی یہ شرافت اور اُس کی یہ شریفانہ بہادری ایک لمحہ کے لئے بھی کم نہ ہوئی۔ اس کی زندگی کا یہ صفحہ ایسا شاندار ہے جس کے آگے ایک صدی کا کارنامہ بھی مدہم پڑ جاتا ہے۔ (تاریخ دولت عثمانیہ از دلاڑون کیر ترجمہ اردو جلد اول صفحہ ۵۰۰ دولت عثمانیہ صفحہ ۱۰۶)

یہ واقعات سُنکر سبھی یورپ کے ہر گوشہ سے صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ فرانس کیتھولک مارونیوں کا خاص حامی تھا اُس نے اُن کی مدد کے لئے ایک فوج شام میں بھیجنی چاہی مگر اس اندیشہ سے کہ مبادا فرانس شام میں اپنا تسلط قائم کرلے پہلے تو برطانیہ اور دوسری حکومتوں نے یہ تجویز منظور نہ کی مگر آخر کار ۳ اگست سنہ ۱۸۶۰ء کو سارڈینیا کے علاوہ ان تمام مغربی حکومتوں نے جنھوں نے صلحنامہ پیرس پر دستخط کئے تھے پیرس ہی میں یہ طے کیا کہ بارہ ہزار یورپین فوج شام میں امن قائم کرنے کی غرض سے روانہ کی جائے۔ چنانچہ فرانس نے فوراً چھ ہزار فوج روانہ کی۔ لیکن اس فوج کے شام پہونچنے سے قبل فواد پاشا وزیر خارجہ سلطان کے حکم سے وہاں پہونچ کر اس شورش کو رفع کر چکے تھے۔ اُن کے حکم سے عثمانی فوج کے ایک سو گیارہ سپاہی گولی سے مارے گئے۔ ستاون بڑے بڑے دروزی پھانسی پر لٹکائے گئے اور خود احمد پاشا والی دمشق کو قتل کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد بیروت میں ایک بین الاقوامی کمیشن بیٹھا جس کے فیصلہ کے مطابق بیسکڑوں دروزی جلاوطن کر کے طرابلس (افریقہ) بلغراد اور ودین بھیجدیئے گئے۔ خورشید پاشا حاکم بیروت کو موت کی سزا تجویز ہوئی لیکن بعد میں اُن کو معزول کر کے قسطنطنیہ بلالیا گیا۔ عیسائیوں کے نقصانات کی تلافی کے لئے سات کروڑ پچاس لاکھ قرش کی رقم باب عالی کی طرف سے منظور ہوئی جو باقساط ادا کردی گئی۔ لبنان کی آئندہ حکومت کے متعلق کمیشن نے یہ فیصلہ کیا کہ اُسے دولت عثمانیہ کے زیر سیادت خود مختار کردیا جائے اور اُس کے والی کا تقرر سلطان کی عیسائی رعایا میں سے باب عالی کی طرف سے ہوا کرے۔ وہ فوج جو فرانس نے بھیجی تھی تو مہینہ تک شام میں مقیم رہی حالانکہ جس غرض سے یہ فوج بھیجی گئی تھی وہ فواد پاشا کے دمشق پہنچنے کے بعد ہی پوری ہو چکی تھی اُسے نو ماہ تک قیام کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن دول عظمیٰ نے دولت عثمانیہ کی حمایت کا جو پیمان

صلحنامہ پیرس میں باندھا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ اُس کے ملکی انتظامات میں مداخلت کرنے کے لئے محض نیک مشوروں پر قناعت نہ کی جائے بلکہ حسب ضرورت فوجی مدد بھی بہم پہونچائی جائے۔ بالآخرہ رجون ۱۸۶۰ء کو یہ فوج شام سے روانہ ہوئی۔ (دولت عثمانیہ صفحہ ۱۰۷-۱۰۸)

(۸) ۱۸۶۱ء میں ولاچیا اور مولڈیویا کی ولایتوں نے باضابطہ متحد ہوکر رومانیہ کی ریاست قائم کرلی اور ۱۸۶۶ء میں جرمن شاہزادہ چارلس کو اس نئی ریاست کا فرمانروا منتخب کیا۔ یہ کارروائی صلحنامہ پیرس کی مخالف تھی لارڈ ایورسلے لکھتا ہے کہ دول عظمیٰ کو اس بات کی فکر تھی کہ حتی الامکان باب عالی کو آویزش سے بچایا جائے اس لئے اُن کے سفیروں نے سلطان پر دباؤ ڈال کر شہزادہ چارلس کو اس نئی ریاست کا موروثی فرماں روا تسلیم کرالیا (دول عظمیٰ کی یہ خیراندیشی کوئی نئی چیز نہ تھی۔ باب عالی کو اس کا تجربہ اس وقت سے ہوتا آیا تھا جب سے دولت علیہ کا زوال شروع ہوتا گیا۔) رومانیہ پر اگرچہ سلطان کی فرمانروائی نام کے لئے باقی رہی تاہم عملاً وہ گویا آزاد ہوگیا۔ (دولت عثمانیہ صفحہ ۱۱۲ ج ۲)

(۹) سلطنت عثمانیہ کے متعلق دول عظمیٰ کی یہی خیراندیشی سرویا کے معاملہ میں بھی ظاہر ہوئی۔ صلحنامہ پیرس کی رو سے دولت علیہ کو بلغراد اور سرویا کے تین دوسرے قلعوں میں فوجی دستے رکھنے کا حق حاصل تھا۔ ترکوں کی گذشتہ حکومت کا اتنا ہی نشان باقی رہ گیا تھا۔ لیکن دول عظمیٰ کی سرپرستی میں اہل سرویا نے اس نشان کو بھی مٹا دینے کا فیصلہ کرلیا اور باب عالی سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی فوجیں ان قلعوں سے نکال لے۔ باب عالی نے معاہدۂ پیرس کی بنا پر انکار کیا اور سرویا کو جنگ کی دھمکی دی۔ لیکن چونکہ اسی زمانہ میں جزیرہ کریٹ میں بغاوت برپا تھی اور باب عالی کی ساری توجہ اس کی طرف مبذول تھی اس لئے دول عظمیٰ کے سفیروں کا دوستانہ مشورہ قبول ہی کرنا پڑا۔ اور مارچ ۱۸۶۷ء میں ترکی فوجیں بلغراد اور دوسرے سروی قلعوں سے واپس بُلالی گئیں۔ اب سرویا کا استقلال مکمل ہوگیا اور اُس کے امیر نے بادشاہ کا لقب اختیار کرلیا (دولت عثمانیہ صفحہ ۱۱۵)

(۱۰) کریٹ کی بغاوت یونانیوں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی۔ یونان اس جزیرہ کو اپنے میں شامل کرلینا چاہتا تھا اور اس غرض سے وہاں کے عیسائیوں کو جو کہ زیادہ تر یونانی نسل کے تھے دولت عثمانیہ کے خلاف برابر ابھارتا رہتا تھا۔ بغاوت کی شورش زیادہ ہوئی تو اسماعیل پاشا خدیو مصر نے بھی اپنی فوجیں دولت علیہ کی مدد کے

لئے کریٹ بین بھیجیں اور دولت علیہ نے بھی یکے بعد دیگرے افسر اور فوجیں بھیجیں۔ اخیر میں عمر پاشا البطل کریبیا کو وہاں کا حاکم اور سر عسکر بنا کر بھیجا۔ عمر پاشا کو بغاوت کے فرو کرنے میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ قریب تھا کہ وہ اس فتنہ کو پوری طرح دبا دیتے لیکن عین اسی وقت دول عظمیٰ نے مداخلت کی اور عمر پاشا کو اپنا ہاتھ روک لینا پڑا۔ آخر کار ۱۸۶۹ء میں دول عظمیٰ کی تجویز سے ایک کانفرنس پیرس میں منعقد کی گئی جس کا نتیجہ حسب سابق یہ ہوا کہ سلطان کی طرف سے ایک فرمان جاری کیا گیا جس کی رو سے کریٹ کو حکومت خود اختیاری کے بعض حقوق دیدیئے گئے اور دو سال کا خراج جو واجب الادا تھا معاف کر دیا گیا۔ نیز اہل جزیرہ فوجی خدمت سے بری کر دیئے گئے۔ اس طرح یہ بغاوت کچھ دنوں کے لئے فرو ہو گئی۔

(دولت عثمانیہ ص ۱۱۶ مختصراً)

(۱۱) ۱۸۷۰ء میں باب عالی کو دول عظمیٰ کی دوستی کا ایک اور تجربہ ہوا۔ صلحنامہ پیرس کی ایک دفعہ کی رو سے بحر اسود میں روس اور ترکی کے جنگی جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا تھا اور ان دونوں حکومتوں کو اس کے ساحلوں پر بحری اسلحہ خانے قائم کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی لیکن جب ۱۸۷۰ء میں فرانس اور جرمنی کی جنگ شروع ہوئی تو روس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ پابندی توڑ دینی چاہی اور ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو مذکورہ بالا دفعہ کی شکست کا اعلان کر دیا۔ جرمنی کے وزیر اعظم پرنس بسمارک نے اس جنگ میں روس کی غیر جانبداری اسی قیمت پر حاصل کی تھی کہ "معاہدہ پیرس کی اس خلاف ورزی میں جرمنی روس کی تائید کریگا"۔ فرانس خود اپنی مصیبت میں مبتلا تھا وہ روس کو برانگیختہ کرنیکے لئے کسی طرح تیار نہ تھا۔ برطانیہ کی عنان حکومت مسٹر گلیڈسٹون کے ہاتھ میں تھی جنھوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ قرار دے رکھا تھا کہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں چنانچہ برطانیہ نے بھی روس کے اس فعل کے خلاف مطلق احتجاج نہیں کیا اور روس نے بحر اسود پر اپنا تسلط پھر قائم کر لیا۔ (دولت عثمانیہ ص ۱۱۶ - ۱۱۷)

(۱۲) ۱۸۷۵ء میں بوسنیا اور ہرزیگوینا کے باشندوں سے بغاوت کرائی گئی۔ اس میں روس، آسٹریا جرمنی کا بہت زیادہ ہاتھ تھا۔ باب عالی نے بار بار مراعاتیں دیں۔ مگر چونکہ ابھارنے والوں کے مقاصد پورے نہیں ہوتے تھے اس لئے بغاوت فرو نہ ہوئی۔ بالآخر دول عظمیٰ نے ظاہری مداخلت کا موقعہ پایا چنانچہ روس

آسٹریا اور جرمنی کے فرمانرواؤں نے باہم مشورہ کیا اور آسٹریا کے چانسلر کاونٹ اندراسی نے بوڈاپسٹ سے وہ نوٹ جاری کیا جو اُس کے نام سے مشہور ہے۔ اس نوٹ میں اولاً یہ درج ہے کہ دول عظمیٰ بغاوت کے فرو کرنے اور یورپ میں امن قائم کرنے کے لئے سخت بے چین ہیں اور باب عالی ان اصلاحات کے نافذ کرنے سے جو کہ مدت سے واجب ہو چکی تھیں نہایت قاصر رہا ہے۔ پھر درج ہے کہ سلطان پر دباؤ ڈال کر مندرجہ ذیل مطالبات پورے کرلئے جائیں۔ الخ

۳۰ جنوری ۱۸۷۶ء کو تمام دول عظمیٰ کی طرف سے یہ اندراسی نوٹ باب عالی میں پیش کیا گیا۔ ۱۱ فروری ۱۸۷۶ء کو سلطان نے تمام دفعات باستثنار ایک دفعہ کے جس میں ٹیکسوں کو صرف مقامی ضروریات میں صرف کرنے پر زور دیا گیا تھا منظور کرلیں۔ لیکن اس کے بعد بھی باغیوں نے ہتھیار نہیں رکھے اور اس بات کا مطالبہ کرتے رہے کہ پہلے اصلاحات جاری کردی جائیں۔ باب عالی کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ بغاوت جب تک قائم ہے اصلاحات کی اسکیم نافذ کرنا ممکن نہیں۔ اس درمیان میں شورش برابر بڑھتی چلی گئی۔ بوسنیا بھی ہرزیگوینا کے ساتھ شریک ہو گیا۔ دوسری طرف سرویا، مونٹی نگرو اور بلغاریہ بھی علم بغاوت بلند کرنے کے لئے آمادہ نظر آتے تھے۔ (دولت عثمانیہ صفحہ ۱۲۸-۱۲۹-۱۳۰ مختصراً)

۱۳۔ باب عالی کی صلح جوئی اور انتہائی مراعات کے باوجود بلقان کے عیسائیوں میں سرکشی کا جذبہ یورپین حکومتوں کی حوصلہ افزائی سے روز بروز زیادہ مشتعل ہوتا جا رہا تھا کہ ۵ مئی ۱۸۷۶ء کو سالونیکا میں جرمن اور فرانسیسی قنصلوں کے قتل کا واقعہ پیش آیا جس نے سارے یورپ کو ترکوں کے خلاف دفعتہً برانگیختہ کردیا۔ سبب یہ ہوا کہ ایک بلغاری لڑکی اسلام قبول کرکے اپنے گاؤں سے سالونیکا آئی تاکہ وہاں کی مجلس عالیہ کے سامنے اس کا اعلان کرکے اپنے ایک ہم وطن نوجوان مسلمان سے شادی کی اجازت حاصل کرے۔ جب وہ سالونیکا کے اسٹیشن پر پہونچی تو یونانیوں اور بلغاریوں کا ایک کثیر مجمع پہلے سے موجود تھا ان لوگوں نے لڑکی کے نقاب اور فرغل کو نوچ کر پھینکدیا اور زبردستی ایک گاڑی میں بٹھا کر فوراً امریکن قنصل خانہ میں پہونچا دیا۔ جہاں نائب قنصل نے جو ایک بلغاری عیسائی تھا اور اسی نے یہ تمام انتظامات کئے تھے لڑکی کو رات بھر چھپائے رکھا اور دوسرے دن اُسے اپنے ایک دوست کے گھر بھیج دیا کہ سُراغ نہ مل سکے۔ علی الصباح مسلمانوں کا ایک گروہ جس میں زیادہ تر

ادنیٰ طبقہ کے لوگ تھے، قنصل خانہ کے پاس جمع ہوا اور لڑکی کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ادھر سے جواب ملا کہ لڑکی یہاں نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ برہم ہو کر قریب کی ایک مسجد میں اکٹھا ہوئے اور آئندہ تدبیروں پر غور کرنے لگے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے اس جوش کی حالت میں جرمن اور فرانسیسی قنصل مسجد میں داخل ہوئے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مجمع کو سمجھانے کے لئے مسجد میں گئے یا مسجد کے دروازہ کے قریب تھے اور بھیڑ کے دھکے میں بلا ارادہ اندر پہونچ گئے تھے۔ بہر حال جس صورت سے بھی وہ گئے ہوں مجمع انہیں مسجد کے اندر دیکھتے ہی بے قابو ہو گیا اور چند آدمی کھڑکیوں کی آہنی سلاخیں کھینچکر اُن پر ٹوٹ پڑے اور دونوں کو وہیں ختم کر دیا انگریزی قونصل مسٹر بلنٹ نے شروع ہی میں مجمع کا رنگ دیکھ کر امریکن نائب قنصل لزارو کے یہاں جو اس ہنگامہ کا اصلی باعث تھا بہت اصرار کے ساتھ کہلا بھیجا کہ لڑکی فوراً واپس کر دی جائے۔ ورنہ جرمن اور فرانسیسی قنصلوں کی جان خطرہ میں ہے۔ لیکن لزارو نے پہلے تو یہ عذر کیا کہ معلوم نہیں لڑکی کہاں ہے اور جب بلنٹ کے مزید اصرار پر اُس نے لڑکی واپس کی تو وقت گذر چکا تھا اور دونوں قنصل مارے جا چکے تھے اگرچہ باب عالی نے مجرموں کی سزا کے لئے فوراً احکام صادر کئے اور چھ آدمیوں کو پھانسی دیدی گئی اور بہتوں کو قید کی سزائیں دی گئیں۔ تاہم یورپ کا جوش انتقام اس کے بعد بھی ٹھنڈا نہ ہوا۔ یورپین پریس نے اس آگ کو خوب بھڑکایا اور ہر طرف سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ سلطنت عثمانیہ کے تمام عیسائیوں کی جانیں خطرہ میں ہیں اور وہاں کی پوری مسلمان آبادی عیسائیوں کے قتل عام پر آمادہ ہو گئی ہے۔ عیسائیوں کے تحفظ کے لئے جو تجویزیں پیش کی گئیں اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ ترکوں کے مقابلہ میں صلیبی اتحاد قائم کیا جائے۔

(دولت عثمانیہ ص ۱۳۱-۱۳۲)

۱۶۹ ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء میں دستور اساسی کا اعلان کیا گیا۔ اس کے اعلان پر ملک کے ہر طبقہ نے مسرت کا اظہار کیا۔ علماء شیخ الاسلام خیر اللہ افندی کی قیادت میں، عیسائی پادری اپنے بطریقوں کے ساتھ، شاکر افندی جو قسطنطنیہ کے کبار علماء میں سے تھے طلبہ کی جماعت لیکر اور دار السلطنت کے عام باشندے جھنڈے لئے ہوئے جن پر آزادی کا لفظ منقوش تھا مدحت پاشا کے مکان پر مبارکباد دینے کے لئے آئے۔ شام کے وقت تمام مسجدوں میں چراغاں کیا گیا۔ لوگ مشعلیں لئے ہوئے سڑکوں پر گشت کرتے تھے اور سلطان

زندہ باد اور مدحت پاشا زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ سلطنت کے تمام صوبوں سے مبارکباد کے تار آئے جن میں مسرت کا اظہار کیا گیا تھا۔ عیسائی رعایا کے لئے دستور اساسی کا اعلان خواہ کتنا ہی مسرت کا باعث ہوا ہو لیکن یورپین حکومتوں خصوصاً برطانیہ کو یہ چیز پسند نہ آئی۔ کیونکہ اس سے دولت علیہ کے اندرونی معاملات میں ان کی مداخلت کا بہت کچھ سدباب ہو رہا تھا۔ سب سے پہلا اعتراض یہ کیا گیا کہ اس دستور کا مقصد محض دول یورپ کی اس کانفرنس کو شکست دینا تھا جو عیسائیوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے منعقد ہونے والی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ دستور کا اعلان اسی روز ہوا جس روز کانفرنس منعقد ہوئی۔ لیکن اس کے لئے مدحت پاشا اور اُن کے ساتھی ایک سال سے کوشش کر رہے تھے۔ جیسا کہ سرہنری ایلیٹ سفیر برطانیہ کے ایک خط سے صاف معلوم ہوتا ہے جو رسالہ نائنٹینتھ سنچری بابت فروری ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ سرہنری لکھتے ہیں۔ الخ (دیکھو دولت عثمانیہ ص۱۵۵ جلد ۲)

ع۱۵۔ ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء کو جس روز قانون اساسی کا اعلان ہوا قسطنطنیہ میں دول عظمیٰ کے نمائندوں کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ ابتدائی کارروائی مشکل سے ختم ہوئی تھی کہ باسفورس کے دوسرے کنارہ سے توپوں کی آواز آنے لگی۔ صفوت پاشا وزیر خارجہ دولت عثمانیہ نے کھڑے ہو کر ارکان مجلس کو مخاطب کیا اور کہا کہ ان توپوں کی آواز جو آپ سن رہے ہیں وہ سلطان المعظم کی طرف سے اعلان قانون اساسی کی دلیل ہے اور یہ قانون بلا استثنار سلطنت کی تمام رعایا کے حقوق و حریت کا کفیل ہے کانفرنس کا جو مقصد تھا وہ حاصل ہو گیا اب اس کا انعقاد اور اس کی کارروائیاں فضول ہیں۔ صفوت پاشا کی تقریر سے مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ چند لمحوں کے بعد اگناتیف دسفیر روس) نے ہر خاموشی توڑی اور یہ تجویز پیش کی کہ کانفرنس کو اپنا کام شروع کرنا چاہیئے۔ دول عظمیٰ کے وکلا ایک مہینہ سے قسطنطنیہ میں مقیم تھے اور باہم جلسے کر رہے تھے۔ ان جلسوں میں ترک مندوبین عمداً شریک نہیں کئے گئے تھے۔ ۲۰ دسمبر کو باضابطہ اجلاس سے پہلے وہ لائحہ عمل جو دولت علیہ کے سامنے پیش کیا جانیوالا تھا طے کر لیا گیا تھا۔ اس غیر معمولی کارروائی کا مقصد باب عالی کو یہ یقین دلانا تھا کہ کانفرنس جو فیصلہ کرے گی وہ دول یورپ کا متفقہ فیصلہ ہوگا اور باب عالی کو یہ توقع نہ رکھنی چاہیئے کہ وہ دول عظمیٰ کی رقابتوں سے کچھ فائدہ اٹھا سکے گا چونکہ تمام معاملات حقیقتاً پہلے ہی طے کر لئے گئے تھے۔ اس لئے کانفرنس کا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ اپنے فیصلوں کو باضابطہ طور

مرتب کرے۔ چنانچہ کانفرنس کی کاروائی روسی سفیر کی اس تجویز سے شروع ہوئی کہ صوبہ بلغاریہ کو حکومت خود اختیاری دیدی جائے۔ وہاں ایک عیسائی والی مقرر کیا جائے اور ایک قومی ردیف قائم کی جائے اور ترکی فوجیں صرف چند متعین قلعوں میں باقی رکھی جائیں۔ ترک مندوبین کے اس جواب پر کہ یہ امور دائرہ بحث سے بالکل خارج اور قطعاً ناقابل قبول ہیں۔ یہ تجویز یوں ترمیم کردی گئی کہ بلغاریا کو ایک خاص گورنمنٹ دیدی جائے۔ ایک بین الاقوامی کمیشن اس کے انتظامات کی نگرانی کے لئے مقرر کردیا جائے اور اس گورنر کا تقرر دول عظمیٰ کی منظوری سے ہوا کرے۔ اگناتیف (سفیر روس) نے یہ تجویز کم سے کم مطالبہ کے طور پر پیش کی تھی۔ ترک مندوبین نے اس پر بھی اعتراض کیا اور کہا کہ سرویا اور رومانیا کی مثالیں سامنے ہیں جن کو مخصوص رعایتی حکومتیں دی گئی تھیں اور وہی خاص انتظامات ان کے لئے بھی کئے گئے تھے جو بلغاریا کے لئے تجویز ہو رہے ہیں۔ لیکن نتیجہ کو دیکھتے ہوئے اسی تجربہ کو بلغاریہ میں دہرانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ انھوں نے بتایا کہ سرویا اور رومانیا کی مسلمان آبادی کے ساتھ رواداری اور مساوات کا وہ سلوک نہیں کیا گیا جس کا وعدہ کیا گیا تھا اور جو بطور شرط کے منظور کیا گیا تھا۔ برخلاف اس کے وہاں کے مسلمان باشندے ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ علاوہ بریں یہ ریاستیں زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کے بعد بھی جبکہ انہیں کسی قسم کی شکایت کا موقع باقی نہ رہ گیا۔ سلطنت عثمانیہ کے دشمنوں سے اتحاد کرنے یا اس کے خلاف سازش کرنے سے کبھی باز نہ آئیں۔ بالآخر طویل بحث و مباحثہ کے بعد دول عظمیٰ کے نمائندوں کی طرف سے کم سے کم مطالبہ یہ پیش کیا گیا جس میں اب کسی تخفیف کی گنجائش نہ تھی کہ مقامی حکام کی مدد کے لئے ایک قنصل کمیشن مقرر کردیا جائے اور بلغاریا، ہرزیگوینا اور بوسینیا کے صوبوں کے والی پہلے پانچ سال تک دول عظمیٰ کی منظوری سے مقرر کئے جائیں۔ ترک مندوبین اس تجویز سے بھی اتفاق نہ کرسکے انہوں نے کہا قنصلی کمیشن کا تقرر قوم کے حقوق خاص میں رخنہ اندازی کا باعث ہوگا جسے منظور کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ اس کے علاوہ ایک عملی دشواری یہ بھی ہے کہ ان صوبوں کے لئے کوئی مخصوص انتظام کردینے سے سلطنت کے دوسرے صوبوں میں بے اطمینانی پیدا ہوجائے گی اور غالب ہے کہ بعض میں شورش بھی رونما ہوجائے۔ انھوں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ یہ موقع سلطنت کے کسی ایک

حصّہ کے لئے مخصوص مراعات حاصل کرنے کا نہیں ہے جبکہ سلطان کی طرف سے ایک ایسے دستور کا اعلان کر دیا گیا ہے جس میں بلا امتیاز تمام رعایا کو سلطنت کے ہر حصّہ میں زیادہ سے زیادہ امکانی آزادی اور مساوی حقوق دیئے گئے ہیں۔ اس پر جنرل اگناتیف نے ایک نہایت سخت تقریر کی جس کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا۔ اور ارکان نے ترک مندوبوں کی اس احتجاجی تقریر کے سننے کا بھی انتظار نہیں کیا جو اگناتیف کی تقریر کے جواب میں وہ کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال یہ آخری ترمیم شدہ تجویز دول عظمیٰ کے نمائندوں نے ایک الٹی میٹم کی شکل میں باب عالی میں بھیجی اور یہ دھمکی دی کہ اگر ایک ہفتہ کے اندر اس کا جواب قابل اطمینان نہ آیا تو ہم قسطنطنیہ سے روانہ ہو جائیں گے۔ مدحت پاشا نے سلطان کے حکم سے ایک مجلس عالیہ منعقد کی جس میں سلطنت کی تمام قوموں کے نمائندے شریک کئے گئے اور ان کے سامنے کانفرنس کی یہ آخری تجویز پیش کی گئی۔ مدحت پاشا نے اپنی تقریر میں صاف صاف بتا دیا کہ اگر یہ تجویز مسترد کر دی گئی تو جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس کے بعد حاضرین نے پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا۔ رؤف بے بن رفعت پاشا نے کہا کہ لڑائی مثل بخار کی بیماری کے ہے جس سے بچنا ممکن ہے لیکن کانفرنس کی تجویز مثل پھیپھڑوں کی دق کے ہے جس کا لازمی نتیجہ قبر ہے۔ صادا پاشا نے ایک طویل خطبہ میں کہا کہ ہم اپنی عزت کی اہانت پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ سوکیل بطریق ارمنی نے بھی ایک لمبی تقریر کی جس میں کانفرنس کے مطالبات کے مسترد کرنے پر زور دیا۔ غرض مجلس نے متفقہ طور پر دول عظمیٰ کے مطالبات منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ دول عظمیٰ کے الٹی میٹم کے خلاف مجلس عالیہ کا یہ فیصلہ یقیناً تعجب خیز تھا لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز وہ اتفاق و اتحاد تھا جو اس نازک موقعہ پر وطن کی محبت اور عزت کے لئے مجلس کے مسلمان، عیسائی اور یہودی ممبروں میں ظاہر ہو رہا تھا یونانی اور کیتھولک، آرمینی ممبروں کا جوش خصوصیت کے ساتھ بہت نمایاں تھا۔ باب عالی نے اس فیصلہ کی اطلاع دول عظمیٰ کے نمائندوں کو دیدی۔ چنانچہ ۲۰ جنوری ۱۸۷۷ء کو وہ قسطنطنیہ سے روانہ ہو گئے اور کانفرنس برخاست ہو گئی (دولت عثمانیہ صفحہ ۱۵۸-۱۵۹-۱۶۰-۱۶۱)

ح۱۶ ۲۴ اپریل ۱۸۷۷ء کو روس نے اعلان جنگ باضابطہ کر کے عثمانی سرحدوں کو عبور کرنے کا حکم دے دیا

رومانیہ جو کہ دولت علیہ کا باجگذار تھا روس سے مل گیا۔ شرط یہ کی کہ اس کی آزادی اور خود مختاری تسلیم کر لی جائے اور روسی فوجوں کو رومانیہ کے علاقوں سے گذرنے کی اجازت دیدی اور پھر باضابطہ طور پر اعلان جنگ کر کے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مونٹی نگرو نے بھی صلح توڑ کر از سر نو جنگ شروع کر دی۔ زار روس نے رایشاٹ میں شہنشاہ آسٹریا سے ملاقات کر کے اُسے مطمئن کر دیا تھا کہ وہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا مطلقاً ارادہ نہیں رکھتا اور یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ اگر اس جنگ میں آسٹریا غیر جانبدار رہا تو بصورت فتح بوسینیا اور ہرزیگوینا کے صوبے اس کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔ ہر جون ۱۸۷۷ء میں روس نے انگلستان کی غیر جانبداری بھی اسی قسم کے ایک معاہدہ سے حاصل کر لی اور وعدہ کیا کہ مصر اور نہر سوئز سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا اور نہ قسطنطنیہ یا آبنائے باسفورس پر حملہ ہو گا۔ اس جنگ کے زمانہ میں سرویا نے بھی اعلان جنگ کر کے نیش پر قبضہ کر لیا۔ ترکی فوجوں نے نہایت بہادری کے ساتھ روسیوں کو شکست پر شکست دی۔ پہلے پہل جبکہ روسی کمانڈر جنرل گورکو کوہ بلقان طے کرتا ہوا درہ شپکہ پر حملہ آور ہوا اور اسے ترکوں سے لے لیا تو روس کے لئے اب اورنہ (ایڈریانوپل) اور وہاں سے قسطنطنیہ کا راستہ کھلا ہوا تھا اس نازک موقعہ پر سلطان نے فرانسیسی نو مسلم محمد علی کو جو کریٹ کا گورنر جنرل تھا تمام عثمانی افواج کا سپہ سالار اعظم مقرر کر کے روسیوں کے مقابلہ میں روانہ کیا۔ محمد علی کے پہنچتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ روسی کمانڈر جنرل گورکو اپنے بلغاروی حلیفوں کی مدد کے باوجود "سٹارازگورا" میں شکست کھا کر کوہ بلقان کی طرف بھاگا۔ اسی اثنا میں عثمان پاشا "ودین" سے نکل کر "پلونا" میں گھس گئے تھے۔ جو دریائے ڈینوب کے جنوب میں بیس میل کے فاصلہ پر ہے جنرل شلڈر (روسی کمانڈر) نے حملہ کرنے میں عجلت کی مگر اس کی فوج کو نہایت بے ترتیبی کے ساتھ پسپا ہو کر "نائیکوپولیس" میں پناہ لینی پڑی اس کے بعد ایک دوسری روسی فوج جنرل کروڈنر کی قیادت میں آگے بڑھی لیکن اسے بھی اپنے آٹھ ہزار مقتول میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ پلونا کا چھوٹا سا شہر روسی فتوحات کے لئے سب سے بڑا سنگ راہ ثابت ہوا۔ مسٹر ایلین فلپس اس موقع پر لکھتا ہے۔

"اب جنگ کا سارا نقشہ یک بیک بدل گیا تھا۔ زار یکہ گرینڈ قسطنطنیہ پر فاتحانہ شوکت و

جلال کے ساتھ پیشقدمی کرنے کا وہ خواب جو باوجود گذشتہ تلخ تجربات کے روسی اب تک دیکھ رہے تھے نسیاً منسیا ہوگیا۔ فی الحال تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ نہیں بلکہ روسی سلطنت موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور تمام یورپ کی نظریں انتہائی بیم و رجا کے ساتھ اس محاربہ پر جمی ہوئی تھیں جو بلغاریہ کے ایک معمولی شہر کے گرد رونما تھا اور جس کے انجام سے سارے مشرق کی قسمت وابستہ تھی روسی مستقر جنگی میں اس خطرہ کا پورا احساس تھا۔ گرینڈ ڈیوک نلوکس نے محمد علی کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لئے فوج کا ایک حصّہ چھوڑا اور فوج کے اصلی حصّہ کو جس کی تعداد ستر ہزار تھی ہمراہ لیکر بسرعت تمام پلونا پہونچا۔ یہاں پہونچکر ۱۱ ستمبر کو اس نے ایک زبردست حملہ کیا جس کے متعلق اس کو اُمید واثق تھی کہ وہ پچھلی ناکامیوں کی کافی سے زیادہ تلافی کردے گا مگر اس کا انجام سنگین تر ہوا اس میں شک نہیں کہ داھنے بازو پر رومانیوں اور بائیں بازو پر سکوبلیف نے ترکی مقامات پر قبضہ کرلیا تھا لیکن مرکزی حملہ خوفناک خونریزی کے ساتھ جس میں سولہ ہزار مقتول و مجروح ہوئے پسپا کردیا۔ ان سب سے زیادہ تہلکہ انگیز وہ خبر تھی جو ایشیا سے موصول ہوئی جہاں مختار پاشا نے روسی حملہ آوروں کو جو میلیکاف کے زیر کمان تھے سرحد پار بھگاکر غازی کا لقب اختیار کرلیا تھا۔ پے درپے تین حملوں میں ہزیمت اٹھانے کے بعد روسیوں کو اندازہ ہوگیا کہ پلونا کو فتح کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس کا محاصرہ سختی سے کرلیا جائے۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی تقریباً پانچ ماہ تک حیرت انگیز استقلال اور جانبازی کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار روسیوں کا مقابلہ کرنے کے بعد جب سامان رسد بالکل ختم ہوگیا اور رسد نہ پہونچنے کی وجہ سے فاقوں پر فاقے کرنے پڑے تو عثمان پاشا اپنے تیس ہزار فاقہ کش سپاہیوں کو لیکر نکلنے اور حصار توڑنے پر مجبور ہوئے انتہائی بہادرانہ جنگ کی جس میں زخمی ہوکر بیہوش ہوکر گر پڑے اور افسر کو اس طرح مجبور اور زخمی دیکھ کر فوج نے بھی ہمت ہار دی۔ عثمان پاشا کو جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو زار روس کے سامنے پایا۔ فوراً ہتھیار کھول کر زار کے سامنے ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۷ء کو ڈال دیئے۔ اس کے بعد زار روس اڈریانوپل میں فتحیاب ہوکر داخل ہوگیا تو انگلستان اور آسٹریا بھی روس کے خلاف تیار ہوگئے۔ اس وجہ سے کہ روس فتحیاب ہونے کے بعد ان معاہدہ ہائے

سابقہ پر قائم نہ رہے گا۔ اسٹریا نے ایک فوج کوہ کارپیتھین میں تعینات کردی۔ انگلستان نے بحری بیڑہ خلیج بسیکا میں جو کہ دردانیال کے دہانہ پر ہے روانہ کیا اور پھر دردانیال میں داخل ہونے کا حکم دے دیا اور اپنی پارلیمنٹ سے روس کے خلاف جنگ کے لئے ساٹھ لاکھ پونڈ کی منظوری لے لی۔ واضح ہو کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ابتدائی جنگ میں دو فریق تھے۔ ایک دولت عثمانیہ کا حامی تھا جس میں برٹش وزیر اعظم بیکنس فیلڈ کی پارٹی تھی جو کہتی تھی کہ ترکوں کی حمایت کی جائے ورنہ خطرہ ہے کہ روس قسطنطنیہ پر قابض ہو جائے جو کہ سراسر برطانیہ کے مصالح کے خلاف ہے اور دوسری پارٹی جس کی اکثریت تھی وہ اس کی مخالف تھی۔ مگر ایڈریانوپل میں زار کے داخل ہونے کے بعد دوسری جماعت نے بھی اپنی رائے بدل دی۔ اور روس کو تنبیہ کیا کہ اگر روس نے قسطنطنیہ کی طرف کوئی قدم اٹھایا تو یہ اقدام برطانیہ کے ساتھ جنگ کا اعلان سمجھا جائے گا۔ چنانچہ روس نے کوئی اقدام نہیں کیا اور دولت علیہ سے صلح کی گفت و شنید شروع ہوئی۔ ۱۳ جنوری ۱۸۷۸ء کو فریقین کے نمائندوں نے عارضی صلح کے ایک نوشتہ پر ادرنہ میں دستخط کر دیئے۔ اس عارضی صلح کے بعد گرانڈ ڈیوک نکولس (زار روس) نے اپنا فوجی مستقر بحر مارمورا کے ساحل سان اسٹیفانو میں قائم کیا۔ جہاں سے قسطنطنیہ کے منارے نظر آتے تھے اور برطانیہ نے اپنے جنگی جہاز جزائر الملوک سے کچھ فاصلہ پر جہاں سے قسطنطنیہ نظر آتا تھا کھڑے کئے اور حکم جاری کیا کہ یہ جہاز ہر وقت مستعد رہیں۔ اندیشہ تھا کہ روس اور برطانیہ میں عنقریب جنگ چھڑ جائے گی۔ عہد نامہ تیار کیا گیا جو کہ معاہدہ سان اسٹیفانو کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ میں دولت عثمانیہ کے خلاف تو بہت سخت شرطیں تھیں ہی مگر خود روس کے حلفاء رومانیہ، سرویا، اسٹریا، ہنگری، یونان، بلغاریہ وغیرہ کے بھی بہت سی مخالف شرائط تھیں۔ جن کو روس کی رقیب حکومتیں انگلستان فرانس، جرمنی، اسٹریا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں۔ اس وجہ سے یورپ میں چاروں طرف ایسا شور برپا ہوا کہ خود روس بھی سخت مرعوب ہو گیا۔ اس میں وہ تمام باتیں تسلیم کرلی گئیں تھیں جو کہ ۲۳ دسمبر کو ۱۸۷۶ء میں دول عظمیٰ کے نمائندوں نے قسطنطنیہ کانفرنس میں پیش کی تھیں۔ اور بہت سی زائد باتیں تھیں جن کی وجہ سے دولت عثمانیہ نہ صرف نہایت کمزور ہوتی تھی بلکہ اس کے بہت سے حصے

قبضہ سے نکل جاتے تھے۔ (دیکھو دولت عثمانیہ صفحہ ۱۶۷ تا ۱۷۰)

چنانچہ تجویز ہوا کہ برلین میں تمام دول کے نمائندے جمع ہوں اور ان شروط پر از سر نو گفتگو کی جائے روس اس پر اس شرط سے راضی ہوا تھا کہ اس کانگریس میں صرف وہی دفعات رکھی جائیں جن کو روس پیش کرنا مناسب سمجھے مگر برطانیہ کو اصرار تھا کہ تمام دفعات زیر بحث لائی جائیں۔ اس پر جانبین میں اس قدر کشیدگی ہوگئی کہ پختہ گمان ہوگیا کہ برطانیہ اور روس میں عنقریب جنگ چھڑ جائے گی۔ چنانچہ لارڈ بیکنسفیلڈ (وزیر اعظم برطانیہ) نے جنگ کی تیاریاں شروع کردیں اور ہندوستانی فوجیں مالٹا کو روانہ کردی گئیں۔ دوسری طرف وزیر خارجہ برطانیہ نے ایک گشتی مراسلہ دول عظمیٰ کے پاس بھیجکر ان اعتراضات کو واضح کردیا جو حکومت برطانیہ کو معاہدہ سان اسٹیفانو پر تھے۔ زار نے دیکھا کہ اسٹریا بھی جنگ کے لئے آمادہ ہے۔ رومانیہ میں روس کی بے وفائی کے خلاف سخت برہمی پھیلی ہوئی ہے۔ علاوہ بریں خود اُس کی سلطنت میں بھی بے اطمینانی کے آثار نمایاں تھے۔ ان حالات سے مجبور ہوکر اس کو برطانیہ کی خواہش کے مطابق کانگریس کا انعقاد کرنا منظور کرنا پڑا۔ مگر دونوں حکومتوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس میں وزارت برطانیہ نے وعدہ کیا کہ وہ کانگریس میں صلحنامہ اسٹیفانو کی تمام اہم دفعات سے متعلق روس کی حمایت کریگی۔ اس شرط کے ساتھ کہ جدید بلغاریہ کی قطع و برید میں روس برطانیہ کا ساتھ دیگا۔ یہ معاہدہ بالکل خفیہ تھا لیکن وزارت خارجہ کے ایک ملازم کی غلطی کی وجہ سے پریس کو اس کی اطلاع ہوگئی۔ اسی طرح برطانیہ کا ایک خفیہ معاہدہ باب عالی سے ہوا جس کی بنا پر باب عالی کو جزیرہ سائپرس (قبرص) برطانیہ کو دینا پڑا۔ جس کو ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں۔

الحاصل ۱۳ جون ۱۸۷۸ء کو دول عظمیٰ کے نمائندوں کی ایک عظیم الشان کانگریس پرنس بسمارک کے زیر صدارت برلن میں منعقد ہوئی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس کو ان تمام مسائل پر از سر تو بحث و تصفیہ کا حق حاصل ہے جو معاہدہ سان اسٹیفانو میں مذکور تھے لیکن بہت جلد یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ روس اور برطانیہ کے خفیہ معاہدہ کی وجہ سے کانگریس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ کانگریس کی صدارت کی کرسی پر اگرچہ بسمارک متمکن تھا لیکن کانگریس میں لارڈ بیکنسفیلڈ (وزیر اعظم برطانیہ) ہی کی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔

ایک ماہ کے بحث و مباحثہ کے بعد جس میں اکثر یہ اندیشہ ہونے لگتا تھا کہ ساری گفت و شنید درہم برہم ہو جائے گی۔ ۱۲ر جولائی کو ایک معاہدہ مرتب ہو گیا اور ارکان کانگریس نے اُس پر دستخط کر دیئے۔ عہد نامہ برلن کی رو سے معاہدہ اسٹیفانو کے وہ شرائط جو نہایت سخت اور دور رس تھے بہت کچھ معتدل کر دیئے گئے اور تقریباً معاہدہ سان اسٹیفانو تمام تر باطل کر دیا گیا۔

(تفصیل دولت عثمانیہ صفحات ۱۷۰-۱۷۱-۱۷۲ جلد ۲ میں دیکھئے)

برلن کانگریس میں سلطنت عثمانیہ کی حمایت کا مظاہرہ سب سے زیادہ جس طاقت نے کیا تھا وہ برطانیہ تھی لیکن معاہدہ سائپرس کے افشار کے بعد تونس کے متعلق جو معاہدہ برطانیہ اور فرانس کے نمائندوں میں ہوا اور جس کی بنا پر تونس کو جو اس وقت تک دولت علیہ کی فرماں روائی میں داخل تھا فرانسیسی عسکریت کا شکار بنا کر آگ اور خون کی راہ سے حکومت فرانس کے قبضہ و اقتدار میں لایا گیا وہ برطانیہ کی دوستی کی حقیقت واضح کرنے کے لئے بالکل کافی ہے۔ کانگریس میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا مسئلہ برطانیہ کے لئے نہایت تشویشناک تھا۔ روس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اور جنگ کے آخری ایام میں خود قسطنطنیہ اس کی زد میں آ گیا تھا ایسی صورت میں برطانیہ کی مداخلت اور کانگریس کے اجلاس میں سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کے تحفظ پر زور دینا کچھ اس سبب سے نہ تھا کہ وہ دولت علیہ سے حقیقی ہمدردی رکھتا ہے بلکہ محض اس خوف سے تھا کہ اگر روس کو آگے بڑھنے سے نہ روکا گیا تو مشرق ادنیٰ میں اُس کا تسلط قائم ہو جائے گا جو برطانوی مصالح کے لئے حد درجہ خطرناک ثابت ہو گا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ برطانیہ کے اس طرز عمل کا مقصود یہ بھی تھا کہ سلطنت عثمانیہ کی کمزوری سے جو فائدہ دوسری حکومتیں اُٹھانا چاہتی ہیں اُسے خود اپنے لئے محفوظ کر لے۔ چنانچہ عین اس وقت جبکہ برلین کانگریس میں برطانیہ کا وزیر اعظم لارڈ بیکنسفیلڈ عثمانی مقبوضات کے تحفظ پر نہایت پرجوش تقریریں کر رہا تھا اور اپنی ترک دوستی سے یورپین قوموں کا نشانہ ملامت بنا ہوا تھا معاہدہ سائپرس پر کامل آزادی کے ساتھ باب عالی کے نمائندوں کے دستخط لئے جا رہے تھے اور پھر جب کانگریس کے اختتام سے قبل ہی یہ راز منظر عام پر آ گیا اور دوسری حکومتوں کو برطانیہ کی بد دیانتی پر طیش آیا تو سلطنت عثمانیہ ہی کے ایک دوسرے صوبہ (تونس)

کو فرانس کے حوالہ کر کے جس کی برہمی سے ساری کانگریس اور اس کے ساتھ مشرق ادنی کے تمام برطانوی مصالح کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ تھا اس دوستی کا حق ادا کیا گیا۔ ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔ (ص ۲۱۱-۲۱۳)

۱۷۔ عہد نامہ برلن نے یورپ میں سلطنت عثمانیہ کا تقریباً خاتمہ کر دیا۔ عثمانی صوبوں کی بجائے یونان، رومانیا، سردیا، مانٹی نگرو، بلغاریہ کی خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں جن کا تعلق باب عالی سے محض سالانہ خراج کی حد تک رہ گیا۔ جو صوبے براہ راست باب عالی کے زیر حکومت رہ گئے اُن میں بھی آزادی کی تحریک پیدا ہو گئی۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ ۱۸۷۸ء کے بعد سلطان عبد الحمید خاں ثانی کے آخر عہد حکومت تک کسی بیرونی سلطنت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی دولت علیہ کو مسلسل مختلف صوبوں کے اندرونی ہنگاموں اور بغاوتوں کے فرو کرنے میں مصروف رہنا پڑا۔ علاوہ ازیں مذکورہ بالا خود مختار مملکتوں کی طرف سے بھی کوئی نہ کوئی نزاع برابر جاری رہا۔ اور دول عظمیٰ کے کسی نہ کسی رکن نے انہیں مدد پہونچا کر دولت عثمانیہ کی شکست و ریخت میں حتی الامکان کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔

معاہدہ برلن کی رو سے البانیہ کے دو شہر گوسنجہ اور پلاوا مانٹی نگرو کو دیدیئے گئے تھے۔ باب عالی نے حسب معاہدہ مانٹی نگرو کی آزادی تسلیم کر لی اور حسب شرط وہ تمام مقامات جو کہ مانٹی نگرو کو دیئے گئے تھے اُن کا تخلیہ کر دیا مگر اہل البانیا نے گوسنجہ اور پلاوا کو مانٹی نگرو میں شامل کرنے سے انکار کیا اور اس کے لئے البانی لیگ بنائی دونوں قوموں میں جنگ شروع ہوئی۔ بالآخر دول یورپ نے فیصلہ کیا کہ گوسنجہ اور پلاوا سلطنت عثمانیہ کو واپس کئے جائیں اور اُن کے معاوضہ میں ڈلسینو کا علاقہ اور بندرگاہ مانٹی نگرو کو دیدیا جائے۔ باب عالی نے اس فیصلہ کو منظور نہیں کیا تو برطانیہ کی تحریک پر جس کی عنان وزارت گلیڈسٹون کے ہاتھ میں آ چکی تھی دول یورپ کا ایک جنگی بیڑا ۱ ستمبر ۱۸۸۰ء کو ڈلسینو کے سامنے نمودار ہوا اور باب عالی کو مجبور کر کے فیصلہ منوایا گیا۔

۱۸۔ عہد نامہ برلن میں یونان کے رقبہ کی توسیع کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا۔ صرف سفارش کی گئی تھی کہ باب عالی اپائرس اور تھسلی کو یونان سے ملحق کر دے۔ تین سال تک دول عظمیٰ ریاستہائے بلقان کی

حدبندیوں میں مصروف رہی۔ آخر میں یونان نے بھی مطالبہ کیا کہ اپایرس اور تھسلی بین الاقوامی تصدیق کے ساتھ یونان کو مل جائے۔ چنانچہ برلن میں دول عظمیٰ کی ایک کانفرنس نے اس مطالبہ کی سماعت کرکے باب عالی سے سفارش کی کہ یہ پورا علاقہ یونان میں شامل کر دیا جائے۔ سلطان نے اس کو نامنظور کر دیا۔ چونکہ دول عظمیٰ یونان کی خاطر دولت علیہ سے جنگ چھیڑنے پر آمادہ نہ تھیں اس لئے یہ مسئلہ بدستور قائم رہا پھر بھی گفت وشنید جاری رہی۔ دو سال کی جدوجہد کے بعد ۱۸۸۱ء میں طے پایا کہ تھسلی کا تقریباً پورا حصہ اور اپایرس کا ایک ثلث یونان میں شامل کر دیا جائے۔ یانینا اور وہ دوسرے علاقے جن میں مسلمانوں کی آبادی تھی یونانی سرحد سے باہر رکھے گئے۔

۱۹؎ کریٹ یورپ میں سلطنت عثمانیہ کا آخری مفتوحہ تھا۔ ۱۶۶۹ء میں دولت عثمانیہ کے قبضہ میں جمہوریہ وینس سے نکل کر آیا۔ اس کے یونانی النسل باشندے نہایت شورش پسند تھے۔ یہاں کے باشندوں نے ۱۹۱۲ء تک (جب تک کہ اس کا الحاق یونان سے ہوا) چودہ بار بغاوتیں کیں۔ واقعات کی تفصیلات کتب تاریخ میں مندرج ہیں۔ یونان ہمیشہ اس کے الحاق کا ساعی رہا۔ اور جس زمانہ میں وہ آزاد نہ تھا اپنی بغاوتوں میں اس کو ابھارتا اور ہمزبان بناتا رہا۔ دول عظمیٰ اور یورپین قومیں ہمیشہ ریشہ دوانیاں کرتی رہیں۔ کیونکہ یہاں کی آبادی میں اکثریت یونانیوں اور عیسائیوں ہی کی تھی اور اس وجہ سے کہ حکومت مسلمان اور ایشیائی تھی جو کہ یورپ کی آنکھوں میں خار کی طرح ہمیشہ کھٹکتی رہتی ہے۔ اہل یورپ کو کبھی چین نہ پڑا۔ بہرحال تاریخ کے صفحات دل آزار انسانیت سوز واقعات سے بھرے ہوئے ہیں۔ حکومت عثمانیہ نے جس قدر بھی مرحمت کی اسی قدر ان کی طغیانی بڑھتی گئی اور دول عظمیٰ کو مداخلت کے حیلے ملتے گئے۔ بالآخر ۱۸۹۷ء میں دول عظمیٰ نے کریٹ کی بندرگاہوں پر قبضہ کرکے پورے جزیرہ کی ناکہ بندی کر دی اور ایک اعلان اس مضمون کا شائع کیا کہ آئندہ یہ جزیرہ دول یورپ کے سایۂ عاطفت میں رہے گا جو اس کی حکومت خود اختیاری کی ضامن ہونگی۔

۲۰؎ دول یورپ کی پروردہ نیشنل سوسائٹی نے یونانیوں کو توسیع مملکت کی جو شراب پلائی تھی اس کے نشہ سے وہ بدمست ہو رہے تھے۔ اسی نشہ میں انھوں نے اپنی سرحد عبور کرکے مقدونیہ کے بعض علاقوں پر حملہ

کردیا۔ کریٹ کا دول یورپ کا وہ معاملہ جو ابھی ۱۹ء میں گذر چکا ہے ان کے نشہ کے سکون کو کافی نہوا۔ باب عالی کے لئے مدافعت ناگزیر تھی۔ چنانچہ ۱۷؍اپریل ۱۸۹۷ء کو باب عالی کی طرف سے بھی اعلان جنگ ہوا۔ ترکوں کے پہلے ہی حملہ میں یونانیوں کا نشہ ہرن ہوگیا اور بدحواس ہوکر ہر مورچہ اور میدان جنگ سے بھاگتے رہے ایک ہی مہینہ میں اس جنگ کا جس کے لئے یونانی مدت سے بہت زیادہ بے قرار تھے خاتمہ ہوگیا۔ ترک ان کا پیچھا کرتے ہوئے تھسلی میں داخل ہوگئے اور قریب تھا کہ ایتھنز (پایہ تخت یونان) تک پہونچ جائیں مگر عین اس وقت جبکہ ادہم پاشا کمانڈر انچیف افواج عثمانیہ پیش قدمی کرتا ہوا بڑھ رہا تھا اور یونانی انتہائی ذلت کے ساتھ ہر جگہ شکست کھاتے ہوئے بدحواس بھاگ رہے تھے دول عظمیٰ کی مزاحمت نے حسب دستور قدیم ترکوں کی راہ روک لی۔ چنانچہ ۲۰ مئی کو انہیں مجبوراً ایک عارضی صلح کے لئے راضی ہونا پڑا۔ مسٹر ایکویتھ وزیر اعظم برطانیہ نے دول عظمیٰ کی نمائندگی کرتے ہوئے اعلان کیا کہ خواہ فتح کسی کی ہو نقشہ جغرافیہ یورپ کا بدلا نہ جائے گا۔ چنانچہ صلح میں ترکوں کو تھسلی کے مفتوحہ علاقہ کو خالی کرنا پڑا اور صرف تاوان جنگ چالیس لاکھ پونڈ اور تھسلی کا وہ تھوڑا سا حصہ جو سلطنت عثمانیہ کی سرحد پر واقع ہے لیکر اکتفا کرنا پڑا۔

۲۱ء ان بے انصافیوں کی وجہ سے یا ذاتی مصالح کی بنا پر جرمنی، اسٹریا، ہنگری، دول عظمیٰ کی جمعیۃ سے علیحدہ ہوگئے تھے۔ تاہم انگلستان، روس، فرانس نے متفقہ طور پر ۱۸۹۸ء میں باب عالی پر دباؤ ڈالا کہ وہ کریٹ سے عثمانی فوجوں اور ترکی عہدہ داروں کو بلالے اور محض خراج قبول کرنے پر اکتفا کرے۔ پھر اس کے کچھ عرصہ بعد چند ہی سالوں میں کریٹ کا باضابطہ الحاق یونان سے دول عظمیٰ کی سرپرستی میں ۱۹۰۸ء میں کردیا گیا اور سلطنت عثمانیہ کا یہ صوبہ بھی دول عظمیٰ نے آزاد کرا کے اس کو اپنا رہین منت بنالیا جس طرح انھوں نے یونان وغیرہ کو اپنا رہین منت بنایا تھا۔

۲۲ء سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں دخل دینے کے لئے دول عظمیٰ کو کسی خاص حیلہ کے تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ عیسائی رعایا کے حقوق کا تحفظ ہر مداخلت کے لئے کافی عذر ہو سکتا تھا۔ تمام یورپین حکومتوں نے اپنی اپنی جگہ پر یہ فرض کر رکھا تھا کہ سلطنت عثمانیہ میں عیسائیوں کے ساتھ بے انتہا مظالم ہو رہے ہیں اور اس کے لئے ہمیشہ ایسا پروپیگنڈہ کیا جاتا تھا جس میں دروغ گوئی ہنر شمار کیجاتی تھی۔ (محبت اور عداوت میں جھوٹ ان کے یہاں نہ صرف جائز بلکہ واجب بھی ہے) اور اسی کے ساتھ ساتھ

یہ بھی اُن کا نظریہ تھا کہ ان مظالم کے تدارک کی اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کہ عیسائیوں کو دولت علیہ کی فرمانروائی سے آزاد کرا کر اُن کی خود مختار حکومتیں قائم کرادی جائیں' یونان' سرویا' بلغاریہ' رومانیا کریٹ وغیرہ یہ تمام صوبے اسی مقصد کے ماتحت دول عظمیٰ کی سرپرستی میں سلطنت عثمانیہ سے علیحدہ کر دیئے گئے تھے۔ اب صرف وہ علاقے ایسے اور رہ گئے تھے جن میں عیسائی آبادی کی اکثریت تھی۔ آرمینیہ اور مقدونیہ اُن کی آزادی کے بغیر کیے دول یورپ کو آرام اور چین آسکتا تھا۔ اس باب میں برطانیہ اور بالخصوص مسٹر گلیڈسٹون بہت ہی پیش پیش رہے اور ایسے ایسے بے اصل رنجدہ اور دلخراش واقعات گھڑتے رہے جو کہ نہایت مبالغہ آمیز تھے یا جن کی کوئی واقعیت نہ تھی۔ خود عیسائیوں نے ان کی تردید کی ہے مگر یورپ اور بالخصوص برطانیہ نہایت بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ ان کا نشو ونما اور اعلان کرتا رہا۔ تاریخ کی کتابیں ان سے بھری ہوئی ہیں۔ یورپ اور بالخصوص برطانیہ نے ارمینیوں کی مظلومیت اور دولت عثمانیہ کی ظالمیت کو جس انتہائی مبالغہ کے ساتھ سراہا ہے وہ بے مثال ہے۔ مولف دولت عثمانیہ نے بھی بمثل دیگر مورخین کچھ مختصراً ذکر کیا ہے (دیکھو صفحہ ۱۰۲ جلد ثانی تا صفحہ ۲۰۶ وغیرہ)

۲۳؎ ابتدا ابتدا میں تو یہ یورپین حکومتیں انہیں صوبوں کے متعلق شور وغوغا مچاتی رہتی تھیں جن کی آبادی میں عیسائی اکثریت تھی انہیں کے حقوق کا تحفظ مداخلت کا حیلہ بنایا جاتا تھا اور ان کو دولتِ عثمانیہ سے کاٹ کر آزاد کرانا فرض منصبی قرار دیا جاتا تھا۔ تمام یورپین پریس اور ارباب اقتدار اسی کام میں لگے رہتے تھے۔ انصاف وصداقت حق گوئی اور عدالت کو سبھوں نے بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اگر کوئی منصف مزاج کوئی حق بات کہہ بھی دیتا تو اس کو اس طرح دبا دیا جاتا تھا کہ کانوں کان کسی کو خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ ترکی پریس بہت کم تھا اُس کی آواز ان کووں کی کائیں کائیں میں کسی کو سُنائی بھی نہ دیتی تھی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ دولت عثمانیہ کو سخت بدنام کر کے دنیا سے نیست ونابود کر دیا جائے۔ ورنہ کم از کم یہ تو ضرور ہو جائے کہ اس بہادر اور ایشیائی قوم کو یورپ سے جلد از جلد نکال دیا جائے۔ اندرون حکومت بھی اس قدر کمزوریاں' ریشہ دوانیوں اور مختلف غداریوں سے پیدا کر دی گئی تھیں کہ باوجود ذمہ داران دولت علیہ کی انتہائی کوششوں اور بیداریوں کے روز بروز انحطاط ہی ہوتا جاتا تھا۔ ایک سوراخ بند کرتے تھے تو دوسرے

چار پیدا ہو جاتے تھے۔ اس انحطاط کو دیکھ کر اخیر میں دشمنوں کے حوصلے بڑھ گئے اور یہ اندازہ ہو گیا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے یا خالص مسلم آبادی ہے اُن سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اس کے لئے صرف موقعہ کے منتظر تھے۔

ایک طرف تو وہ باب عالی پر زور ڈالکر ہر ممکن طریقہ سے عیسائی رعایا کو آزاد کرا رہے تھے دوسری طرف سلطنت کے اسلامی صوبوں پر قبضہ کے لئے ہر قسم کے بہانے تلاش کر رہے تھے۔ چنانچہ ۱۸۲۹ء میں معاہدہ ادرنہ (ایڈریانوپل) کی رو سے یونان کی آزادی تسلیم کرائی گئی اور برطانیہ، روس، فرانس کی متحدہ سرپرستی میں خود مختار حکومت یونان کی قائم کردی گئی۔ لیکن دوسرے ہی سال ۱۸۳۰ء میں الجیریا (الجزائر) پر فرانس نے قبضہ کر لیا۔ جب قبائل عرب نے اپنے ملک کے تحفظ کے لئے ہتھیار اُٹھائے تو حکومت فرانس کی تمام قوت مقابلہ میں آگئی اور چالیس برس تک فرانسیسی سپاہیوں نے الجزائر میں قتل و غارت گری کا بازار گرم رکھا جو آج تک بھی جاری ہے۔ کسی کے چھوٹے منہ سے ان انسانیت سوز مظالم کے سامنے نہ حق بات نکلتی ہے اور نہ کوئی جمعیتہ ان غریب مظلوموں کی آزادی کے لئے بنائی جاتی ہے اور نہ اُن کو آزاد کیا جاتا ہے۔ کیا یونان، کریٹ، بلگیریا، سرویہ وغیرہ کے باشندے انسان تھے اور یہ الجیریا وغیرہ کے باشندے انسان نہیں ہیں۔

۲۴۔ تونس دولت علیہ کا صوبہ تھا جس پر فرانس کی استعماری نظریں مدتوں سے للچا رہی تھیں۔ مگر کوئی حیلہ قبضہ کے لئے نظر نہ آتا تھا۔ ۱۸۷۸ء میں جبکہ برلن میں کانفرنس معاہدہ سان اسٹیفانو کی اصلاح و ترمیم کے لئے پرنس بسمارک کی زیر صدارت منعقد کی جا رہی تھی اور نہایت اہم مسائل زیر غور تھے اس وقت دولت علیہ کی تقسیم کا مسئلہ بھی زیر تجویز تھا۔ اس لئے مغربی حکومتوں کے نمائندے ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ہر ایک کو بدگمانی تھی کہ ممکن ہے کہ دوسرے نے باب عالی سے کوئی خفیہ معاہدہ پہلے سے کر رکھا ہو۔ اس بدگمانی کو دور کرنے کے لیے کانگریس کے افتتاح کے وقت یہ تجویز پیش کی گئی کہ ہر سفیر اس امر کا اعلان کرے کہ مسائل زیر بحث سے متعلق اس کی حکومت نے کوئی خفیہ معاہدہ پہلے سے نہیں کر رکھا ہے۔ بیکنسفیلڈ (وزیر اعظم برطانیہ) اور سالسبری حکومت برطانیہ کی نمائندگی کر رہے تھے اس تجویز سے نہایت

سراسیمہ ہوئے۔لیکن انہیں اس کی مخالفت کرنے کی جرأت نہوئی۔دوسری حکومتوں کے نمائندوں کی طرح مذکورہ بالا اعلان کرنا پڑا۔

(نوٹ) ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں کہ برطانیہ نے اس سے پہلے باب عالی سے بھی خفیہ معاہدہ کرلیا تھا اور روس سے بھی کرلیا تھا۔مگر روس کا خفیہ معاہدہ اخیر تک پردۂ راز میں رہا اور باب عالی کا خفیہ معاہدہ مذکورہ ذیل طریقہ سے ظاہر ہوگیا۔ ابھی کانگریس کا اجلاس ختم نہیں ہوا تھا کہ ۹ر جولائی کو لندن کے اخبار گلوب میں معاہدۂ سائپرس (قبرص) کا مسودہ شائع ہوگیا۔جس کا واقعہ یہ تھا کہ ماروین نامی ایک سیاح جو کہ مشرقی ممالک میں سیاحت کرچکا تھا اور مختلف مشرقی زبانوں سے واقف تھا برطانیہ کی وزارت خارجہ کی طرف سے معاہدۂ مذکورہ کا ترکی مسودہ ترجمہ کے لئے اس کو دیا گیا۔حالانکہ وہ دفتر وزارت میں کسی عہدہ پر مامور نہ تھا۔اس شخص نے ایک بڑی رقم کے عوض گلوب کے ہاتھ ترجمہ کی ایک نقل فروخت کرڈالی بہر حال معاہدۂ سائپرس کی اشاعت سے برلن میں برطانوی سفارت پر گویا بجلی سی گرگئی۔اور اگرچہ لندن میں فوراً مسودہ کی صحت سے انکار کیا گیا۔تاہم برلن میں حقیقت حال زیادہ دنوں پوشیدہ نہ رہ سکی۔ برطانوی نمائندوں کی بددیانتی سے کانگریس میں اس قدر برہمی پھیلی کہ اس کے درہم برہم ہوجانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا۔پرنس گورچاکوف (نمائندہ روس) اور ویڈنگٹن (نمائندہ فرانس) نے علانیہ اپنے غصہ کا اظہار کیا۔معاملہ نے نہایت نازک صورت اختیار کرلی تھی۔اس کی مزید بدنمائی صرف بسمارک کی کوششوں سے رفع کی جاسکی۔بسمارک نے "ایمان دار" دلال کی حیثیت سے فرانس اور برطانیہ کے درمیان مندرجہ ذیل مصالحت طے کرادی جس کے بعد ویڈنگٹن کا سارا غصہ جاتا رہا۔فرانسیسی اور برطانوی نمائندوں کے درمیان طے پایا کہ:-

(الف) انگلستان نے سائپرس کو جس طرح خفیہ طریقہ سے حاصل کرلیا ہے اس کی تلافی کے لئے فرانس کو اجازت دیجائے کہ وہ جس وقت کوئی مناسب موقعہ ہاتھ آئے تونس پر قبضہ کرلے۔انگلستان کی طرف سے کوئی مخالفت نہوگی۔

(ب) مصر میں جو مالیاتی انتظامات ہورہے ہیں اُن میں فرانس کو بھی انگلستان کے برابر دخل دیا جائے

(ج) شام کے رومن کیتھولک عیسائیوں کے تحفظ کا جو دعویٰ فرانس زمانہ قدیم سے کرتا آیا ہے برطانیہ اسے تسلیم کرلے۔

اس معاہدہ کے بعد فرانس کو انگلستان کی طرف سے اطمینان ہوگیا اور وہ صرف مناسب وقت کا منتظر رہا۔ لیکن جب حملہ کے لئے کوئی معقول حیلہ نظر نہ آیا تو تونس کے فرانسیسی نمائندے "تھیودور روستان" نے بے بنیاد سفارتی شکایات تصنیف کرکے والی تونس "محمد الصادق" کے سامنے ایسے بیہودہ مطالبات پیش کئے جن کو تسلیم کرلینا گویا اس علاقہ کو فرانس کے حوالہ کردینا تھا۔ اس کے بعد جو ہوا اسے "اسٹینلی لین پول" اپنی کتاب "بربری قزاق" میں یوں بیان کرتا ہے:-

"ان باتوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طاقتور حکومت نے جس پر مقابل کی مضبوط حکومتوں کی طرف سے کوئی روک نہ تھی۔ ایک نہایت کمزور لیکن ایماندار مملکت کے خلاف خفیہ طور پر اپنی جارحانہ کارروائیاں شروع کردیں اور بالآخر الجزائر کی سرحد سے متصل بعض قبائل کے ہنگاموں کو عذر قرار دیکر جو ایک مضحکہ خیز عذر تھا تونس پر حملہ کا فیصلہ کرلیا۔ بے فائدہ محمد الصادق نے روستان (سفیر فرانس) کو یقین دلایا کہ قبائل میں امن و امان قائم کردیا گیا ہے۔ بے فائدہ اس نے تمام حکومتوں اور خصوصاً انگلستان سے اپیل کی۔ لارڈ گرانویل (وزیر خارجہ انگلستان) نے حکومت فرانس کے بیان پر یقین کرلیا کہ الجزائر اور تونس کے درمیان سرحدی علاقہ میں جو فوجی نقل و حرکت ہونے والی ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ الجزائر کے علاقہ میں سرحدی قبائل کی جو یورشیں برابر ہوا کرتی ہیں ان کا خاتمہ کردیا جائے۔ بے (محمد الصادق) کی آزادی اور اس کے علاقہ کا استقلال کسی طرح خطرہ میں نہیں ہے" (بربری قزاق ص۳۰۰)

ان تصریحات کے باوجود اپریل ۱۸۸۱ء میں فرانسیسی فوجوں نے تونس پر حملہ کردیا۔ اور ۱۲ رمئی کو محمد الصادق نے بالکل مجبور ہوکر معاہدہ قصر السعید پر دستخط کردیئے۔ اس معاہدہ کی رو سے تونس پر فرانسیسی تسلط قائم ہوگیا اگرچہ حکومت نام کے لئے محمد الصادق کی رہی۔ محمد الصادق کے انتقال کے بعد سیدی علی بے حاکم مقرر ہوا لیکن اس کی حیثیت بھی فرانسیسی محکمہ کے ایک عہدہ دار سے زیادہ نہ تھی۔

قبائل نے معاہدہ قصر السعید کے بعد بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ تونس کے جنوبی صوبوں نے علانیہ

بغاوت کردی اور کچھ دنوں تک ان صوبوں میں ہر طرف بدامنی پھیلی رہی۔ اس کے استیصال میں فرانسیسی فوجوں نے اپنی سابق روایات کے مطابق پوری سرگرمی دکھائی۔ فاس پر بیدردی کے ساتھ گولہ باری کرکے لوٹ لیا گیا۔ مکانات معہ باشندوں کے جلا دیئے گئے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ الغرض جو کچھ اس سے قبل الجزائر میں ہو چکا تھا وہ سب تونس میں دہرایا جانے لگا۔ کچھ دنوں بعد بتدریج حالات رو باصلاح ہونے لگے۔ خصوصاً جب روستان وہاں سے واپس بلا لیا گیا تو امن و امان قائم کرنے میں نسبتاً زیادہ آسانی ہو گئی۔ فرانس نے تونس کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کے متعلق لین پول نے ایک فرانسیسی فاضل ہنری ڈی روشفورٹ کا مندرجہ ذیل قول نقل کر کے اصل حقیقت واضح کر دی ہے۔ روشفورٹ لکھتا ہے۔

"ہم نے تونس کی مہم کو ایک معمولی فریب سے تشبیہ دی تھی۔ یہ صحیح نہ تھا۔ تونس کا معاملہ مثل قزاقی کے ہے جس کی شدت قتل کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔"

(بربری قزاق صفحہ ۳۰۹ از دولت عثمانیہ صفحہ ۲۰۶ تا ۲۱۱)

۲۵۔ برطانیہ نے دولت علیہ سے دوستی کے جو حقوق وصول کئے وہ محض سائپرس اور تونس پر قبضہ کرنے سے ادا نہیں ہوئے بلکہ ضروری سمجھا گیا کہ اس سے اور بہت زائد وصول کیا جائے چنانچہ مصر پر نظر دوڑائی گئی جس کی کچھ تفصیل ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

۲۶۔ روس، برطانیہ، فرانس کے درمیان میں ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء تک متعدد عہد نامے ہوئے جن کی بنا پر ان تینوں میں ایک قوی اتحاد قائم ہوا جس کی بنیاد حقیقتہً یہ قرار پائی کہ جہاں تک ممکن ہو اسلامی حکومتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ان پر قبضہ کر لیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جو معاہدہ فرانس اور انگلستان کے درمیان ہوا اس میں فرانس کو اجازت دی گئی کہ وہ جس طرح چاہے مراکش پر قبضہ کر لے۔ اس کے معاوضہ میں فرانس ان تمام حقوق سے دست بردار ہو گیا جو بزعم خود اسے حکومت مصر کی نگرانی میں حاصل تھے اور مصر کی فرماں روائی تمام تر انگلستان کے سپرد کر دی۔

۲۷۔ اس کے بعد فرانس کی وساطت سے انگلستان اور روس کا وہ جھگڑا جو کہ ایران کی نسبت مدتوں سے

چلا آتا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں یوں ختم کیا گیا کہ ایران کی سلطنت معاہدہ کی رو سے دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی جن میں سے ایک پر (شمالی ایران پر) روس نے اور دوسرے (جنوبی ایران) پر انگلستان نے اپنا تسلط قائم کر لیا۔

۲۸۔ مقدونیہ کی تقسیم و بدامنی اور مرزنگ پروگرام

یورپین حکومتوں کی سرگرمیاں یہاں تک ہی محدود نہ تھیں۔ انھوں نے نہ صرف سلطنت عثمانیہ کے متعدد صوبوں پر قبضہ کر لیا بلکہ جو صوبے اس کی فرماں روائی میں باقی رہ گئے تھے اُن کے اندر بھی ہر امکانی ذریعہ سے بدامنی اور بغاوت پھیلانے کی کوشش کی۔ ستم یہ تھا کہ اپنی ہی پیدا کی ہوئی شورشوں کو غدر قرار دیکر یہ حکومتیں عیسائی رعایا کے حقوق کے تحفظ کی خاطر دولت علیہ کے اندرونی اور انتظامی معاملات میں مداخلت کرتیں اور جہاں تک بس میں ہوتا سلطنت کو نقصان پہونچانے کی کوشش کرتیں۔ بلقانی صوبوں کی بغاوت اور آزادی انہیں حکومتوں کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کی رہین منت تھی۔ اگر ایک طرف روس اور اسٹریا کی فوجیں سلطنت عثمانیہ کی سرحدوں پر حملہ آور ہوتی رہیں تو دوسری طرف اُن کے گماشتے عیسائی رعایا کو مسلسل بغاوت کے لئے آمادہ کرتے رہے۔ مسٹر نائٹ جو تیس سال تک ترکی میں رہ کر وہاں کے حالات کا بچشم خود مطالعہ کر چکے ہیں اپنی کتاب "بیداری ترک" میں لکھتے ہیں۔

"ایک مقولہ ہے کہ ہر قوم کو وہی حکومت ملتی ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ یہ مقولہ صحیح ہو سکتا ہے اگر کوئی قوم اپنی حسب خواہش نظام حکومت قائم کرنے کی آزادی رکھتی ہو۔ لیکن جہاں تک ترکی کا تعلق ہے اُس کے باشندوں کو کوئی موقع اُس حکومت کے حاصل کرنے کا نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے کیونکہ ترکی کے طاقتور دشمنوں کی غرض یہ بھی کہ استبدادی حکومت کی برائیاں قائم رکھی جائیں اور جب کبھی ترکوں نے اپنے اندرونی معاملات کو درست کرنے کی کوشش کی کوئی نہ کوئی مسیحی طاقت اس خوف سے کہ ممکن ہے ایک اصلاح شدہ ترکی ایک قوی ترکی ثابت ہو یا توسیع نوجوں کے ساتھ اس پر ٹوٹ پڑی یا مجوزہ اصلاحی تبدیلیوں کی راہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ علاوہ بریں جو طاقتیں ترکی مقبوضات کو اپنی مملکت میں شامل کرنے کے درپے تھیں وہ اس بات کی نگرانی کرتی رہتی تھیں کہ ترکی کی حدود میں امن نہ رہنے پائے اور وہ اس غرض سے شورشیں برپا کرتی رہتی تھیں وہ عیسائی کسانوں کو بغاوت کے لئے ابھارتیں اور

ہنگامے برپا کرائیں تاکہ مداخلت کرنے اور ان علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا حیلہ ہاتھ آئے۔ یہ طاقتیں اپنے مقصد کے حصول کے لئے کسی طریقہ کے اختیار کرنے میں تامل نہ کرتیں مثلاً بھیجے فساد پھیلانے والوں میں سے ایک درویش بھی تھا جو روس کا تنخواہ دار مخفی ایجنٹ تھا۔ چند سال ہوئے اُس نے روس کی ہدایت کے مطابق ایشیائے کوچک میں کافروں کے خلاف جہاد کی تبلیغ کی اور مسلمانوں کو عیسائی باشندوں پر حملہ کرنے کے لئے برانگیختہ کیا۔ اس قسم کے بہت سے واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے دشمنان ترکی کی دغابازی اور ترکی کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا ہے اس کی ناانصافی ظاہر ہوتی ہے۔"

(بیداریٔ ترکی از نائٹ صفحہ ۳۰۲ — دولت عثمانیہ صفحہ ۲۵۰)

ان شورانگیزیوں کے لئے سب سے زیادہ مناسب سرزمین مقدونیہ کی تھی۔ مقدونیہ سلطنت عثمانیہ کا وہ صوبہ تھا جس میں بلغاری، سردی، یونانی اور ترک سب ہی آباد تھے۔ چونکہ بلغاریا، سرویا اور یونان کی نوآزاد شدہ ریاستیں بالکل سرحد پر واقع تھیں اس لئے ان میں سے ہر ایک مقدونیہ کے اس حصّہ کو جہاں اُس کی ہم قوم آبادی زیادہ تھی اپنے اندر شامل کر لینا چاہتی تھی۔ دول عظمیٰ کی طرح ان ریاستوں کو بھی یقین تھا کہ سلطنت عثمانیہ عنقریب فنا ہو جائے گی اور چونکہ اس کے ترکہ کی تقسیم کے وقت مقدونیہ کی سب سے زیادہ حقدار یہی ریاستیں تھیں اس لئے ہر ایک اپنا حصّہ پہلے ہی سے محفوظ کر لینا چاہتی تھی۔ پروپیگنڈا اور ہنگامہ پروری کا نہایت کامیاب تجربہ اس سے قبل ہو چکا تھا جس کی بنا پر پورا اطمینان تھا کہ یورپ کی بڑی طاقتیں اپنے چھوٹے بچوں کی حوصلہ افزائی میں مطلق دریغ نہ کریں گی۔ چنانچہ بلغاریا، سرویا اور یونان نے اپنی ہم قوم آبادی کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لئے مقدونیہ میں پہلے خفیہ ایجنٹ بھیجنے شروع کئے۔ اور پھر یہ دیکھ کر کہ مخفی تدبیریں زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتیں مسلح جتھے روانہ کئے۔ ان جتھوں نے پورے صوبہ میں ایک قیامت برپا کر دی۔ قتل و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ گاؤں کے گاؤں جلانے لگے۔ ان غارت گروں نے عیسائیوں اور ترکوں کی تمیز بھی اُٹھا دی تھی۔ وہ اپنے علاوہ دوسرے فرقوں کے ساتھ یکساں مظالم کرتے تھے چنانچہ اپریل ۱۹۰۶ء میں ایک بلغاری جتھے نے ایک یونانی پادری کو زندہ جلا دیا۔ مسٹر نائٹ لکھتے ہیں:۔ "اس واقعہ پر کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اگر یہی چیز مسلمانوں نے کی ہوتی تو کیسا واویلا مچتا"

اصل وجہ یہ ہے کہ یہ ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ بھی شدید عداوت رکھتی تھیں۔ اُن کے جتھے جس قدر ترکوں کو نقصان پہونچاتے تھے اسی قدر آپس میں بھی قتل و خون کرتے رہتے تھے۔ یونانی جتھے مقدونیہ کی بلغاری اور سردی آبادی کو فنا کر ڈالنا چاہتے تھے۔ تاکہ مقدونیہ کا زیادہ سے زیادہ حصہ یونان میں شامل کیا جا سکے۔ یہی جذبہ بلغاری اور سردی جتھوں کا تھا۔ بلغاری جتھوں کی سرگرمیاں سب سے بڑھی ہوئی تھیں ان ہنگاموں سے بلغاریا کا اصلی مقصد یہ تھا کہ دول عظمیٰ کو مقدونیہ کی جانب متوجہ کرے اور ان کی مداخلت سے بیش از بیش فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ دول عظمیٰ کو اسی دعوت کا انتظار تھا۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور تمام یورپ کی طرف سے روس اور آسٹریا کو نمائندہ مقرر کر کے مقدونیہ کے لئے ایک نظام اصلاح مقرر کرنے کی خدمت سپرد کی۔ اس کام کے لئے اس سے بہتر انتخاب ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۳ء میں روس اور آسٹریا کی تیار کردہ اسکیم جو مرزنگ پروگرام کے نام سے مشہور ہے متفقہ طور پر منظور کی گئی اور مقدونیہ کی اصلاح کا کام شروع ہوا سلطان عبد الحمید کو بھی یورپ کی متحدہ قوت سے دب کر یہ مداخلت تسلیم کرنی پڑی۔ عثمانی فوجیں جس کشت و خون، آتش زنی اور غارتگری کے استیصال میں ناکام ثابت ہوئی تھیں، اُسے ختم کرنے کا بیڑہ انہی حکومتوں نے اُٹھایا جن کی شہ پاکر یہ قیامت برپا کی گئی تھی۔ مقدونیہ کا صوبہ تین ولایتوں اسکوب: سالونیکا: موناستر پر مشتمل تھا۔ ان ولائتوں کے لئے ایک ترکی انسپکٹر جنرل حسین علمی پاشا مقرر کیا گیا اور اس کی نگرانی کے لئے روس اور آسٹریا کے نمائندے مقرر ہوئے۔ امن وامان قائم رکھنے کی خدمت ایک بین الاقوامی پولیس کو تفویض ہوئی جس کا افسر اعلیٰ ایک یوروپین تھا۔ تینوں ولایتیں روس آسٹریا، انگلستان، فرانس اور اٹلی کے درمیان اس طرح تقسیم کردی گئیں کہ ہر حکومت اپنے حصے کے امن وامان کی ذمہ دار قرار پائی۔ لیکن مشترکہ امور کی نگرانی ایک مرکزی مجلس کے سپرد ہوئی۔ اس نظام کے جاری کرنے کے کچھ دنوں بعد دول عظمیٰ نے مقدونیہ کی مالیات کی نگرانی کے لئے ایک بین الاقوامی کمیشن بھی مقرر کر دیا یوں فوجی اور مالی دونوں شعبے دولت علیہ کے ہاتھ سے حقیقتہً نکل گئے، لیکن مقدونیہ کی حالت میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہ ہوا۔ امن وامان قائم کرنے میں بین الاقوامی پولیس بھی ویسی ہی ناکام ثابت ہوئی جیسی عثمانی فوج اس سے پہلے ہو چکی تھی۔ یونانی اور بلغاری جتھوں کی غارتگری برابر جاری رہی بشیویل لکھتا ہے

کہ نسلی جماعتوں کی باہمی عداوتیں خصوصاً یونانیوں اور بلغاریوں کی اور پھر اس سے کسی قدر کم سردیوں ولاچیوں اور البانیوں کی دشمنیاں اس درجہ قابو سے باہر ہوگئی تھیں کہ عقل وخرد کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا اور پوری آبادی اپنے کو ہلاک کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ جو ریاستیں مقدونیہ کی سرحد پر واقع تھیں وہ ان غارت گروں کی پوری طرح مدد کر رہی تھیں جنھوں نے سلطان کے بعد مقدونیہ پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا (شیویل ص ۴۳۶ - دولت عثمانیہ ص ۲۵۳)

مرزنگ پروگرام اور مالیاتی کمیشن کا تقرر ترکوں کی غیرت ملی کے لئے ایک سخت تازیانہ تھا۔ ان کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ بین الاقوامی مداخلت کی باگ روس اور اسٹریا کے ہاتھوں میں دیدی گئی تھی۔ جبکہ یہ دونوں سلطنتیں دولت عثمانیہ کی شدید ترین دشمن تھیں۔ چنانچہ ترکوں کا خیال تھا اور مسٹر نائٹ جیسے غیر جانبدار اشخاص کے اقوال سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ روس اور اسٹریا نے بالقصد اس پروگرام کو ناکام بنایا اور ان کے نمائندوں نے اس کا نفاذ ایسے طریقہ پر کیا کہ اس سے عیسائیوں میں ہنگامہ و فساد کی آگ بھڑکتی ہی گئی۔ اس سے غرض یہی تھی کہ یورپین ٹرکی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی تجویز آگے بڑھائی جائے۔ (نائٹ ص ۹۶ - دولت عثمانیہ ص ۲۵۳)

۱۹۰۵ء کے بعد انگلستان، روس، فرانس نے مرد بیمار (ٹرکی) کے مال کے حصے بخرے کرنے کا قطعی فیصلہ کرلیا تھا اور ۱۹۰۵ء کے آخر میں لارڈ لینس ڈاؤن کے زیر قیادت دول عظمیٰ کے متحدہ جنگی بیڑوں کا مظاہرہ ایک ایسا کھلا ہوا اشارہ تھا جسے ہر ترک سمجھ سکتا تھا۔ مسٹر بکسٹن جو بلقان کمیٹی میں انگلستان کے نمائندہ تھے اعتراف کرتے ہیں کہ ترکی حکومت کے دشمن خواہ ذاتی اغراض کی بنا پر یا نوع انسانی کی ہمدردی کے خیال سے پیہم حملہ آور ہو رہے تھے۔ یہ گفتگو بھی تھی کہ مقدونیہ کو تقسیم کر دیا جائے۔

(ترکی حالت انقلاب میں از چالس بکسٹن ص ۴۴

دولت عثمانیہ ص ۲۵۳

جون ۱۹۰۸ء میں شاہ ایڈورڈ اور زار نکولس نے ریوال میں ملاقات کی اور مقدونیہ میں امن قائم کرنے کا ایک جدید پروگرام مرتب کیا۔ ترک مرزنگ پروگرام کا نتیجہ دیکھ رہے تھے اُن میں اب کسی نئے تجربہ

کے برداشت کی طاقت نہ تھی اس میں شبہ نہیں کہ انگلستان اور روس کی یہ متحدہ سرگرمی سلطنت عثمانیہ کے یورپین صوبوں کے لئے مہلک ثابت ہوتی اگر نوجوان ترکوں نے عجلت سے کام لیکر علم انقلاب بلند نہ کر دیا ہوتا۔ جس سے نہ صرف سلطان عبدالحمید کی استبدادی حکومت کا خاتمہ ہو گیا بلکہ دول عظمیٰ کے سارے منصوبے بھی دفعۃً خاک میں مل گئے۔ (دولت عثمانیہ صفحہ ۲۵۴)

۲۹- اصلاحات اور ترکوں کے انقلاب پر دول یورپ کا چراغ پا ہونا۔

شخصی حکومت اور استبدادیت سے عام رعایائے سلطنت عثمانیہ تنگ تھی جس سے بیرونی طاقتوں کو آئے دن مداخلتوں اور ملک کو تقسیم کر لینے کا موقعہ ہاتھ آتا رہتا تھا اور اندرونی نظام بگڑتا جاتا تھا جاسوسی کا اس قدر زور و شور تھا اثر تھا کہ کسی ترک کو اپنی جان کے متعلق اطمینان نہ تھا اور نہ کوئی جماعت جس کا ادنیٰ تعلق بھی ملکی اور انتظامی معاملات سے ہو سکتا تھا ملک میں رہ سکتی تھی۔ رشوت ستانی اور مظالم کا چاروں طرف چرچا تھا۔ بیرونی ملکوں اور دول عظمیٰ کی سازشوں کے جال ہر طرف بچھے ہوئے تھے۔ ملک کی ہر قسم کی ترقی اور اس کی اسکیمیں دول اجنبیہ کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی تھیں اُن کے ایجنٹ کسی مفید ملک و وطن اسکیم کو پنپنے بلکہ پیدا ہونے نہ دیتے تھے اس لئے نوجوان ترک مدتوں سے جمہوری حکومت قائم کرنا اور ملک کو ترقی دینا نہایت ضروری سمجھتے تھے۔ سابقہ بادشاہتوں اور ممالک اجنبیہ میں جو سابقہ معاہدات اور امتیازات چلے آتے تھے وہ اُن کو ملک کو آگے بڑھانے میں ہر ہر قدم پر آڑے آتے تھے اس لئے ضروری تھا کہ نظام حکومت بدلا جائے اور تمام امتیازات سابقہ کو یک قلم اٹھا کر دستوری حکومت کا اعلان کر دیا جائے۔ سلطان عبدالعزیز خاں مرحوم کے زمانہ سے اس پر متعدد مرتبہ کارروائیاں عمل میں آچکی تھیں۔ خود سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے بھی کچھ دنوں اس کو نافذ رکھ کر پھر منسوخ کر دیا تھا مگر اس مرتبہ اس جوش و خروش اور اتنی قوت اور انتظام سے اس کا اجرا کیا گیا کہ استبدادی طاقت کو بجز سر جھکانے کے کوئی چارہ نہ رہا۔ ۵ رجولائی ۱۹۰۸ء میں رسنا کی پہاڑیوں سے اس کا اعلان ہوا اور نہایت حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اس کے شعلے تمام ملک میں پھیلنے شروع ہوئے۔ سلطان نے ہر چند انتہائی کوششیں ان شعلوں کے بجھانے میں جاری کیں مگر ایک بھی کارآمد نہ ہوئی۔ فوجیں انقلاب کے حق میں ہوتی

گئیں ۔ بڑے بڑے استبدادی افسر موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے ۔ بالآخر جب ہر طرف سے مایوسی ہوگئی تو ۲۴ جولائی کو علی الصباح انجمن اتحاد و ترقی کو بذریعہ تار اطلاع دیگئی کہ سلطان نے دستوری حکومت کا قیام منظور کر لیا ۔ اور ایک ہفتہ بعد یکم اگست کو دستوری حکومت کی دفعات ازجانب سلطان شائع کر دی گئیں ۔ اور ۱۰ ار دسمبر ۱۹۰۸ء کو سلطان عبدالحمید مرحوم نے پارلیمنٹ کا افتتاح کر دیا ۔ اس انقلاب میں ترک نوجوانوں نے جس حُسن قابلیت کا مظاہرہ کیا اس سے تمام اجنبی ممالک انگشت بدنداں ہوگئے ۔

نائٹ لکھتا ہے :۔

" انجمن (اتحاد و ترقی) کے ان ناتجربہ کار نوجوانوں نے ایک جدید نظام کو بروئے کار لانے اور اپنے ملک کی ان کثیر التعداد خطرات سے حفاظت کرنے میں جن سے نئی حاصل کی ہوئی آزادی بربادی کی زد میں تھی ، ایسی دانشمندی ، موقع شناسی ، میانہ روی ، فراست اور پیش بینی دکھلائی کہ غیر ملکی اشخاص اس کا مشاہدہ کر کے حیرت زدہ رہ گئے انھوں نے امن وامان کو نہایت مضبوطی سے قائم رکھا ۔ اور اس چیز میں خود قوم کے شاندار ضبط نفس اور حب وطن سے اُنھیں بڑی مدد ملی ۔ اگرچہ وہ خود اور ان کے علاوہ ہزاروں آدمی استبداد اور اُس کے کاسہ لیسوں کے مظالم اور غارتگری کا شکار رہ چکے تھے پھر بھی اُن کی طرف سے انتقام کا کوئی جذبہ ظاہر نہیں ہوا ۔ انھوں نے صرف اُن لوگوں کو سزائیں دیں جن کے جرائم نہایت سخت تھے ان ہی لوگوں کو برطرف کیا جنھوں نے اپنے افعال سے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ دستور اساسی کے لئے خطرہ کا باعث ہیں ۔ باقی سب کو معاف کر دیا ۔ بیرونی طاقتوں سے ترکی کے تعلقات موقع شناسی اور مدبرانہ سیاست دانی کے ساتھ قائم کئے گئے ۔ غلطیاں غیر معمولی طور پر کم ہوئیں ۔ (بیداری ترکی صفحہ ۲۴۴-۲۴۳)

پارلیمنٹ کے افتتاح پر ممبروں نے مجلس کی کارروائیوں اور اپنی تقریروں میں جس قابلیت کا ثبوت دیا وہ انگلستان کے مدبروں کے لئے خلاف توقع ثابت ہوئی ۔ سلطنت عثمانیہ کے باشندے ان کے خیال میں آئینی حکومت کے اہل نہ تھے ترکی پارلیمنٹ نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا ۔ نئی وزارت نے حکومت کے

مختلف شعبوں میں اصلاحات کا کام شروع کردیا۔ اور اب ہر طرف ایک نئی روح محسوس کی جانے لگی۔ ان اصلاحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں حکومت کا اعتماد رعایا کے دلوں میں قائم ہوگیا۔ انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان میں بہت کم لوگ ایسے تھے جن کو نظم و نسق، فن سفارت، ڈپلومیسی یا مالیات کا تجربہ تھا اور وہ اپنی اس کمی سے واقف بھی تھے۔ اس پر نظر رکھتے ہوئے انھوں نے حکومت کے سابق اعلیٰ عہدہ داروں کو اپنی جگہ پر برقرار رکھا اور ان کی لیاقت اور تجربہ سے فائدہ اٹھایا۔ البتہ اُن عہدہ داروں کو جو رشوت خواری میں مشہور تھے برطرف کردیا۔ جو لوگ برقرار رکھے گئے اُن کی بھی سخت نگرانی کی جاتی تھی اور اگر وہ دستور اساسی کے خلاف کچھ کرتے تو فوراً علیحدہ کردیئے جاتے تھے۔ چونکہ یہ عہدہ دار حقیقتاً سلطنت کے خیر خواہ تھے اس لئے انجمن کو اُن سے کام لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

دستور اساسی کے اعلان اور پارلیمنٹ کے افتتاح کے درمیانی چار مہینوں میں انجمن اپنے ارکان کی ایک جماعت کو انتظامی امور کی تعلیم دیکر حکومت کے مختلف محکموں کے لئے تیاری کر رہی تھی۔ اس طرح نوجوان ترکوں نے اپنی لیاقت کا سکہ بیرونی حکومتوں پر بھی بٹھا دیا۔ انھوں نے دول عظمیٰ کو لکھا کہ مقدونیہ میں ان کی نگرانی کی اب مطلق ضرورت نہیں۔ چنانچہ یورپین افسر واپس بلالئے گئے اور بین الاقوامی کمیشن برخاست کردیا گیا۔

انقلاب کے بعد ترکوں پر یورپ کا پہلا وار اور بوسینیا۔ ہرزیگونیا اور کریٹ پر دول یورپ کا مستقل طور سے قبضہ

نوجوان ترکوں کی صلح جوئی ان طاقتوں کی حرص و آز کو کم نہ کرسکی جو کہ دولت عثمانیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہر موقع پر تیار رہتی تھیں۔ دستور اساسی کے اعلان کے بعد سلطنت کی تمام رعایا کو دستوری آزادی حاصل ہوگئی تھی مگر اُس کے دو صوبے بوسینیا اور ہرزیگونیا جو تیس برس سے اسٹریا کی نگرانی میں تھے استبداد کی زنجیروں سے اب بھی رہا نہ ہوئے حکومت اسٹریا ان صوبوں کو دستوری آزادی دینے پر راضی نہ ہوئی۔ چنانچہ جب ترکی پریس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ دستور کا نفاذ بوسینیا اور ہرزیگونیا میں بھی کردیا جائے جو اسٹریا کی نگرانی کے باوجود سلطنت

عثمانیہ کی فرمانروائی میں داخل ہیں تو اسٹریا کو سخت تشویش ہوئی اور اس نے یہ دیکھ کر کہ ترکی اس وقت مقابلہ کی قوت نہیں رکھتا اور انجمن اتحاد و ترقی ایک طاقت ور سلطنت سے اُلجھ کر اپنے اقتدار کو خطرہ میں ڈالنا پسند نہ کرے گی ۔ ۷ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو دفعتہً ان صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر نائٹ لکھتا ہے :-

"یہ ہی وہ پُرانا قصّہ تھا یعنی ایک رفعت پسند عیسائی حکومت اس خوف سے کہ ایک اصلاح شدہ ترکی کہیں ایک طاقت ور ترکی نہ بن جائے فریب کے ذریعہ سے اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی ۔ اسٹریا کے اس فعل نے رجعت پسندوں کو قدیم نظام حکومت کے از سرِ نو قائم کرنے کا آخری موقعہ بہم پہونچایا اور انھوں نے اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا"

(بیداری ترکی صہ ۲۶۱)

بوسینیا اور ہرزیگوینیا کے الحاق سے دو ہی روز قبل مشرقی رومیلیا کے والی نے جو بلغاریا کا فرمانروا تھا ، زار بلغاریا کا قدیم لقب اختیار کر لیا ۔ پھر ۱۲ اکتوبر کو کریٹ نے بھی مملکت یونان سے اپنے الحاق کا اعلان کر دیا ۔

۳۰ ۔ طرابلس اور اُس پر اطالوی حملہ

ان دست درازیوں کا سلسلہ یہاں تک بھی ختم نہیں ہوا ۔ افریقہ کی ساحلی حکومتیں جو پہلے سلطنت عثمانیہ میں شامل تھیں لیکن بعد میں سلطنت کی کمزوری سے رفتہ رفتہ خود مختار ہوتی گئی تھیں نو آبادیات اور تجارتی منڈی بنانے کی غرض سے مغربی حکومتوں کے لئے مرکز توجہ بن گئی تھیں ۔ چنانچہ فرانس نے الجزائر اور تونس پر قبضہ کر لیا ۔ اور انگلستان نے مصر میں اپنا تسلط قائم کیا ۔ ۱۹۰۴ء میں فرانس اور انگلستان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا تھا کہ انگلستان مصر پر بلا شرکت غیرے قابض رہے گا اور اس کے معاوضہ میں فرانس مراکش کی مملکت پر جو اس وقت تک آزاد تھی قبضہ کرنے میں مدد دے گا ۔ اب افریقہ کی ساحلی حکومتوں میں صرف طرابلس رہ گیا تھا جو کسی یورپین طاقت کے پنجہ میں نہیں آیا تھا اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ طرابلس ایک ریگستانی علاقہ تھا جس میں کہیں کہیں نخلستان نظر آجاتے تھے اس کے ساحل پر کوئی بندرگاہ نہ تھی اور اس پر

حکومت کرنے میں جو مصارف برداشت کرنے پڑتے ان کے معاوضہ کی کچھ زیادہ توقع نہ تھی ۔ یہی سبب تھا کہ فرانس اور انگلستان نے کبھی اس کی جانب توجہ نہیں کی ۔ لیکن اٹلی جو کہ نوآبادیات کے میدان میں ان دونوں سلطنتوں سے بہت پیچھے تھا اور ۱۸۸۱ء میں تونس پر فرانس کو قبضہ کرتے ہوئے دیکھ کر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا تھا اس کی نظر میں طرابلس ہی غنیمت معلوم ہوا ۔ چنانچہ اطالوی وزارت خارجہ نے سلطان عبدالمجید مرحوم کے عہد ہی میں یورپین حکومتوں سے یہ تسلیم کرا لیا تھا کہ جب سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات تقسیم ہونے لگیں تو طرابلس اٹلی کو دیدیا جائے گا ۔ اس باب میں اٹلی نے متعدد معاہدوں کی بنا پر اپنا حق یہاں تک تسلیم کرا لیا تھا کہ ۱۹۰۸ء کے انقلاب عثمانی کے وقت تمام یورپین طاقتوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ اسے جس وقت موقعہ ملیگا وہ فوراً طرابلس پر قبضہ کرلے گا اور یورپ کی کوئی حکومت اعتراض نہ کرے گی ۔ (شیویل ص ۴۰۶) دولت عثمانیہ ص ۲۹۹

بیسویں صدی کے آغاز میں طرابلس سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا اور براہ راست باب عالی کے زیر حکومت تھا اس کو حکومت خود اختیاری کے حقوق کبھی حاصل نہ تھے ۔ جیسا کہ افریقہ کے دوسرے صوبوں نے حاصل کرلئے تھے ۔ اس کی آبادی تمامتر مسلمانوں پر مشتمل تھی ۔ شہر طرابلس اور دوسرے ساحلی مقامات پر ترک اور مور آباد تھے اور اندرونی علاقوں میں نیم آزاد عرب قبائل تھے یہاں کے باشندوں نے کبھی حکومت کی تبدیلی کی خواہش نہیں کی ۔ اور اٹلی کو ان کی طرف سے کسی شکایت کا موقعہ نہیں ملا ۔ لارڈ ایورسلے جس کے قلم سے ترکوں کی حمایت میں ایک لفظ بھی مشکل سے نکلتا ہے اعتراف کرتا ہے کہ طرابلس پر اٹلی کا حملہ تمامتر ایک جارحانہ فعل تھا جس کی تحریک اس وجہ سے ہوئی کہ فرانس نے تونس پر قبضہ کرلیا تھا جس پر جغرافیائی اور معاشیاتی دونوں حیثیتوں سے اٹلی کا حق زیادہ مضبوط تھا ۔ لیکن جمہوریہ فرانس اور برطانیہ عظمیٰ اٹلی کے اس فعل سے متفق ہوگئیں اور یورپ کی دونوں مرکزی سلطنتیں بھی اس وقت تک اٹلی کی حلیف تھیں ۔

(ترکی سلطنت از لارڈ ایورسلے ص ۳۵۵) دولت عثمانیہ ص ۳۰۰

۱۹۱۰ء کے اختتام تک حکومت اٹلی برابر یہ اعلان کرتی آئی تھی کہ وہ سلطنت عثمانیہ کے کسی حصہ کی خواہشمند نہیں ہے ۔ جب یہ افواہ پھیلی کہ وہ طرابلس پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تو اس کے وزیر خارجہ نے ۲ ۔ دسمبر ۱۹۱۰ء کو اطالوی پارلیمنٹ میں اس کی پرزور تردید کی اور کہا کہ ہم سلطنت عثمانیہ کی بقا و سلامتی کے خواہشمند ہیں

اور ہم چاہتے ہیں کہ طرابلس ہمیشہ ترکوں کے قبضہ میں رہے۔ لیکن اس اعلان پر دس مہینے بھی نہیں گذرے تھے کہ حکومت اٹلی نے دفعتہً باب عالی کو الٹی میٹم دیدیا حالانکہ اس درمیان میں فریقین کے تعلقات میں مطلق کشیدگی نہیں پیدا ہوئی تھی اور جواب کا انتظار کئے بغیر پچاس ہزار فوج طرابلس پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کردی اس کے جنگی جہازوں نے پریویسا کے شہر پر گولہ باری شروع کردی جو بحر ایڈریاٹک کے ساحل پر ترکوں کا مقبوضہ تھا اور بحر ایجین کے متعدد جزیروں پر قبضہ کر لیا۔ ترکی جہازوں نے درہ دانیال میں پناہ لی۔ اٹلی کے مقابلہ میں ترکی جہازوں کی حیرت انگیز شکست کا سبب یہ تھا کہ سلطان عبدالحمید نے اپنے عہد حکومت میں بحریہ کی طرف مطلق توجہ نہیں کی تھی اور چونکہ ۱۸۷۷ء کے بعد سے کسی بحری طاقت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی اس لئے مدت سے ترکی جہاز شاخ زریں سے باہر بھی نہیں نکلے تھے۔ اگر سلطان عبدالحمید نے بحریہ کی طرف کچھ بھی توجہ کی ہوتی تو اٹلی کا طرابلس پر قابض ہوجانا قطعاً ناممکن تھا۔ کیونکہ سلطان عبدالعزیز نے عثمانی بیڑے کو اتنا طاقتور بنا دیا تھا کہ وہ اس زمانہ میں یورپ میں تیسرے نمبر پر شمار ہوتا تھا۔ طرابلس کے فوجی دستہ کی تعداد صرف بیس ہزار تھی چونکہ سمندر پر اطالوی جہازوں کا قبضہ تھا اس لئے جنگ شروع ہوجانے کے بعد بحری راستہ سے فوجی کمک بھی نہیں پہونچائی جا سکتی تھی۔ بری راستہ مصر کا تھا جو اس وقت تک سلطنت عثمانیہ کے زیر سیادت اور اس کا باجگذار تھا لیکن مصر پر انگریزی تسلط قائم ہوچکا تھا اور حکومت برطانیہ نے ان سابق معاہدوں کی بنا پر جو طرابلس کی نسبت اٹلی سے ہوچکے تھے مصر کی غیر جانبداری کا اعلان کر کے اس کی راہ سے ترکی فوجوں کو طرابلس جانے سے روک دیا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود نوجوان ترکوں نے ایسی شجاعت سے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا کہ وہ سراسیمہ ہوگئے۔ عرب قبائل جس جانفروشی کے ساتھ وطن کی ایک ایک انچ زمین کے لئے آخر تک لڑتے رہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گی۔ اگرچہ بیرونی امداد کی تمام راہیں مسدود تھیں تاہم اعلان جنگ کے چند ہی دنوں بعد انور بے کسی پوشیدہ طور پر طرابلس پہونچ گئے تھے اور انھوں نے اپنی حیرت انگیز قابلیت سے پورے ملک کو فوجی کیمپ بنا دیا تھا۔ الہلال کلکتہ نے ان کے عجیب وغریب کارناموں کی جو تفصیل بیان کی ہے اس کا ایک ٹکڑا ذیل میں درج ہے۔

انور بے نے طرابلس میں قدم رکھنے کے بعد اطراف وجوانب کے قبائل میں دعوت جہاد

جہاد شروع کر دی اور چند دنوں کے بعد جنود الٰہی کی عظیم الشان صفیں اس کے یمین و یسار تیغے بلند کئے ہوئے چلی آرہی تھیں۔ وہی تن تنہا فرد مقدس دشمن کے بے شمار لشکر کے سامنے حریفانہ و مساویانہ آکر کھڑا ہو گیا اور پورے نو مہینوں کے اندر ایک دن بھی شکست و ہزیمت اس کے دامنِ عزت پر دھبہ نہ لگا سکی۔ تمام اہل عرب جن کو عثمانی خلافت کا قدیمی مخالف سمجھا جاتا تھا اوامر سلطانی کے آگے پوری اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ جھک گئے اور آج عثمانی فوج کے مفہوم میں بلا کسی اختلاف و شبہ کے عربی افواج داخل ہیں۔ عربی فوج کے مرتب کرنے میں جو مشکلیں اجتماع کے بعد پیش آئیں وہ ابتدائی مشکلات سے کم نہ تھیں۔ سب سے پہلی مشکل مختلف قبائل کی عربی عصبیت اور ان کی باہمی بغض و مخالفت تھی جو نسلاً بعد نسلٍ قدیم سے چلی آتی ہے۔ انور بے نے تمام قبیلوں کو مختلف موثر اور دل میں اتر جانے والے طریقہ سے سمجھا کر (جو اس اعجاز آفریں سحر بیان شخص کا وصف مخصوص ہے) ان میں باہم رشتہ داریاں قائم کرا دیں اور اس طرح اس دعوت جہاد کی بدولت صدیوں کی عداوت اور دشمنیاں عہد اخوت و مودت سے بدل گئیں اور دوسری مشکل قبائل کی بے نظمی اور اصول جنگ سے ناواقفیت تھی۔ غازی انور بے نے بغیر اس کے کہ ایک لمحہ بھی فکر و تردد میں ضائع کرتے فوراً تمام قبائل کو چند پلٹنوں میں تقسیم کر دیا اور ہر پلٹن کی تعلیم کے لئے ایک افسر مقرر کر کے شب و روز قواعد کرانی شروع کرا دی۔ خود عربوں نے جب معلوم کر لیا کہ بغیر قواعد کے سیکھے ہم دشمنوں کے حملہ کا جواب نہ دے سکیں گے اور ان کی ابتدائی دستبرد کا انتقام نہیں لیا جا سکے گا۔ تو خود ان کے اندر جوش و غیرت نے ایک ایسی خارق عادت ذہانت اور قوت اخذ و تحصیل پیدا کر دی کہ مہینوں کی مشق ایک چوبیس گھنٹہ کے اندر حاصل کرنے لگے قبائل کی باہمی رقابت سے بھی اس موقع پر بڑی مدد ملی۔ انور بے نے اعلان کر دیا کہ جو قبیلہ پہلے قواعد جنگ کے امتحان میں کامیاب ثابت ہو گا اس کو عزت و ناموری کے نشان کے طور پر ایک طلاکار اطلس کا علم دیا جائے گا۔ یہ سنتے ہی ہر قبیلہ مسابقت کی کوشش کرنے لگا اور شب و روز پورا وقت

فوجی نقل وحرکت اور قواعد سیکھنے اور مشق میں صرف ہونے لگا۔ اسی اثنار میں جب اطالویوں کی جرأتوں نے ایک دو قدم آگے بڑھائے اور بم کے گولے بکثرت آنے لگے تو قبیلہ حسا نے ایک دن ہجوم کر کے ہلّہ کر دیا۔ اور سیکڑوں اطالویوں کو تلوار کے گھاٹ اتار کر بقیۃ السیف کو کوسوں دور بھگا دیا۔ انور بے نے اس کارنامہ کی بڑی قدر کی اور اس قبیلہ کو اپنا وضع کردہ نشان عزت (اطلسی علم) عطا فرمایا۔ دوسرے قبائل نے جب قبیلہ حسا کے خیموں پر اس طلاء کے علم کو لہراتے دیکھا تو انور بے کے پاس دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ ہم کو بھی موقع دیا جائے کہ اس علم کے لینے کا استحقاق ثابت کریں۔ رات کے وقت جب اٹالین کیمپ طرابلس پر قابض ہونے کی خوشی میں بکثرت شراب پی کر بدمست پڑا تھا یکایک عرب قبائل کے صحرائی نعروں کی گونج سے ایک زلزلۂ عظیم محسوس ہوا۔ چند لمحوں کے اندر بے تحاشا بھاگ گئے اور پورا اٹالین کیمپ خالی ہو گیا۔ اطالویوں کے جبن و نامردی نے اہل عرب کو ان کے اولین حملہ ہی میں فتح و نصرت کی ایسی چاٹ لگا دی کہ اب میدان قتال ان کے لئے بچوں کا کھیل بن کر رہ گیا۔ بغیر کسی نقصان کے انھوں نے کھیلتے کودتے ایک پوری اٹالین بلیٹن برباد کر دی اور بکثرت مال غنیمت ساتھ لئے ہوئے اور وطنی گیت گاتے ہوئے عثمانی کیمپ میں واپس آکر اپنی فتوحات ڈھیر کر دیں۔ اس مال غنیمت میں آٹھ سو سے زیادہ بندوقیں تھیں اور اور قسم کی اشیاء اس کے علاوہ۔ ان بندوقوں کی لوٹ سے انور بے بہت خوش ہوئے۔ کیونکہ عمدہ اسلحہ کی کیمپ میں بہت کمی تھی۔ انور بے نے حکومت کے نام سے ان کا فوراً نیلام کر دیا اور وہ دو دو عثمانی گنی پر فروخت کر دی گئیں۔ اس خدمت کے صلہ میں ان کی آرزوے دلی کے مطابق طلاکار اطلسی علم ان کو عطا کیا گیا۔ اس کے بعد تو ہر قبیلہ اس علم کے لئے اٹھنے لگا اور دشمن پر برق ہلاکت بنکر گرنے لگا ہر قبیلہ کی کوشش ہوتی کہ وہ دوسروں سے زیادہ تعداد میں دشمنوں کو قتل کریں اور سب سے زیادہ مال غنیمت انور بے کے سامنے انبار کر سکیں تاکہ شجاعت و وطن پرستی کا اعلیٰ سے اعلیٰ نشان اور تمغہ صرف ہمیں کو حاصل ہو۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر عثمانی کیمپ

میں پندرہ ہزار سے زیادہ قیمتی اور جدید ایجاد کی بندوقیں جمع ہوگئیں۔

(الہلال جلد ۳ صہ ۱۲-۱۱) دولت عثمانیہ صہ ۳۰۴

۳۱۔ صلحنامہ توران

اطالوی اس صورت حال سے بدحواس ہوگئے۔ انھوں نے شجاعت کا جواب درندگی سے دینا شروع کیا اور ایسے مظالم کیے کہ خود یورپین نامہ نگاروں نے جو اٹالین فوج کے ساتھ طرابلس میں تھے ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن جب اس سے بھی کام نہ چلا تو وہ زیادہ زور بحری جنگ پر دینے لگے۔ چنانچہ مئی ۱۹۱۲ء میں روڈس اور بعض دوسرے جزائر ایجین پر قبضہ کرلیا۔ انہیں توقع تھی کہ ترک اب آسانی کے ساتھ صلح کے لئے راضی ہوجائیں گے۔ لیکن ترکوں نے صلح کرنے سے قطعی طور پر انکار کردیا۔ وہ اس وقت تک جنگ کو جاری رکھنے کا عزم کرچکے تھے جب تک دشمنوں کو شکست دیکر بھگا نہ دیں۔ لیکن بدقسمتی سے اس درمیان میں البانیا میں بغاوت برپا ہوگئی اور پھر بلقان کے افق سے ایک متحدہ اور خوفناک جنگ کے بادل اٹھتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ ان حالات کے پیش نظر باب عالی نے بادلِ ناخواستہ صلح کی گفتگو شروع کی اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو صلحنامہ پر محاربین کے دستخط ہوگئے۔ طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کرلیا گیا۔ اٹلی نے وعدہ کیا کہ بحر ایجین کے مفتوحہ جزائر دولت علیہ کو واپس کرے گا لیکن یہ وعدہ کبھی شرمندۂ ایفا نہ ہوا۔

۳۲۔ بلقانی ریاستوں کا اتحاد اور جنگِ بلقان

جس خطرہ کو محسوس کرکے ترکوں نے اٹلی سے صلح کی تھی وہ بہت جلد سامنے آگیا۔ ریاست ہائے بلقان نے تاریخ میں پہلی بار متحد ہوکر سلطنت عثمانیہ کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ جنگ بلقان بقول خالدہ ادیب خانم گویا جنگ عظیم کی ایک مشق تھی دونوں کی تیاری اور تحریک میں روس کے وزیر خارجہ اسوولیسکی کی عقل شیطانی کارفرما تھی اسوولیسکی نے یہ تدبیر سوچی کہ بلقانی ریاستوں کو متحد کرکے ترکوں کو بلقان سے نکال دے اور پھر آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرلے۔ چنانچہ اسی کوشش سے مارچ ۱۹۱۲ء میں سرویا اور بلغاریا میں ترکی کے خلاف ایک معاہدہ ہوا۔ اسوولیسکی نے اس معاہدہ کی اطلاع فرانسیسی وزیر خارجہ موسیو پوانکارے کو دی اور لکھا کہ ابھی یہ کسی پر ظاہر نہ کیا جائے۔ بلغاریہ کو ۱۰ کروڑ فرانک سامان جنگ

فراہم کرنے کے لئے قرض دیا گیا۔ (ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص۶۲ و ص۸۳) دولت عثمانیہ ص۳۰۶

اس معاہدہ کی ایک خفیہ دفعہ کی رو سے یہ طے پایا کہ اگر مقدونیہ کا کوئی حصہ فتح ہو جائے تو جو علاقے ان دونوں ریاستوں سے متصل واقع ہیں وہ ان میں شامل کر دیئے جائیں اور درمیانی علاقوں کی تقسیم روس کے فیصلہ پر چھوڑ دی جائے (ایورسلے ص۳۵۷)

روس ہی کی وساطت سے مئی ۱۹۱۲ء میں یونان اور بلغاریہ کے درمیان بھی ایک معاہدہ ہو گیا۔ یہ سرویا اور بلغاریا کے معاہدہ سے ایک خاص امر میں مختلف تھا یعنی اس میں مقدونیہ کی تقسیم کا کوئی ذکر نہ تھا۔

(میریٹ ص۴۴۷) دولت عثمانیہ ص۳۰۷

پھر ستمبر ۱۹۱۲ء میں سرویا اور مونٹی نیگرو کے درمیان بھی ایک معاہدہ ہوا جس میں طے پایا کہ فریقین ترکی سے علیحدہ علیحدہ جنگ کریں اور کسی ترکی شہر یا گاؤں پر سرویا اور مونٹی نگرو کی فوجیں متحدہ طور پر قابض ہوں

البانیہ کی بغاوت اور مانٹی نگرو کا اعلان جنگ

ان معاہدوں کے بعد اتحادی (انگلستان، روس، فرانس، چاہتے تھے کہ جنگ جلد از جلد شروع کر دیں۔ طرابلس کی جنگ جاری تھی اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ دوسری طرف البانیا کی بغاوت سے مقدونیہ کی تقسیم کا مسئلہ جو اس اتحاد کی اصلی غرض اور غایت تھی بہت مشکل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ البانیہ کا مطالبہ حکومت خود اختیاری تھا۔ وہ سقوطری۔ یانینا، مناستر اور قوصوہ کی ولائتوں کو متحد کر کے دولت علیہ عثمانیہ کے زیر سیادت ایک خود مختار مملکت قائم کرنا چاہتا تھا۔ ابتدا میں انجمن اتحاد و ترقی نے البانیہ کی بغاوت کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ لیکن جب سلطنت کی فوج نے بھی جو البانیہ میں تھی باغیوں کا ساتھ دینا شروع کیا اور جون ۱۹۱۲ء میں مناستر کے فوجی دستہ نے علانیہ بغاوت کر دی اور موجودہ وزارت توڑ دینے کا مطالبہ کیا تو البانیا کا مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ حکومت کے سامنے آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جولائی میں محمود شوکت پاشا نے استعفا دیدیا۔ اور اُن کی جگہ ناظم پاشا جو انجمن اتحاد و ترقی کا شدید مخالف تھا وزیر جنگ مقرر ہوا۔ اگست میں حلمی پاشا صدر اعظم کو بھی استعفا دینا پڑا۔ باغیوں کی یہ کامیابی دیکھ کر بلقانی ریاستوں کو یہ خطرہ ہوا کہ ممکن ہے البانیا ایک خود مختار مملکت تسلیم کر لی جائے اور سقوطری، یانینا، مناستر اور قوصوہ کی ولائتیں اس میں شامل کر دی جائیں۔ اگر

ایسا ہوا تو ان ریاستوں میں سے ہر ایک کو اس علاقہ سے محروم ہونا پڑے گا جس کی وہ خصوصیت کے ساتھ خواہشمند تھی چنانچہ اس خوف سے کہ کہیں یہ موقعہ ہاتھ سے نہ نکل جائے انھوں نے عجلت کی اور ۸ ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کو شاہ نکولس والی مونٹی نگرو نے باب عالی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

زمانہ اعلان جنگ بلقان میں ترکی کی اندرونی حالت اور بلقان کا اعلان جنگ

اس زمانہ میں ترکی کی اندرونی حالت بہت نازک تھی۔ قدامت پسند گروہ نوجوان ترکوں کی انتہا پسندی کا مخالف تھا۔ خود حکمراں جماعت میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ فوج کے اس حصہ کو جو قدامت پسند تھا غلبہ حاصل ہو گیا تھا محمود شوکت پاشا کے استعفا دینے کے بعد فوج کی تنظیم بوڑھے افسروں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی جو قابلیت میں نوجوان ترکوں سے بہت کم تھے۔ کامل پاشا صدر اعظم تھا اور اُسے انگلستان کی حمایت پر اس قدر بھروسہ تھا کہ وہ بلقان کے خطرہ کو زیادہ اہم نہیں خیال کرتا تھا اُسے یقین تھا کہ انگلستان بلقان پر حملہ نہ ہونے دیگا۔ اسی یقین کی بنا پر اس نے ۱۹۱۲ء میں (۷۰) ہزار تربیت یافتہ فوج کو جو بلقان کی سرحد پر جمع تھی منتشر کر دیا۔ لیکن جب جنگ چھڑ جانے میں کسی شبہ کی گنجائش نہ رہی تو یورپین حکومتوں سے مداخلت کی درخواست کی گئی۔ چنانچہ ستمبر میں روس اور آسٹریا نے دول عظمیٰ کی طرف سے ایک احتجاجی نوٹ اتحادیوں کے پاس بھیجا۔ ظاہر ہے کہ اسوولسکی کی سازشوں کے بعد اس احتجاج کا اثر کیا ہو سکتا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ دولت علیہ اپنی کمزوری محسوس کر رہی ہے پہلے مونٹی نگرو اور پھر دوسری ریاستوں نے اعلان جنگ کر دیا۔ ترکی کے پاس ایک لاکھ فوج تھی اور وہ بھی زیادہ تر نئے رنگروٹوں کی۔ لغاریہ کی فوج ایک لاکھ اسی ہزار تھی۔ سرویا کی اسی ہزار یونان کی پچاس ہزار۔ (ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص۸۵) دولت عثمانیہ ص۸۵

ان ریاستوں نے سلطنت عثمانیہ سے علیحدہ ہونے کے بعد اپنی تنظیم یورپین حکومتوں کے طرز پر کر لی تھی اور ان کی فوجیں یورپ کے فوجی نظام کے مطابق تربیت یافتہ تھیں۔ برخلاف اس کے نوجوان ترک ملک کی اصلاح کافی طور پر نہ کر سکے تھے جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انھیں عنان حکومت ہاتھ میں لئے ہوئے صرف چار ہی سال گذرے تھے اور دوسری بڑی وجہ قدامت پسند گروہ کی مخالفت تھی۔ نئے قانون کے مطابق ترکی فوج میں عیسائی اور یہودی بھی بھرتی کئے گئے تھے۔ ان کو فوجی خدمت جس سے وہ اب تک بالکل بری تھے نہایت شاق تھی۔

چنانچہ جب لڑائی شروع ہوئی تو انھیں عیسائی اور یہودی سپاہیوں نے دھوکہ دیا اور سب سے پہلے میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے - ایک تو عثمانی فوجوں کی تعداد اتحادیوں کے مقابلہ میں یوہنی کم تھی دوسرے عیسائیوں اور یہودیوں کی غداری سے اور زیادہ نقصان پہونچا -

جنگ بلقان

اتحادیوں نے جنگ کا مقصد سلطنت عثمانیہ کی عیسائی صوبوں کی اصلاح حال ظاہر کیا تھا مگر حقیقتہً اُن کے پیش نظر ذاتی اغراض تھیں - یونان - کریٹ اور بحر ایجین کے دوسرے جزیروں پر قبضہ کرنے کے علاوہ خود براعظم پر بھی اپنی سرحدوں کی توسیع کا خواہشمند تھا - بلغاریا کو اُس بلغاریا عظمیٰ کی آرزو تھے جس کا نقشہ صلحنامہ سان اسٹیفانو میں مرتب کیا گیا تھا - سرویا ان تمام علاقوں کو اپنے اندر شامل کر لینا چاہتا تھا کہ جو سٹیفن ڈوشن کے زمانہ میں اس کی قدیم سلطنت کے جزو تھے وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی مملکت کے حدود بحر ایجین اور بحر ایڈریاٹک کے ساحلوں تک پہونچ جائیں - مونٹی نگرو کی نظر البانیا کے ایک حصہ پر تھی - (لارڈ ایورسلے ص۳۵۹) دولت عثمانیہ ص۳۱۰

۸ - اکتوبر کو مونٹی نگرو نے اعلان جنگ کر دیا تھا - بقیہ ریاستوں نے ۱۸ - اکتوبر کو اعلان کر کے اسی روز اپنی فوجیں عثمانی مقبوضات کی طرف روانہ کیں - حملہ کا سب سے زیادہ زور بلغاریا کی طرف سے تھا جس کا مقصد خود قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا تھا - چنانچہ ۱۸ - اکتوبر کو بلغاری فوجیں تھریس میں داخل ہوئیں اور ۲۲ - اکتوبر کو قرق کلیسا اور ۲۸ کو لولو برگاس کے معرکوں میں ترکوں کو شکست دی - عثمانی فوج نے شتلجہ کے حصار میں پناہ لی جو قسطنطنیہ سے تقریباً بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے - بلغاریوں نے شتلجہ پر کئی حملے کئے مگر نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا - وسط نومبر تک ادرنہ کے سوا تھریس کے اور تمام حصوں پر اُن کا قبضہ ہو گیا - اس درمیان میں سرویا، مونٹی نگرو اور یونان نے بھی متعدد فتوحات حاصل کر لی تھیں - سرویا کی فوجیں سرحد عبور کر کے قدیم سرویا میں داخل ہوئیں - کسانووہ کے میدان میں ۲۳ - اکتوبر کو ترکوں سے مقابلہ ہوا دو روز تک جنگ جاری رہی - آخر میں ترکوں کو شکست ہوئی - سروی فوجوں نے اسکوب پر قبضہ کر لیا - جو اُن کی قرون وسطیٰ کی سلطنت کا پایہ تخت تھا اس کے بعد وہ مقدونیا میں بڑھتی ہوئی مناستر تک پہونچ گئیں - دوسری طرف مونٹی نگرو کی فوجوں نے سقوطری کے زبردست قلعہ کا محاصرہ کر لیا - یونانیوں کی فتوحات کا بھی یہی حال تھا

وہ بھی قریب قریب ہر معرکہ میں کامیاب رہے ۔ ۸ - نومبر کو یونانی فوجوں نے سالونیکا پر قبضہ کر لیا مگر ان کی بحری فتوحات زیادہ اہم تھیں ۔ آخر نومبر تک بحر ایجین کے تقریباً تمام عثمانی جزائر پر یونان کا قبضہ ہو گیا تھا ۔ ترکی بحریہ کی کمزوری بری فوجوں کی حالت سے بھی زیادہ افسوسناک ثابت ہوئی ۔

عثمانی شکست کے اسباب

ترکوں کی حیرت انگیز شکستوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایورسلے لکھتا ہے ۔ عثمانی فوجوں کی بدنظمی اور ابتری کا منجملہ اور خاص اسباب کے ایک خاص سبب یہ بھی تھا کہ سامان رسد کا انتظام مطلق نہ تھا ۔ تین تین چار چار روز تک فوجوں کا بغیر غذا کے رہ جانا کوئی استثنائی واقعہ نہ تھا بلکہ عموماً ایسا ہی ہوتا تھا ۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ یورپ کی اس جنگ میں عثمانی فوجوں میں بڑی تعداد دیہاتی عیسائیوں کی تھی جو پہلی بار جبری طور پر بھرتی کئے گئے تھے ۔ ان کی ہمدردی تمام تر دشمن کے ساتھ تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ ترکی صفوں کے ٹوٹنے کے وقت فوج کا انتشار اور فرار زیادہ تر انھیں کے بھاگنے کی وجہ سے ہوتا تھا اور جو لوگ باقی رہ جاتے تھے وہ اپنے گھروں کو بھاگ جاتے تھے ۔ (ایورسلے ص ۳۶۳) دولت عثمانیہ ص ۳۱۲

خالدہ ادیب خانم اپنی سوانح میں لکھتی ہیں :- بدنظمی کے لحاظ سے جنگ بلقان سے بڑھ کر کوئی جنگ نہیں ہوئی ہے ۔ حفظان صحت کا کوئی انتظام نہ تھا اور خطوط مدافعت کے پیچھے انتظامات کی ابتری نہایت افسوسناک تھی ۔ بھیڑیں گاڑیوں میں بھوکی مر رہی تھیں اور آٹا گوداموں میں سڑ رہا تھا لیکن نصف میل سے کم ہی فاصلہ پر لوگ فاقہ سے جان دے رہے تھے ۔ جب ترک پناہ گزیں قتل عام سے بھاگ کر سراسیمہ قسطنطنیہ پہونچے جب باہر سے آنے والوں اور فوج میں ہیضہ پھیلا ۔ جب آبادی کی آبادی مسجدوں کے صحن میں سردی کی شدت سے دم توڑتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی تو قسطنطنیہ کی مصیبت کا منظر اتنا ہولناک تھا کہ خیالی معلوم ہوتا تھا ۔ (سوانح خالدہ ادیب خانم ص ۳۳۷) دولت عثمانیہ ص ۳۱۲

یورپ کا عہد ناموں کا پابند ہونا

آغاز جنگ میں دول عظمٰی نے اعلان کیا تھا کہ خواہ کوئی فریق بھی کامیاب ہو بلقان کی موجودہ حالت برقرار رکھی جائے گی ۔ اس اعلان کا سبب یہ تھا کہ انھیں ترکی کی کامیابی کا قوی اندیشہ تھا اور جس طرح ۱۸۹۷ء میں

انھوں نے ایک ایسے ہی اعلان سے یونان کی پشت پناہی کی تھی اور ترکوں کو یونانی فتوحات سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ اسی طرح ریاست ہائے بلقان کا تحفظ بھی پہلے ہی سے کر لیا گیا تھا۔ لیکن جب خلاف توقع عثمانی فوجوں کو تقریباً ہر معرکہ میں شکست ہوئی اور دشمن حیرت انگیز طور پر کامیاب ہونے لگے تو انہیں زبانوں نے جو یہ اعلان کر چکی تھیں اب اس کے خلاف آواز اٹھائی اور یہ کہا جانے لگا کہ بلقانیوں کو ان کی فتوحات سے محروم کر دینا ہرگز قرینِ انصاف نہیں۔ مسٹر اسکویتھ وزیر اعظم برطانیہ نے دول عظمیٰ کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا:۔

"مشرقی یورپ کے نقشہ کو از سر نو مرتب کرنا ضروری ہے اور فاتحین کو ان ثمرات سے محروم نہیں کرنا چاہیئے جو انہی گراں قیمت پر انھیں حاصل ہوئے ہیں۔" (ملر صفحہ ۵۰۰) دولت عثمانیہ صفحہ ۳۱۳

عارضی صلح

دول عظمیٰ کی تحریک پر ۳ر دسمبر کو ترکی اور بلغاریا اور سرویا کے درمیان ایک عارضی صلح ہو گئی۔ یونان اور مونٹی نگرو سے جنگ جاری رہی۔ اب تک جنگ کا نتیجہ یہ تھا کہ ترک مقدونیا اور تقریباً تمام تھریس اور اپائرس سے خارج ہو چکے تھے۔ قسطنطنیہ کے علاوہ یورپ میں صرف ادرنہ یانینا اور سقوطری پر ان کا قبضہ باقی رہ گیا تھا۔ لیکن یہ تینوں شہر بھی دشمن کے محاصرہ میں تھے۔

صلح کانفرنس لنڈن

۱۶ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو لنڈن میں صلح کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا۔ ادرنہ (ایڈریانوپل) کے مسئلہ پر سب سے زیادہ مشکل پیش آئی اور یہی مسئلہ کانفرنس کی ناکامی کا باعث ہوا۔ بلغاریہ نے مستقل صلح کے لئے ادرنہ کے حصول کو ایک لازمی شرط قرار دیا تھا۔ بابِ عالی اس پر راضی نہ تھا۔ لیکن جب ۱۷ر جنوری ۱۹۱۳ء کو دول عظمیٰ کی طرف سے ایک نوٹ باب عالی میں بھیجا گیا۔ اور اس میں یہ مشورہ دیا گیا کہ ادرنہ ریاست ہائے بلقان کے حوالہ کر دیا جائے اور جزائر ایجین کا مسئلہ دول عظمیٰ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے تو صدر اعظم کامل پاشا نے جو کہ انگلستان کا دوست تھا ترکی کی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس مشورہ کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ قریب تھا کہ مجلس وزراء کامل پاشا کی اس تحریک سے متفق ہو کر دول عظمیٰ کے نوٹ کا جواب روانہ کر دے اور ترکی کے قتل نامہ پر خود اسی کی مہر ثبت کر دی جائے کیونکہ ادرنہ سے دست برداری حقیقتہً قسطنطنیہ کی دست برداری کا مقدمہ ہوتی لیکن عین وقت پر ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا جس نے مجلس وزراء کی یادداشت کو جو دول عظمیٰ کے پاس جانے کے لئے مرتب ہو چکی تھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے خود موجودہ دزارت

کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد جو وزارت قائم ہوئی اُس نے ادرنہ کو حوالہ کرنے سے قطعاً انکار کر دیا جس کے بعد ہی صلح کانفرنس بھی برخاست ہو گئی۔ (دولت عثمانیہ ص۳۱۴)

انقلاب وزارت

یہ انقلاب وزارت اسی بطل حریت کا رہین منت تھا جس نے ۱۹۰۸ء میں ملک کو سلطان عبد الحمید کے استبداد سے نجات دلا کر دستوری حکومت قائم کر دی تھی۔ انور بے طرابلس کی مہم سے فارغ ہو کر قسطنطنیہ پہونچ چکے تھے۔ اسی خاموشی اور جرات کے ساتھ جو ۱۹۰۸ء کے انقلاب میں اس درجہ کامیاب ہوئی تھی وہ چند جانفروشوں کو لے کر دفعۃً ایوانِ وزارت میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر افسران جنگ اور عام پبلک کے دستخط تھے اور اس میں تبدیل وزارت یا انکار صلح پر زور دیا گیا تھا۔ فوج کا جو حصہ وزارت کے ہاتھ میں تھا اسے پہلے ہی کسی بہانہ سے قسطنطنیہ سے باہر بھیجدیا گیا تھا اور جس قدر فوج شہر میں تھی وہ سب قومی جماعت کے ساتھ تھی جس کی سیادت انور بے کر رہے تھے۔ وزراء ان حالات سے بے خبر اپنے کام میں مشغول تھے کہ انور بے اندر داخل ہوئے۔ ناظم پاشا وزیر جنگ کے ایڈی کانگ نے اس جماعت کو روکنے کی کوشش کی اور پستول چلائی معاً دوسری طرف سے بھی گولی چلی اور ناظم پاشا گر کر وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ بہت جلد انور بے نے وزارت خانہ پر قبضہ کر لیا۔ کامل پاشا کو استعفا دینا پڑا اس کی جگہ محمود شوکت پاشا صدر اعظم مقرر ہوئے (دولت عثمانیہ ص۳۱۵)

البانیا کی آزادی

عین اس وقت میں جبکہ بلقانی ریاستیں لڑ رہی تھیں اہل البانیا نے ولونا میں ایک مجلس منعقد کر کے سلطنت عثمانیہ سے اپنی کامل آزادی کا اعلان کر دیا۔ ان کو خطرہ تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو البانیا کا بھی وہی حشر ہوگا جو بلقان کے دوسرے عثمانی مقبوضات کا ہونے والا ہے۔ اس اعلان سے دول عظمیٰ کے ہاتھ مضبوط ہو گئے اور انھوں نے لندن کانفرنس میں نہ صرف یہ کہ سردیہ کو مجبور کر کے البانی بندرگاہوں سے دست بردار کرایا بلکہ البانیا کا استقلال بھی باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا۔ البانیا ایک خود مختار ریاست قرار دی گئی جس کے فرمانروا کا انتخاب دول عظمیٰ کے فیصلہ پر رکھا گیا۔ اس فرمانروا کی مدد کے لئے ایک بین الاقوامی کمیشن کا تقرر طے ہوا۔ سرحدوں کی تعیین بھی ایک خاص کمیشن کے سپرد کی گئی دیہ صوبہ البانیا اور نووط قوم کا وطن ہے جو کہ ترکی مملکت میں نہایت زیادہ بہادر اور سلطان عبد الحمید مرحوم کے خصوصی محافظ تھے اور سب کے

سب مسلمان ہیں) انہیں کی بغاوت اور البانی فوج کی ہمدردی اور مطالبہ تبدیل وزارت کی بنا پر محمود شوکت نے استعفا دیا تھا اور کامل پاشا کی وزارت قائم ہوئی تھی

لندن صلح کانفرنس تبدیلی وزارت کی وجہ سے ناکام ہو کر چونکہ ٹوٹ گئی تھی تو عارضی صلح بھی جاتی رہی اور پھر تمام بلقان میں جنگ جاری ہو گئی۔ وزارت جدیدہ اس قلیل مدت میں کوئی معتدبہ انتظام نہ کر سکی جس کی وجہ سے جو مقامات بلقان میں ترکوں کے پاس باقی رہ گئے تھے وہ بھی ہاتھ سے نکل گئے۔ بالآخر ۱۹ ر اپریل ۱۹۱۳ء کو ترکوں اور بلغاریوں میں بولیر میں عارضی طور پر صلح ہوئی اور مستقل صلح کے لئے لندن میں دوبارہ صلح کانفرنس کے انعقاد کی کوشش شروع کی گئی چنانچہ کانفرنس کا انعقاد ہوا اور بہت زیادہ بحث اور گفتگو کے بعد ۳۰ ر مئی کو صلحنامہ لندن پر فریقین کے دستخط ہو گئے۔ جس کی بنا پر یوروپین ترکی کے تمام علاقے بہ استثنار البانیا جو خط اینوس و میڈیا کے مغرب میں واقع تھے ریاست ہائے بلقان کو دیدیئے گئے۔ البانیا کی سرحدوں نیز اس کے متعلق تمام دوسرے مسائل کا فیصلہ دول عظمیٰ پر چھوڑ دیا گیا۔ کریٹ کے علاوہ اور تمام "جزائر ایجین" کی قسمت کا فیصلہ بھی دول عظمیٰ ہی پر چھوڑا گیا، باب عالی نے کریٹ کا الحاق یونان سے منظور کر لیا۔ مالی معاملات کا تصفیہ پیرس کے بین الاقوامی کمیشن کے سپرد کیا گیا اور حکومتی اختیارات قومیت اور تجارت کے مسائل کا مخصوص معاہدوں سے طے ہونا قرار پایا۔ (ملخص صفحہ ۵۰۰-۵۰۹) دولت عثمانیہ صفحہ ۳۱۸

جنگ تقسیم بلقان

ترکی یوروپین علاقوں کی تقسیم میں جو کہ دوسری لندن کانفرنس میں ریاست بلقان کو دیدیا گیا تھا نہایت زیادہ اختلاف ہوا۔ ہر ایک اپنے لئے زیادہ سے زیادہ چاہتا تھا اور ایسے مقامات کو انتخاب کرتا تھا جو کہ دوسرے کے نزدیک بہت اہم اور ضروری تھے۔ یہاں تک کہ نوبت جنگ کی آ گئی۔ اگرچہ اپنی اپنی کامیابی پر ہر ایک سرمست اور سرشار تھا مگر ان میں بلغاریا سب سے زیادہ مغرور اور سرمست تھا اس نے حریفوں کی طاقت سے بے پروائی کرتے ہوئے ۲۹ ر جون ۱۹۱۳ء کو آدھی رات میں بغیر کسی اطلاع یا اعلان جنگ کے یونانی اور سروی دستوں پر حملہ کر دیا۔ دوسرے روز ایک لاکھ بلغاری فوج نے اُس سروی فوج پر جو کہ اس سے قریب تھی ہلہ بول دیا۔ سروی فوج اس ناگہانی حملہ سے پہلے تو پسپا ہوئی لیکن یکم جولائی کو مونٹی نگرو کی مدد سے جم کر مقابلہ کیا۔

(بلغاریہ کے تیور دیکھ کر پہلے سے اتحادیوں (سردیا، مونٹی نگرو، یونان، رومانیہ) نے آپس میں معاہدہ اتحاد

کر لیا تھا) اور ۸ر جولائی کو بلغاری فوج کو شکست دیکر اس کی بہت سی توپیں چھین لیں۔ ۹ر جولائی کو پھر مقابلہ ہوا اور بلغاریا کو پھر شکست ہوئی۔ ۱۰ر جولائی کو سروی فوج نے اسٹیپ پر قبضہ کر لیا۔ اب بلغاری پسپا ہو کر اپنی سرحد کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس درمیان میں یونانی فوجوں نے بھی پیشقدمی کر کے بلغاری فوج سے بمقام کلتیش جنگ کی بلغاری بری طرح ہارے۔ اس کے بعد متعدد لڑائیاں اور ہوئیں جن میں بلغاریوں کو لگاتار شکستیں کھانی پڑیں اور ان کے لئے صرف اپنی سرحد کی راہ کھلی رہ گئی۔ بلغاریا کی اس نازک حالت کو دیکھ کر ترکوں نے بھی فائدہ اٹھایا اور ۱۵ر جولائی کو انور پاشا تھریس میں داخل ہوئے اور ۲۰ر جولائی کو ادرنہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ڈیموٹیکا اور قرق کلیسا بھی انھوں نے دوبارہ فتح کر لئے۔

عارضی صلح

جنگ تقسیم صرف ایک ماہ تک جاری رہی لیکن اس قلیل مدت میں بلغاریا کی حالت نہایت نازک ہو گئی۔ اس کی فوجوں کو ہر معرکہ میں شکست ہوئی۔ دشمن کی فوجیں ہر طرف سے بڑھتی ہوئی آرہی تھیں۔ بالآخر اسے مجبور ہو کر دول عظمیٰ سے صلح کی درخواست کرنی پڑی۔ ۳۱ر جولائی کو فریقین ایک عارضی صلح پر راضی ہوئے اور طے پایا کہ ایک صلح کانفرنس منعقد کی جائے جس میں ریاست ہائے بلقان کے نمائندے شریک ہوں لیکن دول عظمیٰ کے نمائندے شرکت نہ کریں۔

صلحنامہ بخارسٹ

بخارسٹ میں صلح کانفرنس کا اجلاس فوراً شروع کر دیا گیا اور اس سرعت کے ساتھ معاملات فیصل ہوئے کہ ۱۰ر اگست ۱۹۱۳ء کو محاربین نے صلحنامہ پر دستخط کر دیئے سب سے زیادہ نقصان بلغاریہ کو برداشت کرنا پڑا۔ مقدونیہ (جس کے لئے اس نے یہ جنگ تقسیم چھیڑی تھی) یونان اور سرویا میں تقسیم کر دیا گیا اور اس کو تقریباً کلیتہً محروم کر دیا گیا۔

دولت عثمانیہ کے ساتھ کوئی معاہدہ ۲۹ر ستمبر تک نہ ہو سکا۔ ۲۹ر ستمبر کو بالآخر باب عالی اور بلغاریا کے درمیان بھی صلح ہو گئی۔ تھریس کا بڑا حصہ ترکوں کو واپس مل گیا۔ اس میں ادرنہ، ڈیموٹیکا اور قرق کلیسا کے اہم شہر شامل تھے۔ یورپ میں دولت علیہ کی کائنات صرف اسی قدر اور رہ گئی تھی۔ باقی سارا علاقہ ریاست ہائے بلقان میں تقسیم ہو گیا۔

بلقان کی دونوں جنگوں میں ترکوں کے مقتولوں اور زخمیوں کا شمار ایک لاکھ نفوس کا کیا گیا ہے اور مصارف

۸ کروڑ پونڈ کیا گیا ہے۔ علاقہ اور آبادی کے لحاظ سے اس کی آبادی میں سے بیالیس لاکھ اڑتالیس ہزار دو سو نفوس اس کی حکومت سے نکل گئے اور صرف دس ہزار آٹھ سو بیاسی مربع میل اس کی حکومت میں رہ گئے۔

خالدہ ادیب خانم جنگ بلقان کے نتائج اور اثرات میں منجملہ دیگر امور مندرجہ ذیل امور بھی تحریر فرماتی ہیں:-

(الف) شکست کی مصیبت تو تھی ہی اس پر طرہ یہ ہوا کہ بلقانیوں نے مسلمانوں کی آبادی کو جو جنگ میں شریک نہ تھی اور جس میں زیادہ تر عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے قتل کرنا شروع کر دیا۔ اور یہ لوگ بھاگ کر ترکی میں پناہ لینے لگے۔ اسیران جنگ کو قتل کرنا، ان کو فاقوں مارنا، ان کے ہاتھ پیر کاٹنا، عام باشندوں کو اذیت پہونچانا اور اُن کا خون بہانا۔ ان سب چیزوں کی ابتداء زمانۂ حال میں بلقانیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں کی۔

(ب) مغرب ان ہولناک مظالم کو چپ چاپ دیکھتا رہا۔ مگر جب بلقان کی ریاستوں نے ایک دوسرے کی عیسائی رعایا کے ساتھ بھی یہی حرکتیں شروع کیں تو مغرب سے مخالفت کی آواز اٹھی۔ دوسری جنگِ بلقان کے بعد کارنیگی نے ایک بین الاقوامی کمیشن تحقیقات کے لئے بھیجا۔

(ج) جب ترکی عورتوں نے استنبول کے یونیورسٹی ہال میں جمع ہو کر یورپ کی بادشاہ بیگموں سے اپیل کی تھی کہ انسانی ہمدردی کی خاطر بلقان کی مسلم آبادی کی حمایت کریں تو جواب تک نہیں ملا تھا۔ ترکوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی فریاد سے یہ بے اعتنائی اور عیسائیوں کو اسی حال میں دیکھ کر یہ جوش و خروش تو ان پر بہت برا اثر ہوا۔ مقدونیہ سے ہزارہا مسلمان بھاگ کر اناطولیہ میں آئے تھے اور اپنی مظلومی کی داستان سُناتے تھے اس کی وجہ سے اناطولیہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات جو اب تک بہت اچھے تھے بہت خراب ہو گئے۔ (ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش صفحہ ۸۲-۸۶)

مندرجہ بالا احوال اور واقعات سے جو کہ اکثر یورپین مورخین سے نقل کئے گئے ہیں ہر سمجھ دار شخص مندرجہ ذیل نتائج نکالنے پر مجبور ہے۔

(الف) انگریز اور یورپین تو میں ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو نہ انسان سمجھتی ہیں اور نہ انسانی حقوق دیتی ہیں۔

ان کا دعوے عام انسانوں کی ہمدردی کا بالکل جھوٹا ہے۔

(ب ۲) انگریزوں اور یورپین اقوام کا نعرہ خدمت انسانی صرف اپنی نسل اپنی رنگت اپنی سرزمین یورپ تک محدود ہے۔ جو لوگ یورپین نسل اور سپید رنگ اور سرزمین یورپ کے باشندے نہیں ہیں وہ ہر اس فعل کے مستحق ہیں جو سلوک حیوانات کے ساتھ کئے جا سکتے ہیں بلکہ وہ مثل حیوانات یورپ والوں کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

(ج ۳) ان کا اعتقاد اور نظریہ یہ ہے کہ نوآبادیات ایشیا اور افریقہ وغیرہ کے باشندوں کا مال، جان، عزت، زمین دستکاری، تجارت وغیرہ سب انگریزوں اور متسلط یورپینوں کا مملوک ہے جس طرح چاہیں ان کے لئے قانون بنائیں اور جس طرح چاہیں ان میں تصرف کریں۔ یہ رنگین قومیں اگر اُف بھی کریں تو باغی ہیں۔ مجرم ہیں۔ مستحق دار و گیر ہیں۔

(د ۴) ان کے نزدیک اپنی شہنشاہیت، اپنی قوم، اپنے وطن کے لئے تمام رنگین قوموں اور ان کے ذرائع معاش اور ذرائع امن و سکون وغیرہ کو قربان کرنا ہی عدل اور رحمت اور تہذیب ہے۔

(ھ ۵) ان کا اعتقاد ہے کہ ہر قسم کا جھوٹ، غدر، فریب و مکر، ظلم و ستم، پروپیگنڈا، اور ہر ایک شرمناک معاملہ اپنے اور اپنی قوم و ملک کے مفاد کے لئے واجب اور فرض ہے اور اس میں کوئی قباحت اور عیب نہیں۔

(و ۶) ہندوستانیوں کا دنیا میں سب سے بڑا دشمن انگریز ہے اس نے جس قدر ہندوستانیوں کی دولت ذرائع دولت (تجارت، صنعت، زراعت) وغیرہ اور ان کے اخلاق، تعلیم، عزت، اتحاد، اعلیٰ قابلیت وغیرہ کو نقصان پہونچایا کسی قوم نے زمانہائے گذشتہ میں نہیں پہونچایا اور نہ کسی دوسری قوم نے اب تک کسی دوسری قوم کو پہونچایا۔

(ز ۷) انگریزوں اور یورپین قوموں کے عہود و مواثیق ایشیائیوں اور افریقیوں کے لئے سراسر جھوٹ اور مکر ہیں۔ دفع الوقتی کے لئے عمل میں لائے جاتے ہیں اور جب چاہتے ہیں توڑ بیٹھتے ہیں۔ کوئی معاہدہ رنگین قوموں اور ایشیائیوں اور افریقی لوگوں سے کیا ہوا ضروری العمل نہیں ہے۔

(ح ۸) انگریز ہندوستانیوں کو ہمیشہ ادنیٰ حالت اور غلامی کی لعنتوں میں پھنسائے رکھنا چاہتا ہے۔ کسی امر

میں اس کو ہندوستانیوں کا ابھرنا گوارا نہیں ہے۔

(ط۹) انگریز مذہب اسلام اور مسلمانوں کے روئے زمین پر سب سے بڑے دشمن ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے ہر ظلم ہر بے حیائی ہر بدعملی کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں۔

(ی۱۰) ابتداء اسلام سے آج تک اسلام اور مسلمانوں کو جس قدر نقصان یورپین قوموں اور بالخصوص انگریزوں نے پہونچایا ہے کسی نے نہیں پہونچایا۔

(ک۱۱) انگریز دوست بنکر بھی رنگین قوموں اور مسلمانوں کو نقصان پہونچاتا رہا ہے اور دشمن بنکر بھی۔ اُن کی دوستی اور دشمنی ایشیائیوں اور افریقیوں کے لئے بربادی ہی بربادی ہے۔

(ل۱۲) انگریز کا ہندوستان میں باقی رہنا ہندوستان کا برباد ہونا ہے۔ جتنی ہی اس میں دیر ہوگی ہندوستان کی ہرمنٹ بربادی بڑھتی ہی جائے گی۔ جیسا کہ ہم ڈبلیو۔ ایس۔ بلنٹ وغیرہ کا قول نقل کر آئے ہیں۔

(م۱۳) انگریزوں نے ہندوستانیوں میں پھوٹ اور تفرقہ اس قدر پیدا کر دیا کہ جس کے ہوتے ہوئے امن وامان صدیوں تک مکمل نہیں ہو سکتا۔

(۱۴) انگریزوں نے ہندوستان کو جو کہ مذہبی اور روحانی ملک تھا بالکل ناستک اور بے دین ملک بنا دیا ہے مذہبیت اور خدا ترسی کو تقریباً مٹا دیا ہے۔ فسق و فجور، خود غرضی مکر و فریب، جھوٹ، دغابازی مادہ پرستی اور دنیا طلبی اور خلاف انسانیت اعمال کو شائع کر دیا ہے۔

ہندوستان کے حالات اور دنیا بھر کے واقعات کے مطالعہ اور گہرے غور و فکر نے انگریزوں اور یورپین اقوام کے متعلق یہ عقائد و خیالات حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ذہن میں پختہ کر دیئے تھے۔ نیز دنیا کی سابقہ تاریخیں اور آسمانی تعلیمات اُن کے پیش نظر تھیں۔ پہلو میں غیرت مند دل اور بیدار دماغ موجود تھا۔ بنا بریں آنے والے ثمرات و نتائج کا ظہور لازمی تھا۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک پر روشنی ڈالنے سے پہلے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر تاریخی حالات

ناظرین کی خدمت میں پیش کردیں۔ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور کے عثمانی شیوخ میں ایک معزز اور ذی وجاہت عالم تھے۔ بصیغۂ ملازمت ڈپٹی انسپکٹری مدارس ایک عرصہ تک بریلی میں مقیم رہے (علوم عربیہ بالخصوص ادبیات عربیہ وفارسیہ و اردو میں آپ کو خاص مہارت تھی شرح دیوان حماسہ مسمیٰ بہ تسہیل الدارسہ اور شرح دیوان متنبی اور شرح سبع معلقہ، شرح قصیدہ بردہ، تذکرۃ البلاغہ وغیرہ آپکی تصنیف کردہ کتابیں آج بھی نہایت مفید اور عمدہ یادگار ہیں) حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم ۱۲۶۸ھ میں وہیں (بریلی میں) پیدا ہوئے۔ ایام طفولیت میں جبکہ آپ کا سن پانچ یا چھ برس کا تھا قبل از واقعہ ۱۸۵۷ء والد ماجد کا تبادلہ میرٹھ ہوگیا اس وجہ سے غدر کے زمانہ میں کبھی میرٹھ اور کبھی دیوبند رہے۔ قرآن مجید اور ابتدائی فارسی کی تعلیم ایک دیندار بزرگ میانجی منگلوری صاحب سے پائی اور کتب عربیہ اپنے با فضل و کمال چچا مولانا مہتاب علی صاحب مرحوم سے پڑھنی شروع کی تہذیب و قدوری وغیرہ پڑھتے تھے کہ دیوبند میں با اخلاص مقدس بزرگوں کے مشورہ سے ۱۲۸۳ھ میں مدرسہ عربیہ جو آج ایک مرکز علوم اسلامیہ ہونے کی حیثیت رکھتا ہے جاری ہوا اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اس کے سرپرست قرار پائے۔ حضرت مولانا اس کے سب سے پہلے شاگردوں اور طالبعلموں میں داخل ہوئے۔ اکثر کتب درسیہ مدرسہ کے اولین اور مشہور استاد ملا محمود صاحب دیوبندی مرحوم کے پاس پڑھنے کے بعد اپنے مخصوص استاذ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں دیوبند اور میرٹھ میں (جبکہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مطبع مجتبائی میں بسلسلہ تصحیح کتب مطبوعہ ملازم تھے) رہکر صحاح ستہ اور دیگر علوم کی اعلیٰ کتابیں پڑھ کر فیوض و کمالات حاصل فرماتے۔ اور بعض کتب اپنے والد ماجد سے بھی پڑھیں۔ فراغت تحصیل سے پہلے ہی مدرسہ میں بطور معین المدرسین درس دینا شروع فرمادیا۔ ۱۲۹۰ھ میں آپکو علماء حقانی کے ہاتھ سے دستار فضیلت اور سند تکمیل عطا ہوئی۔ صاحب بصیرت بزرگوں کی تجویز سے ۱۲۹۲ھ میں باقاعدہ مدرس چہارم مقرر ہوئے اور ہر قسم کی متوسط اور اعلیٰ کتابیں آپکے زیر درس رہیں۔ ۱۲۹۴ھ میں بزرگان ہندوستان کے مشہور قافلہ جس میں مولانا محمد قاسم صاحب مولانا محمد یعقوب صاحب مولانا رشید احمد صاحب اور بہت سے مقدس و مشاہیر علماء و صلحاء شریک تھے۔ حج بیت اللہ اور زیارت حرم نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے شوق میں روانہ ہوئے اور

حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بارشاد مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم بیعت کا شرف حاصل کیا۔ ان مقامات مقدسہ کے برکات وفیوض سے بہرہ ور ہو کر چھ ماہ کے بعد بعافیت واپس ہوئے، اور بدستور تعلیم علوم میں مصروف ہو گئے اسی زمانہ میں اپنی مشہور کتاب ایضاح الادلہ کے ابتدائی اجزار تحریر فرمائے ۱۲۹۷ھ میں جبکہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ چند ماہ بیمار رہ کر واصل بحق ہو گئے تو ان کی مفارقت کے غم والم میں تمام تعلقات اور مشاغل تدریسیہ ترک کر کے عزلت گزینی اختیار فرمائی (حضرت مولانا کو اپنے کامل اُستاذ مولانا نانوتوی مرحوم سے انتہائی عشق اور اخلاص تھا اس مفارقت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے) ایک ماہ بعد مہتمم دارالعلوم مولانا رفیع الدین صاحب مرحوم کے اصرار وارشاد پر پھر تدریس شروع فرمائی نیز جذبہ سلوک طریقت اسی زمانہ میں غالب آیا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی جدوجہد شروع کی اوقات تعلیم میں علوم ظاہرہ کی تدریس میں مشغول رہتے تھے اور باقی اوقات میں ذکر وشغل میں مصروف ہوتے تھے۔ طبیعت نہایت موزوں تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں مقامات طریقت طے کر کے مستحق خلافت ہو گئے چنانچہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حسب عادت حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کو لکھا کہ مولوی محمود حسن کو ملکہ یادداشت حاصل ہو گیا ہے آپ اُن کو اجازت دیدیں (حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی حیات میں کسی کو خود خلافت واجازت نہیں دیتے تھے۔ سالکین طریقت کو تعلیم وتلقین فرماتے رہتے تھے۔ جب کوئی مستحق اجازت ہو جاتا تھا تب اس کی اطلاع حضرت مرشد قدس اللہ سرہٗ العزیز کو دیکر وہاں سے اجازت دلواتے تھے) چنانچہ وہاں سے اجازت آگئی۔ جامع کمالات نمونہ سلف صدر مدرس جناب مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات اور مولانا سید احمد صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھوپال چلے جانے کے بعد ۱۳۰۵ھ میں باتفاق آراراراکین دارالعلوم صدر مدرس تجویز ہوئے اور علی الاتصال چالیس سال تک نشر واشاعت علوم فرماتے رہے۔ تمام علوم ظاہرہ اسلامیہ اور معارف باطنہ معنویہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور سب علوم وفنون کی کتابیں بلا تکلف اعلیٰ تحقیقات کے ساتھ پڑھاتے تھے لیکن علم حدیث میں مخصوص شہرت اور بے مثال تبحر اور تحقیق رکھتے تھے جس کی وجہ سے اقطار ہندوستان اور ممالک بعیدہ سے طلبار علوم کشاں کشاں آتے تھے۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، موصل، بصرہ، بلخ، بخارا

ہرات، قندہار، کابل، ترکستان۔ ہر جگہ کے طلبہ آپ کے حلقۂ درس میں نظر آتے تھے اور تحقیقات عجیبہ کے فیوض سے ان
بھر کے لیجاتے تھے۔ متعدد منتہی طلبہ جو مختلف اساتذہ کی خدمتوں سے استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں
حاضر ہوتے تھے اپنے اپنے شکوک وشبہات کے کامل اور تشفی بخش جواب پانے کے بعد حضرت مولانا مرحوم کی زبان سے
آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے معانی ومضامین عالیہ کو سنکر سر نیاز خم کر کے معترف ہوتے تھے کہ علم کسی کو نہیں۔ نہ
ایسا محقق عالم اس وقت دنیا میں ہے۔ آواز صاف وبلند، تقریر نہایت سلیس اور رواں تھی۔ کلام میں خاص اثر تھا جو کہ
مضمون کو سامع کے دل نشیں کر دیتا تھا۔ جوانی اور قوت کے زمانہ میں دن رات کے اکثر اوقات درس وتدریس کے شغل
میں گذرتے تھے۔ لیکن اخیر ایام میں صرف دو تین گھنٹے روزانہ جامع ترمذی اور صحیح بخاری کا درس دیتے تھے۔

(مختصر سوانح عمری حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز از مولانا سید
اصغر حسین صاحب مرحوم مع افادات زائدہ ص۱۰۱)

تواریخ عالم بالخصوص تاریخ اسلام پر خصوصی نظر تھی۔ اساتذہ شعر وسخن کے (خواہ عربی ہوں یا فارسی یا اردو)
کلام بہت زیادہ محفوظ تھے جن کو سنکر ماہر ادیب دنگ رہ جاتا تھا۔ ملکہ سخن گوئی نہایت اعلیٰ اور عجیب تھا اساتذہ کلام
میں مرزا غالب سے بہت زیادہ مناسبت تھی۔ طبیعت نہایت سادہ اور متواضع تھی۔ فخر وتکبر کا نام تک نہ تھا۔
ظاہری چال ڈھال، وضع قطع میں ریاء ونمود، تعلی اور بڑائی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ عزم راسخ اور یقین صادق قدرت نے
عطا فرمایا تھا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ آمین۔

تحریک انقلاب (عرف) ریشمی خطوط کی تحریک

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ہندوستان جبکہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں آسمان سیاست پر درخشاں
آفتاب بنکر چمک رہا تھا اسی زمانہ میں سامان کسوف بنکر منحوس یورپین قومیں پہلے پہل تاجر بنکر پھر ان کی دیکھا دیکھی...
انگریز، فرنچ، ڈچ، جرمن وغیرہ ہندوستان میں آئیں۔ یہاں کے بادشاہوں اور حکام نے مہمان نوازی کے فرائض حسب عادت
سلاطین ہند انجام دیئے ان کو نہ صرف داخلہ کی اجازت دی بلکہ سکونت اور تجارت اور حقوق شہریت وغیرہ بلا
رکاوٹ دیئے گئے۔ انگریز بھی مثل دیگر اقوام اس خوان نعمت سے فیضیاب ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سے

انگریز تاجر اطراف و جوانب ہند میں پھیل گئے۔ اُن کو اپنے یورپین ہم وطن اقوام سے رقیبانہ کشمکشیں بھی پیش آئیں۔ بالآخر ۱۶۰۰ء میں اُن کے تقریباً ایک سو تاجروں کی منظم جماعت بنام ایسٹ انڈیا کمپنی بن گئی جس نے تجارتی کاروبار اجتماعی قوت سے جاری کیا اور غدارانہ بلکہ ظالمانہ طریقوں سے بہت زیادہ کمایا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ان کی نیتیں فاسد اور ارادے نہایت خباثت آمیز ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے ۱۷۵۷ء میں نواب سراج الدولہ آف بنگال پر حملہ کر دیا اور اس کے ارکین دولت میں سے میر جعفر اور امی چند وغیرہ وزیروں کو توڑ لینے میں کامیاب ہو کر ملک گیری اور حکومت شروع کر دی۔ یہ چسکا ان کو ایسا لگا کہ ہر وقت اور ہر آن یہی دُھن لگی رہتی تھی۔ بالآخر ۱۸۰۳ء تک تقریباً اکثر حصہ ہندوستان میں اُن کا مکمل اثر اور پورا اقتدار قائم ہو گیا اور اس قدر جرأت ہو گئی کہ بادشاہ دہلی سے جبراً اپنی حکومت پر دستخط کرا کر ملک میں اعلان کرا دیا کہ "خلقت خدا کی ملک بادشاہ کا حکومت کمپنی بہادر کی"

ان معاملات کو علماء اسلام دیکھتے تھے اور دل ہی دل میں کڑھتے رہتے تھے۔ آخر کار حکام سلطنت کی غفلت، بے پروائی، بے وفائی، بزدلی، ارباب اقتدار کے آپس کے نفاق کے مظاہروں وغیرہ نے مجبور کیا کہ عام مسلمانوں کو متنبہ کیا جائے۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے آزادی کے متعلق فتوٰی دیدیا اور عام مسلمانوں کو ہندوستان کے آزاد کرانے کے فریضہ کو سمجھایا اس وقت سے مسلمانوں اور خصوصاً اہل علم میں یہ تحریک انقلاب شروع ہوئی اور تقریباً بیس برس کے عرصہ میں تمام ہندوستان میں شعلہ جوالہ کی طرح یہ تحریک پھیل گئی اور ایک مکمل نظام اور مکمل قوت تیار ہو گئی۔ ۱۸۲۴ء میں مغربی سرحد میں پہونچکر اس کی عملی کارروائی جاری ہو گئی جس کی تفصیل ہم پہلے صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ چھ برس تک کامیابیوں کے ساتھ یہ کارروائی جاری رہی مگر انگریزی چالبازیوں اور آپس کے نفاق اور غداریوں وغیرہ کی وجہ سے ۱۸۳۰ء میں شکست ہوئی اور تحریک تقریباً فیل ہو گئی انگریزوں نے شرکار تحریک پر عرصۂ دراز تک انتہائی آزار اور انتقامی تکلیف کے اعمال جاری رکھے اندرون ملک میں ہندوستانیوں کی عام لوٹ کھسوٹ اور ایذا دہی میں وہ انسانیت سوز حرکتیں کیں جن کی وجہ سے انگریزوں سے عام ناراضی ملک میں پھیل گئی اور ۱۸۵۷ء کا مشترک واقعہ پیش آیا جس میں ہندو اور مسلمان آپس میں مل کر ہندوستان کی آزادی کے لئے سرکف ہو گئے تھے۔ بدقسمتی اور خائنوں کی بدعملی کی وجہ سے اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ ہندو اور مسلمان سب ہی برباد کئے گئے مگر مسلمانوں پر بربادی کے پہاڑ بہت زیادہ ڈھائے گئے اور ہر قسم کے انتہائی

دردناک مظالم اُن کو سہنے پڑے (جن کو ہم کچھ سابق صفحات میں بطور نمونہ عرض کر چکے ہیں) چنانچہ شدت مظالم اور انگریزوں کی فوجی اور اسلحہ جدیدہ کی بے پناہ طاقت کی نمائش کی بنا پر ہندوستانیوں میں جنگ کے ذریعہ انقلاب کرنے کی ہمت نہ رہی۔ خوف و ہراس کا ہر طرف دور دورہ ہو گیا۔ اور مظالم شنیعہ کا اندھیرا بہ نسبت سابق کئی گنا زائد پھیلا دیا گیا۔ بالآخر تنگ ہو کر آئینی انقلاب کی تحریک ۱۸۸۵ء میں بصورت کانگریس جاری کی گئی اس کی رفتار نہایت دھیمی تھی اور بالمقابل انگریز ہر قسم کے توڑ کی کارروائی کر رہا تھا۔ تا اینکہ نوبت تقسیم بنگال کی آ گئی۔ لارڈ کرزن نے افتراق کا سیلاب چاروں طرف بنگال میں پھیلا دیا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو لڑا کر حکومت برطانیہ نے اپنا مقصد خوب حاصل کیا مگر پھر مجبور ہو کر دربار کے موقعہ پر تقسیم کے منسوخ کر دینے کا اعلان کر دیا۔ یوپی میں ۱۹۰۰ء میں ناگری کا اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ اور مہاسبھا کا اور پھر کانپور کی مسجد اور کلکتہ میں توہین جناب سرور دو عالم علیہ السلام اور اور پھر فائرنگ کا فتنہ برپا کر دیا۔ ادھر ٹرکی جو عرصۂ دراز سے مسلمانوں کا قبلۂ توجہ اور خلیفہ دینی چلا آتا تھا اس کے ساتھ مظالم اور دردناک ناانصافیوں خصوصاً جنگ طرابلس اور بلقان اور تقسیم ممالک اسلامیہ کے ایسے واقعات لگاتار پیش آئے جنھوں نے انتہائی بے چینی عام قلوب میں پیدا کر دی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز جن کی گہری نظر واقعات عالم اور بالخصوص ہندوستان اور ٹرکی پر زیادہ مرکوز رہتی تھی ان واقعات سے اس قدر متاثر ہو گئے کہ ان کے لئے آرام و چین تقریباً حرام ہو گیا اور گویا وہ اپنے اختیار سے نکل گئے۔ تاریخ دانی اور گذشتہ واقعات ہند و ممالک اسلامیہ ایشیا و افریقہ و یورپ وغیرہ پر غائرانہ نظر نے ان کو مجبور کر دیا کہ وہ مذکورہ بالا چودہ نتائج کو جو کہ صفحہ ۱۲۸ تا ۱۳۰ میں ذکر کئے گئے ہیں۔ صحیح سمجھیں۔ چنانچہ ہم ہمیشہ ان سے بار بار ان مضامین کو سنا کرتے تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر تاریخ میں ہم ذکر کر آئے ہیں کہ مولانا مرحوم کو تعلیم و تربیت کا شرف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور پھر حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس اللہ اسرارہما اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل تھا سالہا سال ان کی خدمت عالیہ میں انتہائی اخلاص اور شغف بلکہ عاشقانہ جذبات کے ساتھ رہنا ہوا تھا اور ان حضرات کی وہ مکمل ہستیاں تھیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں علم آزادی بلند کر کے شاملی، تھانہ بھون وغیرہ پر سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا ان کے سینوں میں ہمیشہ آزادی اور جہاد کی مبارک آگ سلگتی رہتی تھی اس لئے

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ میں انگریزی اقتدار کے فنا کر دینے کا جذبہ مستقل طور پر ہونا طبعی امر ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں چونکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو قدرت کی فیاضیوں سے ایسا قلب عطا ہوا تھا جس میں انسانی غیرت، وطنی اور قومی حمیت، اخلاص اور للہیت، اسلامی ہمدردی وغیرہ کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔ دماغ ایسا قوی الحافظہ عطا کیا گیا تھا جس میں نہ صرف علوم نقلیہ اور عقلیہ کے بے شمار مسائل محفوظ رہتے تھے بلکہ واقعات تاریخیہ اور اشعار ادبیہ اردو فارسی عربی کے بیشمار خزانے بھی جمع رہتے تھے۔ ذکاوت اور سمجھ ایسی اعلیٰ درجہ کی عطا ہوئی تھی کہ مشکل سے مشکل مسائل ادنیٰ توجہ میں حل فرما دیتے تھے۔ اس لئے بیرون ہند کے مذکورہ بالا واقعات خصوصاً بلقان اور طرابلس کے دل گداز اور ہولناک مظالم اور اندرون ہند کی انگریزوں کی روزافزوں چیرہ دستیوں اور شرمناک وحشت و بربریت، لوٹ کھسوٹ کی فراوانی نے انتہائی درجہ میں مایوس اور مضطرب کر دیا اور آمادہ کر دیا تھا کہ عواقب اور نتائج سے بے نیاز ہو کر میدان انقلاب میں سر بکف، کفن بردوش نکل پڑیں۔ زمانہ کی تاریکیاں، موسم کی کالی گھٹائیں، احوال کی نزاکتیں، اہل ہند بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ کمزوریاں رکاوٹ بن کر سامنے آئیں اور کچھ عرصہ اسی غور و خوض میں گذرا مگر چونکہ پانی سر سے گذر چکا تھا اس لئے خوب سوچ سمجھ کر صرف قادر مطلق پر اعتماد اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دیا۔

شروع شروع میں بہت زیادہ مشکلات قیاس سے زیادہ سامنے آئیں۔ سخت اور تند آندھیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بادِ سموم کے جھلسا دینے والے تھپیڑوں نے طمانچے مارے۔ احباب و اقارب مار آستین بن گئے۔ ہر شخص ناصح اور خیر خواہ بنکر سدّ راہ بنا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ انگریز نے اس قدر پیش بندی کر رکھی تھی کہ سیاسیات کی طرف آنکھ اٹھانا سنہ سنادن کا سماں باندھتا تھا۔ آزادی اور انقلاب کا اگر کوئی خواب بھی دیکھ لیتا تھا تو پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ ہوم رول یا خود اختیاری حکومت کی خواہش بھی زبان پر لانا برق جہاں سوز سے زیادہ خطرناک شمار کی جاتی تھی۔ برطانی تشددات اور مظالم کے ہونے نے اس قدر قلوب اور دماغوں کو متاثر کر رکھا تھا کہ بہت سے نفوس میں اللہ تعالے کا خوف اس قدر نہ پایا جاتا تھا جتنا کہ انگریز کا خوف مستولی تھا۔ خفیہ پولیس اور سی آئی ڈی میں ایسے ایسے لوگ کام کر رہے تھے کہ جن پر شبہ کرنا بھی بے دینی اور کفر سمجھا جا سکتا تھا۔ چاروں طرف سی آئی ڈی کا جال بچھا ہوا تھا پھر کس طرح امید کی جا سکتی تھی کہ کوئی شخص بھی ہمخیال

اور ہمزبان یا ہم عمل ہو سکتا ہے خصوصاً جبکہ ہر شخص آزادی کے ذکر کرنے سے بھی کان پر ہاتھ رکھتا ہو۔ بہر حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے تمام خطرات سے قطع نظر کرنا ضروری سمجھا اور "ہر چہ بادا باد من کشتی در آب انداختم" کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا نام لیکر اس بحر زخار اور ہولناک طوفان میں کود کر آگے بڑھے۔ اور لوگوں کو ہم خیال اور رفیق سفر بنانے لگے۔ بڑے بڑے علماء اور مشائخ سے چونکہ نا اُمید اور مایوس تھے (جیسا کہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مشہور مولویوں اور پیروں سے امید نہ رکھنی چاہئے اور فرماتے تھے کہ بعض اہل اللہ نے مجھ کو یہ نصیحت کی تھی) وجہ ظاہر ہے کہ ان کو اپنی بڑائی کی وجہ سے بہت زیادہ خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اپنے تلامذہ اور مخلص سمجھدار مریدوں کو ہم خیال بناتے رہے[1]۔ جن میں سے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم بھی ہیں۔ مولانا عبید اللہ صاحب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خاص فدائی اور مسلم شاگرد تھے۔ عرصہ دراز تک خدمت میں رہے تھے[2]۔ سمجھ اور حافظہ نہایت اعلیٰ

---

[1] چونکہ مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تقریباً پچاس برس سے مسند تدریس پر متمکن رہے تھے اس لئے مخلص شاگردوں اور جانباز معتقدوں کی تعداد ہزاروں سے زیادہ تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے عموماً انہیں لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر مشن تحریک آزادی میں شریک کیا تھا۔ ان کی تفصیلی فہرست بہت طویل ہے۔ مگر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے مشاہیر اور بہت زیادہ سرگرم ممبروں کی مختصر فہرست پیش کر دی جائے۔ (مصنف)

[2] وہ اپنی ڈائری کے صفحہ ۹ میں لکھتے ہیں:۔ میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں چیانوالی میں پیدا ہوا۔ خاندان کا اصلی پیشہ زرگری (سوناری) تھا لیکن عرصہ سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا اور بعض افراد ساہوکارہ بھی کرتے رہے۔ میں عموماً سلمان فارسیؓ کے اتباع میں اپنا نام عبید اللہ بن اسلام لکھا کرتا ہوں۔ مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار سے والدہ کی طرف منسوب کر کے لکھنا پڑا تو عبید اللہ بن ابی عائشہ لکھا۔ میری بڑی ہمشیرہ کا نام "جیونی" تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اگر کسی نے اس سے زیادہ تصریح کے لئے کہا تو عبید اللہ بن رام این رائی لکھوں گا۔ میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کے کاردار تھے۔ میں بشب جمعہ قبل صبح ۱۲ محرم ۱۲۸۹ھ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء پیدا ہوا میرا باپ چار ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ دو سال بعد دادا بھی مر گیا تو میری والدہ مجھے ننھیال میں لے آئی۔ یہ ایک خالص سکھ خاندان تھا۔ میرے نانا کی ترغیب پر ہی میرا والد سکھ بن گیا تھا۔ میرے دو ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں میں پٹواری تھے۔ جب نانا فوت ہوئے تو ہم ان کے پاس چلے آئے۔ میری تعلیم ۱۸۷۸ء سے جام پور کے اردو مڈل اسکول میں شروع ہوئی ۱۸۸۴ء میں (باقی صفحہ ۱۳۸ پر)

پیمانہ کا اور ہمت و استقلال بے نظیر قدرت نے عطا فرمایا تھا اس زمانہ میں دہلی میں مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ میں تعلیمی کام کرتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے نوجوانان اسلام کے عقائد اور خیالات پر جو برے اثر پڑتے ہیں

حاشیہ متعلق بہ صفحہ ۱۳۷ - مڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا - کہ اظہار اسلام کے لئے گھر چھوڑ دیا - اس دوران میں دو سال کے لئے میں ضلع سیالکوٹ میں رہا - اس لئے ایک سال اپنی جماعت سے پیچھے رہ گیا ورنہ اپنے اسکول میں شروع ہی سے ممتاز طالب علم مانا جاتا تھا - ۱۸۸۴ء میں مجھے اسکول کے ایک آریہ سماج کے لڑکے کے ہاتھ سے تحفۃ الہند ملی - میں اس کے مطالعہ میں مصروف رہا اور بالتدریج اسلام کی صداقت پر یقین بڑھتا گیا - ہمارے قریب کے پرائمری اسکول (کوٹلہ مغلاں) سے چند ہندو دوست بھی مل گئے جو میری طرح تحفۃ الہند کے گرویدہ تھے انہیں کے توسط سے مجھے مولانا اسمٰعیل شہید رح کی تقویۃ الایمان ملی - اس کے مطالعہ پر اسلامی توحید اور پورا شرک اچھی طرح سمجھ میں آگیا - اس کے بعد مولوی محمد صاحب لکھوی کی کتاب احوال الآخرۃ پنجابی ایک مولوی صاحب سے ملی - اب میں نے نماز سیکھ لی اور اپنا نام تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر عبیداللہ خود تجویز کیا - احوال الآخرۃ کا بار بار مطالعہ اور تحفۃ الہند کا وہ حصہ جس میں نومسلموں کے حالات لکھے ہیں یہی دو چیزیں جلدی اظہار اسلام کا باعث بنیں - ورنہ اصل ارادہ یہ تھا کہ جب کسی ہائی اسکول میں اگلے سال تعلیم کے لئے جاؤں گا تو اس وقت اظہار اسلام کروں گا - ۱۵ - اگست ۱۸۸۷ء کو توکلاً علی اللہ نکل کھڑا ہوا - میرے ساتھ کوٹلہ مغلاں کا ایک رفیق عبدالقادر تھا - ہم دونوں عربی مدرسہ کے ایک طالب علم کے ساتھ کوٹلہ رحم شاہ ضلع مظفر گڑھ میں پہنچے - ۹ ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ کو میری سنت تطہیر (ختنہ) ادا ہوئی - اس کے چند روز بعد جب میرے اعزہ تعاقب کرنے لگے تو میں سندھ کی طرف روانہ ہوگیا - عربی صرف کی کتابیں میں نے راستہ میں اسی طالب علم سے پڑھنا شروع کر دی تھیں - اللہ کی خاص رحمت سے جس طرح ابتدائی عمر میں اسلام کی سمجھ آسان ہوگئی اسی طرح کی خاص رحمت کا اثر یہ بھی ہے کہ سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحب (بھرچونڈی والے) کی خدمت میں پہونچ گیا - جو اپنے وقت کے جنید اور سید العارفین تھے - چند ماہ ان کی صحبت میں رہا - اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لئے اس طرح طبیعت ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے - حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب فرمایا (غالباً مولانا ابوالحسن تاج محمود امروٹی جن کا ذکر آگے آئے گا اس مجلس میں موجود تھے) کہ عبیداللہ نے اللہ کے لئے ہم کو اپنا ماں باپ بنا لیا ہے - اس کلمہ مبارکہ کی تاثیر خاص طور پر میرے دل میں محفوظ ہے - میں انہیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں اور محض اسی لئے سندھ کو مستقل وطن بنایا یا بن گیا - میں نے قادری راشدی طریقہ میں حضرت سے بیعت کرلی تھی - اس کا نتیجہ (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۳۹)

اور الحاد کا زہریلا اثر پڑتا ہے اس کو زائل کیا جائے اور قرآن کی تعلیم اس طرح دیجائے کہ ان کے شکوک و شبہات نئین اسلام سے دور ہو جائیں اور وہ سچے اور پکے مسلمان ہو جائیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ دہلی تشریف لے گئے اور

بسلسلہ صفحہ ۱۳۸ - یہ محسوس ہوا کہ بڑے سے بڑے انسان سے بہت کم مرعوب ہوتا ہوں۔ تین چار ماہ بعد میں طالب علمی کے لئے رخصت ہوا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ حضرت نے میرے لئے خاص دعا فرمائی "خدا کرے کہ عبید اللہ کا کسی راسخ عالم سے پالا پڑے" میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی اور اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل سے مجھے حضرت مولانا شیخ الہند رح کی خدمت میں پہونچا دیا۔ بھرچونڈی سے رخصت ہو کر میں اس طالب علم کے ساتھ ریاست بہاولپور کی دیہاتی مساجد میں ابتدائی عربی کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نقل و حرکت میں دین پور پہونچا جہاں سید العارفین (حافظ محمد صدیق صاحب) کے خلیفہ مولینا ابو السراج غلام محمد صاحب رہتے تھے۔ ہدایۃ النحو تک کتابیں میں نے یہیں مولوی عبد القادر صاحب سے پڑھیں حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا وہ آگئیں اور واپس لیجانے کے لئے بہت زور لگایا مگر میں بحمد اللہ ثابت قدم رہا۔ (یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہونچی) اور مولوی خدا بخش صاحب سے کافیہ پڑھا۔ یہیں ایک نووارد طالب علم سے ہندوستانی مدارس عربیہ کا حال معلوم ہوا اور میں اسٹیشن مظفر گڑھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیوبند پہونچا۔ ماہ صفر ۱۳۰۶ھ کو میں دار العلوم میں داخل ہوا۔ تخمیناً پانچ مہینے میں قطبی تک منطق کے رسائل متفرق اساتذہ اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی۔ ایک فاضل استاد کی مہربانی سے طریقہ مطالعہ سیکھ لیا اور محنت سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔ حکمت و منطق کی کتابیں جلدی ختم کرنے کے لئے چند ماہ مولانا احمد حسن کانپوری کے مدرسہ میں چلا گیا۔ اور پھر چند ماہ مدرسہ عالیہ رام پور میں وہ کہ مولوی ناظر الدین صاحب سے کتابیں پڑھ لیں۔ اس طرح صفر ۱۳۰۷ھ کو پھر دیوبند واپس آگیا۔ دیوبند دو تین مہینے تک مولانا حافظ احمد صاحب سے پڑھتا رہا اس کے بعد مولانا شیخ الہند رح کے درس میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۷ھ کو ہدایہ، تلویح، مطول، شرح عقائد، مسلم الثبوت میں امتحان دیا اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس اول نے میرے جوابات کی بہت تعریف کی۔ فرمایا "اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبد العزیز ثانی ہوگا" چند دوستوں نے مبشرہ خواب دیکھے۔ میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور امام ابو حنیفہ رح کو بھی خواب میں دیکھا۔ رمضان شریف میں اصول فقہ کا ایک رسالہ لکھا جسے شیخ الہند رح نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح تحریر کئے جس میں جمہور اہل علم کے خلاف محققین (دیکھئے صفحہ ۱۴۰)

مولانا عبید اللہ صاحب سے ملاقات کی اور تذکرہ میں فرمایا کہ جبکہ انگریزی حکومت اور اقتدار ہندوستان میں قائم ہے تو جس مدت تک تم اپنی اس تعلیم اور اس مدرسہ سے دس بیس آدمی صحیح الخیال مسلمان بناؤ گے اس مدت میں انگریز ہزاروں کو ملحد اور زندیق بنا دیں گے" (اور واقعہ بھی یہی تھا۔ ڈبلو، ہنٹر کہتا ہی ہے۔ کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں سے پڑھا ہوا کوئی نوجوان ہندو یا مسلمان ایسا نہیں ہے جس نے اپنے بزرگوں کے عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو) چنانچہ مولانا عبید اللہ صاحب کی سمجھ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اسکیم آگئی اور وہ عالی ہمتی اور تن دہی کے ساتھ تمام ہولناک خطرات کو پس پشت ڈالتے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ رولٹ اپنی رپورٹ میں کہتا ہے کہ مولوی عبید اللہ نے (مولانا) محمود حسن کے خیالات پر اثر ڈالا۔

صفحہ ۱۳۹ کا بقیہ: کی رائے کو ترجیح دی تھی۔ مثلاً تاویل المتشابہات ناممکن الحصول نہیں۔ بلکہ راسخین فی العلم بھی علم سے جانتے ہیں۔ شوال ۱۳۰۶ھ سے تفسیر بیضاوی اور دورہ حدیث میں شریک ہوا۔ جامع ترمذی مولانا شیخ الہند رح سے پڑھی اور ابوداؤد کے لئے حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت میں گنگوہ پہونچا۔ بیمار ہو کر گنگوہ سے دہلی چلا آیا۔ حکیم محمود خاں کے علاج سے فائدہ ہوا۔ حدیث کی باقی کتابیں مولوی عبد الکریم صاحب پنجابی دیوبندی سے جلدی جلدی ختم کرلیں۔ مجھے یاد ہے کہ سنن نسائی اور بعض ابن ماجہ میں نے چار چار دن میں پڑھی تھیں اور سراجی دو گھنٹہ میں ختم کرلی۔ مولوی صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت مولانا رشید احمد رح کے غیر معروف محقق شاگرد تھے۔ اثنائے قیام دہلی میں دو دفعہ مولانا نذیر حسین صاحب کی خدمت میں گیا۔ صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں دو سبق بھی سُنے۔ ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۰۸ھ کو دہلی سے سیدھا بھرچونڈی ضلع سکھر پہونچا (اس تمام سفر میں ایا بادرہا یا لاہور نہیں اترا اور مسجد چینیاں نہیں گیا۔) میرے مرشد میرے آنے سے دس دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ رجب ۱۳۰۸ھ میں حضرت شیخ الہند رح نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیجدیا اور مولوی کمال الدین صاحب نے مجھ سے سنن ابی داؤد پڑھی۔ شوال ۱۳۰۸ھ سے سید العارفین (حافظ محمد صدیق صاحب مرحوم) کے دوسرے خلیفہ مولانا ابو الحسن تاج محمود صاحب کے پاس امروٹ ضلع سکھر میں چلا گیا۔ انھوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا میرے لئے بمنزلہ باپ کے تھے۔ میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ سکول کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خاں یوسف زئی کی لڑکی سے کرایا۔ میری والدہ کو بلایا وہ میرے پاس آخر وقت تک میرے طرز پر رہیں میرے مطالعہ کے لئے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں اُن کے ظل عاطفت میں ۱۳۱۵ھ تک اطمینان سے مطالعہ کرتا رہا (ذاتی ڈائری از صفحہ ۱۰ تا صفحہ ۱۶)

حالانکہ مولوی عبیداللہ تو تعلیمی جدوجہد میں منہمک اور مشغول تھے میں نے ان کو ادھر سے کھینچکر سیاسیات اور برطانیہ کے خلاف جنگ میں ڈالا۔

الغرض حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو بالکل اپنا ہم خیال اور ہم عمل بنالیا۔ چونکہ ان کے بہت سے احباب اور جان پہچان والے سندھ، پنجاب، سرحد وغیرہ میں تھے، انھوں نے اپنے معتمد علیہ حضرات کو بار بار سفر کر کے استوار کیا اور اس تحریک کا ممبر بنایا۔ نیز دہلی میں بھی رفتہ رفتہ ہم خیال لوگ ہوتے گئے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم، مولانا محمد علی مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم مولانا ابوالکلام وغیرہ حضرات کے لئے بھی مولانا عبیداللہ صاحب ذریعہ بنے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار مولانا عبیداللہ صاحب کو فرنٹیر، یاغستان، سندھ وغیرہ میں بھیجا اور وہاں کے لوگوں سے تعلقات قائم کر کے اس اسکیم کو جاری کیا۔

مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کی ڈائری کا ترتیب دینے والا دیباچہ صفحہ ۳ پر لکھتا ہے :۔

" مولانا عبیداللہ سندھی کا سفرنامہ کابل ایک تاریخی دستاویز ہے اور ان حالات پر مشتمل ہے جو مولانا کو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت کے ایک رکن کی حیثیت سے ۱۹۱۵ء سے لیکر ۱۹۲۲ء تک کابل میں پیش آئے مولانا شیخ الہند کی جماعت کو گذشتہ جنگ عظیم میں وہی حیثیت حاصل تھی جو موجودہ جنگ عظیم میں آزاد ہند فوج اور آزاد ہند حکومت کو حاصل رہی ہے۔ جس طرح موجودہ بعد از جنگ سرگرمیاں دراصل دوران جنگ کی باغیانہ جدوجہد کی ہی ترقی یافتہ صورت ہے اسی طرح خلافت ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۲ء کی سیاسی جدوجہد مولانا شیخ الہند کی جماعت اور ان کے دوسرے شرکار کار کی سرگرمیوں کی ترقی یافتہ صورت ہی تھی۔ اگر آزاد ہند فوج یا آزاد ہند حکومت کے کارناموں کا سہرا سبھاش چندر بوس کے سر ہے تو گذشتہ جنگ عظیم کی سرگرمیوں کا مرکز مولانا شیخ الہند رح تھے۔ مولانا شیخ الہند رح کی سرگرمیاں ۱۹۰۵ء سے شروع ہوئی تھیں اور اس لمبے پروگرام کا جزو تھیں جس کو مولانا عبیداللہ سندھی شاہ ولی اللہ رح کی سیاسی تحریک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ سرگرمیاں جنگ عظیم سے پہلے دو اجزا پر مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ اندرون ہند۔ اور بیرون ہند۔ جنگ عظیم کے دوران میں انہیں سرگرمیوں کو موقع کے مناسب پھیلایا گیا۔ اور ہندوستان میں داخلی بغاوت اور اس پر خارجی حملہ کے ذریعہ انگریزوں کو یہاں سے نکالنے

کی تدبیر سوچی گئی (جیسا کہ ارشاد قرآنی یاایھا الذین امنوا خذوا حذرکم فانفروا ثبات او انفروا جمیعا
میں بتایا گیا ہے) مولانا شیخ الہند نے دوران جنگ میں ان سرگرمیوں کا ایک مرکز کابل میں قائم کرنا چاہا
(کیونکہ تجربہ سے یاغستان[1] جو کہ ۱۹۰۵ء سے مرکز خارجی تھا ناکام ثابت ہوا تھا) اور اس کے لئے مولانا
عبیداللہ سندھی کی نگرانی کو مناسب سمجھکر انہیں کابل جانے کا حکم دیا۔ مولانا عبیداللہ اس سے پہلے
ہندوستانی سرگرمیوں میں مولانا شیخ الہند کا ہاتھ بٹاتے رہے تھے (یاغستانی مرکزیت میں بھی اُن کا
بہت بڑا اور موثر ہاتھ تھا) جمعیۃ الانصار کی سرگرمیوں کا انحصار انہی پر تھا۔ غالباً ایک تجربہ کار
مدبر کی طرح مولانا شیخ الہند نے اپنی بیرونِ ہند سرگرمیوں کی تفصیلات سے مولانا سندھی کو آگاہ
نہیں کیا تھا (ایک ذکی الطبع، نشیب و فراز سے واقف کار سالہا سال سے کام کرنے والے تحریک
کے نصب العین سے اتفاق رکھنے والے شخص کو تفصیلات بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی) مولینا
سندھی وہاں کے کام سے تو کیا اس کی ضرورت سے بھی قطعاً نابلد تھے۔ ان کے اس عظیم الشان اہم
سفر کا حکم ان کو نہایت بے خبری میں غیر متوقع طور پر ملا۔ میرے عزیز مولوی عبدالسبوح صاحب
فاضل دیوبند کی روایت ہے کہ مولانا سندھی نے خود ایک مجلس میں بتایا کہ ایک دن مجھے حضرت
شیخ الہند نے فرمایا "عبیداللہ افغانستان چلو" میں نے پوچھا "حضرت کیوں" اس پر حضرت
شیخ الہند خاموش ہو گئے اور زیادہ کچھ نہیں فرمایا۔ دوسرے دن حضرت نے پھر فرمایا "عبیداللہ
افغانستان چلو" میں نے پھر پوچھا "حضرت کیوں" اس پر خاموش تو ہوئے لیکن چہرہ سے ناراضگی
کے آثار نہایت ہی نمایاں تھے۔ اب میں بڑا پریشان ہوا اور دعائیں مانگنے لگا کہ حضرت ایک
دفعہ پھر مجھے حکم دیں اور میں بلاچون وچرا تسلیم کرلوں۔ خوش قسمتی سے تیسرے دن حضرت نے پھر
فرمایا "عبیداللہ افغانستان چلو" اور میں بڑا مسرور ہوا۔ اور تعمیل حکم کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔
حضرت شیخ الہند سے رخصت ہو کر مولانا (عبیداللہ مرحوم) سندھ گئے اور سفر کے لئے چند رفقاء

---

[1] شمال مغرب کا آزاد پہاڑی علاقہ جو کہ حکومت افغانستان اور حکومت برطانیہ دونوں سے آزاد تھا۔

تیار کئے۔ شیخ عبدالرحیم صاحب (برادر بزرگ مسٹر کرپلانی) کی بیوی اور لڑکیوں نے اپنا تمام زیور بیچ کر ان کے لئے زادراہ مہیا کیا۔ کوئٹہ تک مولانا کو پہونچا کر نقدی ان کے حوالے کی اور مولانا (سندھی) بلوچستان کے راستے افغانستان پہونچے۔ مولانا نے اپنے اس سفر کے حالات بعد میں مکہ معظمہ پہونچکر قلم بند کئے۔" (ذاتی ڈائری مولانا عبیداللہ سندھی صفحہ ۳-۴-۵-۶)

مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کی سیاست میں ابتدا۔

مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم اپنی ڈائری میں صفحہ ۱۸ پر لکھتے ہیں:-

میرا سیاسی میلان

دوران مطالعہ میں مولانا محمد اسماعیل شہید رح کی سوانح عمری دیکھی۔ اسلامی مطالعہ کی ابتدا سے میرا قلبی تعلق مولانا مرحوم (شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ) سے پیدا ہو چکا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے بہت سے واقعات اور حکایات سے آشنا کر دیا تھا۔ مولانا عبدالکریم دیوبندی نے سقوط دہلی کی تاریخ آنکھوں دیکھی بتادی تھی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی صحبت میں انقلاب پنجاب کے تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا۔ پہلے جو کچھ لاہور کے لئے سوچتا تھا اب دہلی کے لئے سوچنے لگا۔ مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لیکر میں نے اپنا مختصر سیاسی پروگرام بنالیا۔ وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی۔ مگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے حجۃ اللہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کر لیا اور اس طرح اپنے خیال کے موافق آہستہ آہستہ کام کرنا شروع کر دیا۔

معاودت دیوبند

۱۳۱۵ھ میں دیوبند پہونچا۔ اپنے مطالعہ کا نمونہ دو رسالے لکھ کر ساتھ لیگیا ایک علم حدیث میں اور دوسرا فقہ حنفی میں۔ حضرت مولانا (شیخ الہند مرحوم) نے دونوں رسالے پسند فرمائے۔ اس دفعہ دس بارہ حدیث کی مشہور کتابوں کے اطراف سُنا کر دوبارہ شفاہاً اجازت حاصل کی۔ بعض مسائل جہاد کے ضمن میں ہماری اس جماعت کا بھی ذکر آیا۔ حضرت مولانا نے اسے بہت پسند فرمایا اور چند اصلاحات کا مشورہ دیکر اسے اتحاد اسلامی کی ایک کڑی بنادیا۔

اسی کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد میرے تعلیمی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز سے وابستہ رہے۔ (ذاتی ڈائری ص ۱۸-۱۹)

جمعیۃ الانصار دیوبند کا ذکر کرتے ہوئے صفحہ ۱۹ کے آخر میں فرماتے ہیں:-

۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سنکر دیوبند رہکر کام کرنے کے لئے حکم دیا۔ اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہے گا۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا اس جمعیۃ کی تحریک تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابو محمد احمد لاہوری اور عزیزی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے۔

نظارۃ المعارف دہلی | حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا

واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کے سامنے دارالعلوم کا بقا و تحفظ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات اور اس کے بعد انگریزی پالیسی اُن کے سامنے تھی۔ انھوں نے مولانا عبید اللہ سندھی ؒ کی سرگرمیوں کو نہ صرف دارالعلوم دیوبند بلکہ عام مسلمانوں کے لئے بھی خطرناک تصور کیا اور اپنے خیالات کے مطابق ضروری سمجھا کہ مولانا سندھی کا تعلق اس مرکز سے نہ رہے۔ اسی زمانہ میں اتفاق سے چند علمی مسئلوں میں مولانا سندھی اور دارالعلوم کے دوسرے علماء کے درمیان اختلاف پیدا کرا دیا گیا۔ اسی اختلاف کو وجہ قرار دیکر مولانا سندھی کو دارالعلوم سے علیحدہ کر دیا گیا۔ چنانچہ روداد کمیٹی کی رپورٹ میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ اس اختلاف نے اگرچہ دارالعلوم کے اساتذہ۔ ملازمین اور عام طلبہ کو حضرت مولانا سندھی سے بہت زیادہ بعید کر دیا تھا۔ لیکن حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز سے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خفیہ آمد و رفت جاری رہی۔ رات کی اندھیریوں میں دیوبند کے باہر ملاقاتیں ہوتی تھیں اور ضروری باتیں انجام دی جاتی تھیں۔

لے حضرت مولانا انور شاہ صاحب مرحوم نے مولانا سندھی کے نام مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں پیغام بھیجا تھا کہ قیام دیوبند کے زمانہ میں غلط فہمی کی وجہ سے میں آپکے لئے تکلیف کا باعث بنا تھا۔ اب میرے دل میں آپکے کوئی رنج نہیں ہے امید ہے کہ آپ بھی معاف فرمائیں گے۔

۱۳۲۱ھ میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔ اس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہند مرحوم کے ساتھ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور نواب وقار الملک مرحوم ایک ہی طرح شریک تھے۔ حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا اسی طرح دہلی پہونچ کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لے آئے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام اور مولانا محمد علی سے ملایا۔ اس طرح دو سال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔

ہجرت کابل | ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے کابل[1] گیا مجھے کوئی مفصل

---

[1] واقعہ یہ پیش آیا کہ ۱۹۱۴ء میں جب جنگ عظیم چھڑ گئی تو حضرت شیخ الہند کی جماعت کے مرکز یاغستان سے جس میں مولانا سیف الرحمٰن صاحب اور حاجی ترنگ زئی صاحب وغیرہ حضرات وہاں موجود تھے اور عرصے سے جماعت کی تنظیمی ضروریات انجام دے رہے تھے ان کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا حکم پہونچا کہ اب سکون سے کام کرنے کا وقت نہیں میدان میں آجانا اور سربکف ہو کر کام شروع کر دینا از بس ضروری ہے۔ مرکزی حضرات نے اصرار کیا کہ آپ یہاں پہونچ جائیں تو آپ کی سرپرستی میں ہم بخوبی اپنی جد و جہد جاری کر سکیں گے۔ مگر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہندستان سے مالی امداد کے فرائض انجام دے رہے تھے اِدھر راستہ بھی جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے بہت زیادہ مخدوش ہو رہا تھا اس لئے اس کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ سرحد میں مجاہدین کے اجتماع کو دیکھ کر انگریزی فوج نے حملہ کر دیا۔ مجاہدین نے نہایت بے جگری کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پلٹنوں کی پلٹنیں انگریزوں کی صاف کر دیں۔ جن کو انگریزوں نے ظاہر نہیں کیا اور بے شمار قوت سرحد پر پہونچا دی۔ سرحدی مجاہدین نے پوری سرگرمی کے ساتھ مقابلہ کر کے انگریزی طاقت کو بے حد نقصان پہونچایا مگر تا کجے جبکہ انگریزی ٹڈی دل فوج، بے شمار سامان رسد، بے نہایت سامان جنگ، اور دوسری طرف یاغستان کے مفلس اور بے یار و مددگار عام باشندے نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا جبکہ مجاہد کے کھانے کا سامان ختم ہو جاتا تو اس کو مورچہ چھوڑ کر رسد کے لئے اپنے دور دراز گاؤں لوٹنا پڑتا تھا۔ کارتوس ختم ہو جاتے تو ان کے حاصل کرنے کے لئے مورچہ خالی کرنا پڑتا تھا اس لئے وہاں سے درخواست آئی کہ جب تک کسی منظم حکومت کی پشت پناہی نہ ہو ہماری شجاعت اور جانبازی بیکار ہے اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ آزاد حکومتوں کی پشت پناہی ضرور حاصل کیجائے بنا بریں مولانا عبید اللہ صاحب کو کابل بھیجا گیا اور ٹرکی سے خود جا کر امداد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔

پروگرام نہیں بتایا گیا تھا اس لئے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان پہونچ گیا۔ روانگی کے وقت دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتلایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے انھوں نے بھی مجھے اپنا نمائندہ بنایا مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہ بتا سکے۔ کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ جس جماعت کے نمائندہ تھے اُس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعلیم حکم کے لئے تیار ہے۔ ان کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا اس کی تعمیل میرے لئے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا داعی بن گیا۔ ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خاں کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ برٹش ایمپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس پر فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریسیڈنٹ ہوں (ذاتی ڈائری صفحہ ۲۰-۲۱-۲۲)

سیاحت روس ۱۹۲۳ء میں ترکی جاتا ہوا سات مہینہ ماسکو میں رہا۔ سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا اس لئے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا۔ اور مطالعہ کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہونچائیں (یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا۔ کامریڈ لینن اس وقت ایسا بیمار تھا کہ اپنے قدیمی دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا) میرے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی ایک شاخ ہے اس زمانہ کے لادینی حملہ سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔ میں اس کامیابی پر اول انڈین نیشنل کانگریس دوم ہندوستانی

نوجوان رفقا، جن میں ہندو بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی سوشلسٹ بھی اور نیشنلسٹ بھی، سوم سوویٹ روس کا ہمیشہ ممنون اور شکر گذار رہوں گا۔ اگر ان تین طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصص اور امتیاز کو کبھی حاصل نہ کر سکتا۔ فللّٰہ الحمد وحدہٗ۔

جدید ترکیا ۱۹۲۳ء میں انقرہ (انگورا) پہونچا۔ میرے لئے سفیر ترکیا متعین ماسکو اور وزارت خارجہ ماسکو نے ملک سفر کا راستہ متعین کر دیا تھا اور برطانوی کارندے اس کا پتہ نہ لگا سکے (یہ غلط ہے کہ میں استنبول اس زمانہ میں پہونچا جبکہ برطانیہ و فرانس اس پر قابض تھے) تخمیناً تین سال ترکی میں رہا وہاں میں نے تحریک اتحاد اسلام کا تاریخی مطالعہ کیا۔ مجھے مستقبل قریب میں اس کا کوئی مرکز نظر نہیں آیا۔ اس لئے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو انڈین نیشنل کانگریس میں داخل کرنا ضروری سمجھا اور کانگریس میں اپنے اصول کی ایک پارٹی کا پروگرام چھاپ دیا جس سے میری مذہبی تحریک ہر ایک مخالف انقلاب سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

ہمارا پروگرام یورپ کو اس طرح اسلام کا تعارف کرانے میں میرا خیال ہے کہ میں اپنے اُستاذ الاساتذہ اور اپنے امام مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی کی ایک قلبی خواہش کو عملی جامہ پہناتا ہوں اس پروگرام کو ترکی پریس سے شائع کرانے کے لئے انقرہ گورنمنٹ کی اجازت حاصل کی گئی۔ وزارت خارجہ نے دو مختلف مترجموں سے ترجمہ کرا کے جب تک اس کا حرف حرف نہیں پڑھ لیا اجازت نہیں دی۔ بعض ہندو دوست اردو نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ان کی سہولت کے لئے میں نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر دیا ہے۔ استنبول میں لالہ لاجپت رائے سے تبادلہ افکار ہوا۔ اور ایسا ہی ڈاکٹر انصاری سے اچھی طرح باتیں ہوئیں۔ ہمارے بزرگ نہ اسے مان سکتے تھے نہ اس کا اچھا بدل بتلا سکتے ہیں اور کوشش کریں گے کہ ہمیں ہزار دو ہزار برس پہلے زمانہ میں لا کھڑا کر دیں۔ البتہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک آدھ فقرہ اس کی پسندیدگی پر لکھا ہے وہ میرے لئے باعث سرور ہے۔

میں نے اپنے پروگرام میں عدم تشدد کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس میں میں مہاتما گاندھی کا ممنون ہوں۔ میں عدم تشدد کو اخلاقی اصول مانتا تھا لیکن اس بنا پر پولیٹیکل پروگرام کی تشکیل اور اس کی

اہمیت میں نے گاندھی جی سے سیکھی ہے۔ گاندھی جی نے مجھے حضرت مسیح علیہ السّلام کی تعلیم یاد دلادی۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام کے پہلے دور میں اس اصول سیاسی پر عمل ہوتا رہا ہے۔ کلمة الحکمة ضالة المومن حیث وجدها فھو احق بھا (ذاتی ڈائری صفحہ ۲۴)

مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم کے افغانستان پہونچنے اور ہندوستان کی آزادی اور انگریزوں کے ہندوستان سے نکالنے کے کارنامے

۱۹۱۴ء میں جبکہ پہلی عمومی جنگ کا برطانیہ اور اس کے حلفاء اعلان کر کے ہر قسم کے سامان اور تحفظات عمل میں لارہے تھے، جبکہ ٹرکی اور جرمنی وغیرہ اتحاد اور اشتراک کی کوششوں کو عملی جامہ پہنارہے تھے۔ جبکہ ہندوستان میں ہر سیاسی اور نیم سیاسی اشخاص اور جماعتوں کو حکومت نہایت کڑی اور مشتبہ نظر سے دیکھ رہی تھی، جبکہ سیاسی اشخاص کی پکڑ دھکڑ قید اور نظر بندی بڑے پیمانہ پر جاری کیجارہی تھی جبکہ مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا ابوالکلام وغیرہ حضرات کو یکے بعد دیگرے گرفتار کیا جارہا تھا جبکہ ہر سیاسی دماغ ہولناک خطرات محسوس کرتا ہوا اپنی جگہ پر تقریباً دم بخود تھا۔ مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم کے پاس حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا حکم پہونچتا ہے کہ میں حجاز جاتا ہوں تم کابل پہونچو جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ ان کو کوئی مفصل پروگرام بتایا نہیں گیا تھا مولانا عبید اللہ صاحب دہلی سے روانہ ہو کر سندھ پہونچتے ہیں اور سی آئی ڈی کو غافل کرنے کے لئے ایک غیر معروف گاؤں میں نہایت سکون کی حالت میں اقامت گزیں ہو جاتے ہیں۔ خفیہ پولیس تین چار مہینہ کی طویل مدت میں اُن سے کسی قسم کی سیاسی سرگرمی محسوس نہیں کرتی اس لئے مطمئن ہو جاتی ہے مگر مولانا عبید اللہ صاحب اور اُن کے رفقاء اپنی جدوجہد رازدارانہ میں غافل نہیں ہیں۔ ایک دن مع شیخ عبدالرحیم صاحب سندھی حیدرآبادی نکل پڑتے ہیں۔ سانڈنیوں پر بلوچستان کے ریگستان اور پہاڑی دروں میں سفر ہے۔ برطانوی خفیہ پولیس کے تعاقب کے خوف سے نہ صرف عام شاہراہوں کو چھوڑ گیا اور غیر معروف راستے اختیار کئے گئے ہیں بلکہ لگاتار سفر پر سفر اور کوچ پر کوچ ہوتا رہا ہے تا اینکہ بہت طویل مسافت جلد سے جلد قطع کرلی گئی اور بہت تھوڑی مدت میں برطانوی حدود سے نکل کر حدود افغانستان میں داخل ہو گئے۔ مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم اپنی ذاتی ڈائری میں صفحہ ۶۳ پر لکھتے ہیں:۔ "۱۳۳۳ھ موافق اگست ۱۹۱۵ء کو میں کابل کی طرف روانہ ہوا اس سے

تخمیناً چار مہینے پہلے ہندوستان چھوڑنے کا ارادہ مصمم کر چکا تھا۔ اپریل ۱۹۱۵ء کے شروع میں دلی سے سندھ چلا آیا۔ دو چار مہینے مختلف مقامات پر گذارے۔ دوستوں سے آخری ملاقات اور ضمناً راستے کے خطرات سے محفوظ رہنے کی تدابیر میں مصروف رہا۔ بفضلہ تعالےٰ بلوچستان سے گذر کر ۱۵ اگست کی نماز مغرب سرحد افغانستان میں پڑھی۔ اور توکلاً علی اللہ بغیر کسی پاسپورٹ حاصل کرنے کے افغانستان میں داخل ہوا۔ جس حصۂ ملک میں ہم داخل ہوئے وہ نُور ایک کا علاقہ تھا۔ وہاں کے حاکم سے ملا۔ پاسپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے انہیں شکوک پیدا ہونے لگے مگر ہماری درخواست سنکر کہ آپ ہمیں سرکاری حفاظت سے قندہار پہونچا دیں وہاں ہم حکومت کو مطمئن کر دیں گے۔ چند سوالات پوچھے اُن کا جواب اُن کے رفع شبہات کے لئے کافی تھا۔ اس لئے ہمیں حکومت کا معزز مہمان قرار دیا اور ہمارے قندہار پہونچانے کا بھی انتظام کر دیا۔ قندہار میں ہمارے بعض آشنا مل گئے اُن کا حکومت میں اچھا رسوخ تھا اور ہمیں اچھی طرح جانتے تھے اس لئے نائب الحکومت نے چند روز نہایت احترام سے مہمان رکھا۔ فقط کابل کے سفر کا نہیں بلکہ چند روز کابل میں رہنے کا بھی انتظام کر دیا۔ اسی طرح ہم ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہونچے۔ اتفاقات زمانہ میں یہ بھی ایک عجیب بات سمجھی جائے گی کہ اسی تاریخ ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو ہمیں کابل سے سفر کرنے کا پاسپورٹ مل گیا (یعنی سات برس کابل میں اقامت کرنے کے بعد) اگرچہ ہماری روانگی ۲۲۔ اکتوبر کو عمل میں آئی۔ ان سات سال اور سات دن میں جو کچھ ہم نے دیکھا اس کا اکثر حصہ اس قابل نہیں کہ عام طور پر کتابوں میں لکھا جائے۔ لیکن کسی قدر واقعات لکھنے کو ہمارا جی چاہتا ہے۔ (ذاتی ڈائری صفحہ ۶۳-۶۴-۶۶)

صفحہ ۷۰، ذاتی ڈائری میں مولانا عبید اللہ صاحب موصوف مرحوم لکھتے ہیں:- " ہم نے جس حالت میں ۱۳۲۶ھ (۱۹۱۰ء) سے ہند میں زندگی بسر کی اس سے حکومت اچھی طرح واقف تھی۔ ہمارا نصب العین کسی سے مخفی نہ تھا مگر ہمارا کام اتنا تیز نہیں رہا تھا جس سے حکومت ہمیں معطل کرنا ضروری سمجھتی۔ ہماری محنت میں جو لوگ سی آئی ڈی میں مقرر ہوئے تھے اُن سے ہمارا برتاؤ اچھا رہا۔ اس کا بھی ہماری آزادی میں کافی اثر ہے۔ کابل جانے کا فیصلہ ہم نے محض اپنے اُستاد، مُربّی، مرشد حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہ کو راضی رکھنے کے لئے کیا تھا۔ ہم اپنی حیثیت وطاقت سے واقف تھے۔ ہم نے بڑی بڑی امیدیں تصور کر کے کبھی مسرور ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ہم تصور نہیں کر سکتے تھے کہ کابل پہونچکر ایک سال سے کم عرصہ میں ہم اپنا مافی الضمیر کسی ذمہ دار

افسر سے کہہ سکیں گے۔ اگر خوش ہوتے تو صرف اس پر کہ خدا نے ہمیں اپنے بزرگ کا حکم مانکر ملک چھوڑنے کی توفیق عطا فرمائی۔ حضرت مولانا کا ذکر ہم ہر ایک دوست سے نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے بعض دوستوں سے جو اس خیال کے موئد تھے کبھی ہم اُن کا نام ذکر کر دیتے تھے۔ اپنا طبعی رجحان ایک مسلم حکومت میں جا بسنے کا ذرا تفصیل سے سناتے تھے۔ اسی طرح پر ہم خاص دوستوں سے رخصت ہوئے۔ ہماری طرح کے آدمیوں کو ہندوستان کے حکمراں کابل میں کس قدر بدنام کرتے ہیں ہم اس سے واقف تھے۔ پہلے سے چند ہندوستانی ایک سیاسی سازش کے الزام میں محبوس ہیں اس کا جو اثر ہماری پوزیشن پر پڑتا ہے وہ ہمارے ساتھ ہے۔ ان حالات میں جس قدر احتیاط کرنی چاہیئے ہم نے اس کا کافی انتظام کر دیا تھا۔ قندھار تک تو ہم بلا پاسپورٹ حکومت کی نگرانی میں پہونچ گئے اس وقت سردار محمد یونس خاں قندھار کے نائب الحکومت تھے جو سردار اعتماد الدولہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ قندھار میں ہمیں دو شخص ایسے ملے جو نائب الحکومت سے اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب ہمیں سندھ میں مل چکے تھے۔ اس نائب الحکومت سے ہماری اچھی ملاقاتیں ہوئیں۔ بعض علمی مسائل کا تذکرہ ہوتا رہا اگرچہ مثنوی مولانا روم سے ہمارا اشتغال بہت کم رہا ہے لیکن بفضلہ تعالےٰ اس امتحان میں کامیاب رہے نائب الحکومت نے ہمیں خاص راہ داری دی۔ اور اول درجہ کے سفر کا انتظام کر دیا۔ اپنے پرائیویٹ دوستوں کے نام تعارفی خطوط بھی دیئے۔ غزنی سے ہم نے سردار محمود طرزی کو اطلاع بھیجدی تھی اس لئے اُن کا آدمی ہمیں شیخ محمد ابراہیم کے یہاں سب سے پہلے خوش آمدید کہنے کے لئے آیا وہ نوجوان سردار عبد الہادی خاں تھا۔ شیخ محمد ابراہیم کے مکان کے قریب ایک کرایہ کے مکان میں اُترے اور اُن کے توسط سے اُن سب لوگوں سے مل گئے جن کے لئے ہمارے پاس خطوط تھے۔ سردار سپہ سالار نے ہمیں ہر طرح امداد دینے کا یقین دلایا اور ہمارے قیام کابل میں جو سرکاری مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں اُن کے زائل کرنے پر اپنی تمام توجہ مبذول رکھی۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ ہم بظاہر سپہ سالار سے اجنبی رہیں اور اس پر ہم نے عمل کیا سردار سپہ سالار کے خاندان کا ہمارے مشائخ سے خاص رابطہ چلا آتا ہے اس لئے اُن کا ہر قول و فعل، خلاص و محبت پر مبنی تھا۔ ترکی کے شریک جنگ ہونے کا اثر سردار محمود خاں طرزی پر نسبتاً بہت زیادہ تھا اس لئے ہمارا رابطہ اُن سے زیادہ ہوتا گیا۔ انہوں نے ہمیں سردار معین السلطنت (سردار عنایت اللہ خاں پسر سردا[ر]

حبیب اللہ خاں امیر افغانستان) سے ملایا اور ایک دن سردار کی معیت میں کھانے پر بلایا۔ اس سے ہمارا ذکر سلطنت کے تمام سرداروں تک پہونچ گیا۔ اس کھانے کے بعد ہم نے ایک دن چھری کانٹے کے استعمال کرنے کی مشق میں صرف کیا۔ اور بے تکلف دعوتوں میں شریک ہوتے رہے۔ سلطنت افغانیہ میں شرعی فیصلوں کا ایک محکمہ ہے جسے میزان التحقیقات الشرعیہ کہتے ہیں۔ اس محکمہ کا رئیس قاضی عبدالرزاق خاں ہمارے دارالعلوم دیوبند کا تعلیم یافتہ ہے۔ حدیث حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی (قدس اللہ سرہ العزیز) سے پڑھی تھی۔ وہ سردار نائب السلطنت (سردار نصر اللہ خان) سے خاص طور پر وابستہ ہیں جیسے سردار طرزی معین السلطنت سے اور سردار سپہ سالار اعلیٰ حضرت سے، قاضی عبدالرزاق خاں صاحب سے ہم چند روز بعد ملے۔ پچھلے علمی دوستوں کی یاد تازہ ہوتی رہی۔ ایک عجیب بات وہاں یہ نظر آئی کہ ہمارے اس سفر کے متعلق خاص طور پر اُن کے پاس اطلاعات موجود تھیں۔ انھیں جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ میرا ہی نام عبید اللہ ہے تو بہت مسرور ہوئے۔

سردار نائب السلطنت کے حضور میں باریابی

حاجی عبدالرزاق خاں چاہتے تھے کہ ہمیں سردار نائب السلطنت (امیر نصر اللہ خاں) سے ملائیں۔ معلوم ہوا کہ اس قسم کے غیر رسمی پولیٹیکل معاملات سردار نائب السلطنت سے تعلق رکھتے تھے فقط رسمی معاملات اعلیٰ حضرت کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ مگر ہم نے وہاں کے حالات کے مطابق انہیں مشورہ دیا کہ ہماری ملاقات معین السلطنت (سردار عنایت اللہ خاں) کے توسط سے ہونی چاہیئے۔ اسے انھوں نے پسند کیا اور ہم سے ایک مختصر عریضہ لکھوایا۔ جس میں ہم نے اپنے مقاصد کا بالاجمال ذکر کیا۔ اس کے ایک روز بعد مجھے سردار معین السلطنت اپنے ساتھ لے گئے۔ سردار نائب السلطنت ہم دونوں سے تخلیہ میں ملے، دو گھنٹہ تک مفصل حالات سُنے۔ سوالات کئے۔ جوابات سے مطمئن ہوئے یہ ایک طرح کا ہمارا امتحان تھا جس میں ہم بفضل خداوند تعالےٰ اچھے کامیاب رہے۔ ہمیں محسوس ہوا کہ سردار نائب السلطنت ہماری گفتگو سے محظوظ ہوئے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اس مذاکرہ کا خلاصہ فارسی میں لکھ کر ہم اُن کے سامنے پیش کریں میں تاریخ اسلامی کا عموماً مطالعہ کرتا رہا ہوں اور ہندوستانی تاریخ سلطان عالمگیر اور اس کے بعد کا دور میرا خاص مضمون ہے۔ کیونکہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کی علمی و سیاسی تحریکیں یہاں سے شروع

ہوتی ہیں لیکن یورپین طریقہ پر سیاست کا مطالعہ مجھ کو زیادہ میسّر نہ ہوا۔ اردو، فارسی، عربی میں اس نئے طرز کو سمجھنے کے لئے بہت کم کتابیں ملتی ہیں۔ اس لئے ایک عرصہ سے سیاسیات سے واقف تعلیم یافتہ کا اشتراک اپنے لئے ضروری سمجھتا ہوں۔ شیخ محمد ابراہیم نے تاریخ اقتصادیات میں بمبئی یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ کابل آنے سے پہلے ہم نے سیاسی اشتراک اُن سے پیدا کیا تھا اور وہ مجھ سے پہلے پہونچکر حبیبیہ اسکول میں ملازم ہو چکے تھے اس زمانہ میں فقط وہ میرے مشیر تھے۔ میں نے بہت احتیاط سے اس پندرہ دن میں سات آٹھ صفحے لکھے اور شیخ محمد ابراہیم کو سنائے انھوں نے بہت مفید اضافے کئے اور ہم نے مضمون سردار طرزی اور معین السلطنت کے معرفت سردار نائب السلطنت کے پاس بھیجدیا۔ سردار نائب السلطنت ہمارے طرز تحریر سے سمجھ گئے کہ جب تک ہمارے معاملہ کا فیصلہ خود اعلیٰ حضرت (امیر حبیب اللہ خاں) نہ کریں گے ہم اُسے قابل اطمینان نہیں سمجھتے اُنھوں نے شاید ایک ماہ بعد ہمیں اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش کرنے کا انتظام کیا۔

اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں شہید کے حضور میں باریابی

ایک دن سردار نائب السلطنت نے مجھے اپنے قصر زین العمارۃ میں بلایا اور عصر کے بعد وہیں اعلیٰحضرت تشریف لائے۔ اعلیٰ حضرت اور سردار نائب السلطنت کے سوا اس کمرے میں اور کوئی آدمی نہ تھا جس میں مجھے شرف باریابی حاصل ہوا۔ اس مجلس میں فقط دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز تھی۔ ایک پر اعلیٰ حضرت جلوہ فرما تھے اور دوسری پر مجھے بیٹھنے کا حکم نہایت شفقت و محبت سے دیا۔ سردار نائب السلطنت نے میرا عریضہ اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش کیا۔ آدھ گھنٹہ تک اعلیٰ حضرت اُسے غور سے ملاحظہ فرماتے رہے۔ آخر میں دعائیہ فقرات سے بہت متاثر ہوئے اور مختصر الفاظ میں پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کام کرنے کے لئے زبانی ایک حکم ارشاد فرمایا جس کی تعمیل میں اپنے امکان بھر آخر تک کرتا رہا۔ مجھے یہاں صرف صراحت اعتراف کی ضرورت ہے کہ اگر شیخ مغفور (حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) کا صحیح مشورہ مجھے نہ ملتا تو میری بات اس قدر موثر نہ ہوتی اور میں اپنے آپ کو بہ حیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے دربار میں پیش نہ کرتا۔ بلکہ ایک مسلم کی صورت میں متعارف ہوتا اور چند دنوں بعد مجھے مسلک ہندوستانیت بنانے کی یقیناً ضرورت پیش آتی اور میں اپنے درجہ سے بہت کچھ چھوٹا سمجھا جاتا۔ اعلیٰ حضرت نے میری عزت افزائی سے یقیناً ہندوؤں پر احسان فرمایا لیکن نہ اس لئے کہ میں نے اپنے آپ کو ہندوستان کا وضعی نمائندہ بنالیا تھا۔ بلکہ اس میں قابل عزت یہ بات سمجھی گئی کہ اس

میں جو کچھ لکھا گیا اس میں مبالغہ سے قطعی پرہیز کیا گیا ۔ اعلیٰ حضرت کو جس قدر بذات خود واقفیت تھی ہمارا بیان اُس کے قریب قریب رہا ۔ ایک محکوم ملت میں ایک متوسط طبقہ کا آدمی اور پھر وہ بھی مذہبی عالموں میں صحیح معلومات کا مالک ہے اور ایسے نازک موقع پر صداقت کا خیال رکھتا ہے ۔ اعلیٰ حضرت کے لئے اور ان کے سردار نائب السلطنت کے لئے واقعی ایک نادر اور موثر مثال تھی ۔ میں اسے اللہ تعالےٰ عز و جل کی ایک خاص رحمت سمجھتا ہوں جس میں حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہٗ کی دعا اور ان کی تعمیل حکم کی برکت کا بہت کچھ دخل ہے ۔

ہندوستانی مشن سے مُلاقات

حرب عمومی کے شروع ہونے پر جس قدر ہندوستانی "آزادی سوز یورپ" میں موجود تھے ، سب برلن میں جمع ہو گئے تھے اور انھوں نے جرمن دفتر خارجہ کے تحت ایک انڈین نیشنل پارٹی قائم کی تھی ۔ ہردیال اور مولوی برکت اللہ صاحب وغیرہ اس میں شامل تھے ۔ اس انڈین نیشنل پارٹی کے زیر اہتمام راجہ مہندر پرتاپ اور اُس کے رفقا کو جن میں مولوی برکت اللہ صاحب بھی شامل تھے جلد ترکی اور جرمنی افسروں کے ساتھ ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا ۔ مشن ہم سے ایک ہفتہ پہلے کابل پہونچ چکا تھا اور اُن کی مفصل ملاقاتیں ختم ہو چکی تھیں ۔ جب ہم اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش ہوئے اُس کے بعد ہم کو مشن کے ہندوستانی ممبروں سے ملنے کی اجازت ہو گئی اور ہم اُن سے اچھی طرح مل سکے ۔ معلوم ہوا کہ ہندوستانی معاملات میں ہمارے اور اُن کے نقطۂ نظر میں کسی قدر فرق ہے ۔ اس طرح مشن کے جرمن ممبروں سے ہماری ملاقاتیں ہوئیں اور اپنے نقطۂ نظر کے منوانے کے لئے ہم ایک طویل زمانے تک تبادلۂ خیالات کرتے رہے ۔

اسی زمانہ میں ہمارا ترجمان ہندوستانی نوجوانان مہاجرین میں سے ایک نوجوان تھا جسے ان لوگوں نے اپنا پریسیڈنٹ منتخب کر دیا تھا ۔ اس کا نام عبدالباری تھا ۔ وہ لاہور گورنمنٹ کالج سے ایم اے پڑھتا ہوا چلا آیا ۔ شیخ محمد ابراہیم چونکہ حبیبیہ اسکول میں ملازم تھے اس لئے ان کو سیاسی مجلس میں عام طور پر شامل ہونے کے مواقع کم ملتے تھے ۔ ہماری ملاقات سے پہلے مشن کے ہندوستانی اور جرمنی ممبروں میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا ۔ ہمارے ہندوستانی دوستوں کے نظریات یورپین سائیکولوجی کے لئے نہایت دلفریب تھے ۔ ترک اور جرمن جب تک برلن اور استنبول میں رہے اپنے ان نظریات کی بہت قدر کرتے رہے لیکن کابل میں تو عملی کارروائی کے لئے آئے تھے ۔ اس مشن کے پریذیڈنٹ

یا مولانا برکت اللہ کوئی زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو عمر بھر افغانستان، صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ بلوچستان کا نقشہ دیکھنے کا زیادہ موقعہ نہیں ملا تھا۔ مشن کے ممبر شروع میں ہم سے اخلاص سے نہیں ملے۔ مگر بتدریج ان کا خیال ہمارے متعلق اچھا ہوتا گیا۔ ہماری ساری عمر شمال مغربی ہند میں گذری اور ہم اسی ادھیڑ بن میں ہر کہ دمہ سے ملتے رہے۔ ہمارے پاس بعض ایسی معلومات بھی تھیں جو کابل میں فوجی نقطہ نظر سے بہت قیمتی سمجھی جاتی ہیں۔ اس طرح ہماری رائے غالب ہونے لگی۔ اس اختلاف خیالات سے قطع نظر ہم نے ہندوستانی ممبروں کے احترام و اعزاز میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ اس لئے روز بروز ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے۔

(ذاتی ڈائری از صفحہ ۷۶ تا ۸۴)

مشن کے ہندو ممبروں سے تبادلہ خیالات

راجہ صاحب سے تبادلہ خیالات کرنے پر ہمیں ایک ناگوار حقیقت کا علم ہوا۔ ہم ہندوستان میں بھی اس سے کسی قدر واقف ہو چکے تھے مگر اس کی اہمیت کا صحیح احساس نہیں ہوا تھا۔ اب ہمیں اس کے اثر اور وسعت کا حقیقی علم حاصل ہوا۔ اس مسئلہ میں ہمارے تبادلات سمجھنے میں ناظرین کی آسانی کے لئے ہم کسی قدر گذشتہ واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔

میری طالب علمی کا پہلا زمانہ تو ایسا ہے کہ اس وقت میں سوائے اسلام اور مسلمانوں کے اور کسی چیز کی ہستی نہیں مانتا تھا۔ لیکن جب مطالعہ پختہ ہوا تو مجھے ہندوستانیت اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال اور اس کی ضرورت زور سے محسوس ہونے لگی۔ ہاں عملی حصہ لینے کے لئے مجھے اس زمانہ میں کوئی موقعہ نہیں ملا۔ اس کے بعد جب مسلمانوں کی مرکزی جماعتوں سے میرا تعارف ہوا تو میں نے مناسب طور پر اپنے بزرگوں اور دوستوں کو اس طرف توجہ دلانی شروع کی اور میری مسرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے امید سے زیادہ کامیابی نظر آئی۔

اس ضروری مسئلہ کے محرکات

میں جس وقت ناظم جمعیۃ الانصار تھا میرے ایک سندھی دوست پروفیسر جیوت رام کرپلانی دیوبند تشریف لائے وہ دارالعلوم دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک ہفتہ تک میرے مہمان رہے۔ انھیں پوری آزادی سے دارالعلوم کی سیر کرائی۔ آخر میں وہ دارالعلوم کی بہت تعریف کرتے تھے کہ ہند کے مستقبل میں جو چیزیں کارآمد ہو سکتی ہیں وہ اسی قسم کے کام ہیں اور دارالعلوم کی خدمات قابل تعریف اہمیت رکھتی ہیں اس پر میں نے سوال کیا کہئے پروفیسر صاحب ہماری ضرورت ہے

یا نہیں اس کا جواب تھا بالکل نہیں آپ اگر ضرورت سمجھیں تو ہمارے ساتھ ہو جائیں ورنہ منہ ہمارا ہے اور ہم اپنا کام خود کریں گے" اس جواب کا اثر مجھ پر ظاہر ہے کہ اچھا نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے مجھے بیقرار کر دیا چند روز بعد ہمارے موتمر الانصار کا اجلاس مراد آباد میں قرار پایا بحیثیت ناظم موتمر الانصار مجھے شرفاء مراد آباد سے ملاقات کے مواقع ملے۔ بفضلہ تعالیٰ ہمارا جلسہ کامیاب رہا۔ علی گڑھ کے پروفیسر جلال الدین صاحب (جو ہمارے کاموں کو ابتداء سے اچھی طرح دیکھ رہے تھے) سے میں نے موتمر کی نسبت سوال کیا انھوں نے بہت تعریف کی اس پر میں نے ان سے وہی سوال دہرایا۔ "کیوں ہماری ضرورت ہے یا نہیں" پروفیسر نے نہایت محبت آمیز متانت سے جواب دیا۔ آپ کے سوا تنہا ہم کچھ نہیں ہیں" اس جواب کا مجھ پر گہرا اثر ہوا اور میں نے دل میں اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ اپنے دوستوں کو سخت ملامت کی کہ تعلیم یافتہ جماعت سے ہم کیوں کھنچ رہے ہیں۔ ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد کا پروگرام میرے سامنے آگیا، اس کی پہلی کڑی قدیم وجدید نوجوانوں کا سمجھوتہ ہونا چاہیئے پھر دوسرا قدم اٹھانا اس قدر مشکل نہیں رہے گا۔

تمہیدی مقدمات کی اپیل

پرانے اور نئے خیال کے مسلمانوں میں محل نزاع کیا ہے۔ میں اچھی طرح سے جانتا تھا۔ علماء برداشت نہیں کر سکتے کہ عام مسلمانوں کی رہنمائی کا منصب ان کے ہاتھ سے نکلے۔ ادہر تعلیم یافتہ طبقہ لیڈرشپ کا مدعی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ علماء کی امامت میں ہم کوئی کام نہیں کر سکیں گے۔ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ اہل علم لیڈرشپ کے ادعا سے دست بردار ہو جائیں اور تعلیم یافتہ لوگوں میں عام طور پر احساس پیدا کر دیا جائے کہ وہ اہل علم کی شمولیت کی صحیح قیمت کو نہ بھولیں۔ میرے استاد حضرت مولانا شیخ الہند تغمدہ اللہ بغفرانہ نے میرے خیال کی اس طرح داد دی تھی کہ وہ پہلے سے اس کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب مولانا محمد علی مرحوم گورنر یوپی کی آمد پر دیوبند تشریف لائے تو حضرت مولانا خود ان سے ملنے کے لئے ان کے قیام گاہ پر گئے۔ اسی وقت سے ہمارے امام نے مولانا محمد علی مرحوم کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔ اس وقت دیوبند میں یہ تھا اور نادان لوگوں نے حضرت کے اس تقدم پر نکتہ چینی بھی کی تھی۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا خدا بھلا کرے جو علماء دیوبند اور تعلیم یافتگان علیگڈھ کے ملانے میں ایک مضبوط کڑی ثابت ہوئے۔ وہ جب ہلال احمر کا وفد لے کر گئے تو اس میں علماء دیوبند بھی شریک

ہوئے اور اسی کام کو مکمل کرنے والے ہمارے مسیح الملک حکیم اجمل خاں مغفور تھے میں جب دہلی آیا اور مسیح الملک کی سرپرستی میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی تو اس میں نواب وقار الملک اور حضرت شیخ الہند دونوں ایک درجہ پر شریک تھے۔

ہندو مسلم اتحاد

اس مرحلہ کے طے ہونے پر مسیح الملک اور ڈاکٹر انصاری نے دہلی میں اس کام کو عملاً شروع کر دیا اور اس میں اعلیٰ درجہ کی کامیابی ہوئی اور مولانا محمد علی قومی لیڈر بن گئے۔ میں ہندو دوستوں کے خیالات جانچتا رہا۔ ان میں بہت بڑا انقلاب پیدا ہو گیا۔ پروفیسر کرپلانی جب دوسری مرتبہ دہلی تشریف لائے تو ان کی ذہنیت اور تھی۔ انھوں نے مجھے دعوت دی کہ اگر میں چاہوں تو تمام ہندوستان کا مطالعہ کر سکتا ہوں اور وہ میرے لئے انتظام کر دیں گے۔ ان واقعات سے میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اس قسم کی غلط فہمی ہندوؤں میں کافی طرح موجود ہے لیکن وہ ناقابل علاج نہیں۔ تھوڑی توجہ سے دور ہو سکتی ہے۔ میں یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ تمام یورپ اور امریکہ میں یہ پروپیگنڈا پھیل چکا ہے اور ہمارے ہندو بھائی جب ہندوستان کا تعارف کراتے ہیں تو یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ ہندوستانی ملاقات کے وقت رام رام کیا کرتے ہیں۔

ہندوؤں کی ایک غلط فہمی

تاریخ پڑھ کر ہندو نوجوان یہ نظریہ قائم کر لیتے ہیں کہ ہندو اصلی ہندوستانی ہے اور مسلمان انگریزوں کی طرح ایک بیرونی فاتح ہے۔ اس لئے جب وہ ہند کو بیرونی لوگوں سے متعارف کرنے کا خیال کرتے ہیں تو اس میں مسلمانوں کو بیرونی فرض کر لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان شرفا کی ایک بڑی جماعت عرب و عجم کے بزرگوں کی اولاد ہے اور ان کی زبان سے بھی بعض اوقات ایسے کلمات نکل جاتے ہیں جس سے ہندوستانی نوجوانوں کو اپنے تخیل کی سند مل جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ناظرین میری شخصیت کے متعلق ناواقف نہ ہوں گے کہ میں ایک ہندو گھر میں پیدا ہوا اور ہندو نومسلم کی کتاب تحفۃ الہند میں نے دیکھی جو ایک برہمن کے واسطے سے مجھے ملی تھی۔ اس کے مطالعہ کے بعد اسلام کی حقانیت میں یقین کر کے سولہ برس کی عمر میں مسلمان ہوا اور بیتس سال کی عمر میں علوم دینیہ تکمیل کر کے دارالعلوم دیوبند سے سند فضیلت حاصل کی۔ میں علمی تحقیقات سے اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی عام آبادی خصوصاً طبقہ سافلہ کاشتکار، مزدور ہندو بزرگوں کی اولاد ہے جو اسلام قبول کر چکے ہیں

اور جو بزرگ فاتحانہ ہند میں داخل ہوئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے اور جو خاندان اس نئے مذہب اور تمدن کو ہند میں قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے ان کی اولاد اول درجہ کی ہندوستانی ہے۔ ہندو قوموں کا نو مسلم اور اسلامی فاتحین کی اولاد میں فرق کرنا ایک نہایت حماقت آمیز جہالت ہے۔ ہمارے بھائیوں کو بہت جلد اس غلط فہمی سے پاک ہو جانا چاہیئے۔ میرا یقین ہے کہ اسلام سے بہتر انسانیت کے لئے کوئی مذہب، کوئی فلسفہ، کوئی تمدن، کوئی قانون میسر نہیں آسکتا۔ اس لئے ہندوستانیوں کو اسے عزت سے مان لینا چاہیئے۔ لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکتا تو ہم نو مسلم کیا ایسے بھی گئے گذرے ہو گئے کہ اپنی آبادی کے متناسب اپنے مذہب کی عزت تمام بھائیوں سے نہ منوالیں۔ ایک ہندوستانی اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے آپ کو زیادہ بہادر، زیادہ شریف تصور کرتا ہے۔

کانگریس کے ایک لیڈر کی رائے

مسلم لیگ کا ڈیپوٹیشن جب شملہ گیا تو مسٹر گوکھلے نے مسلمانوں کو اپنی تعداد سے زیادہ نمائندگی مانگنے پر ایک آرٹیکل لکھا تھا میں نے اس کا ترجمہ پڑھا ہے۔ اس سے میرے دل میں یہ بات ٹھیک طور پر بیٹھ گئی کہ واقعی انصاف کے رو سے ہمیں اس قدر نمائندگی پر راضی ہونا چاہیئے جس قدر شری یت کرشن گوپال گوکھلے ہمارے لئے مانتے ہیں۔ میں نے راجہ صاحب سے اس کا ذکر کیا کہ جن صوبوں میں مسلم آبادی زیادہ ہے وہاں کوئی کارروائی مسلمانوں کے فیصلہ کے بغیر نہ ہونا چاہیئے۔ اس طرح یہ مسئلہ بیرونی لوگوں کے سامنے نہیں آیا تھا بلکہ سارے بر اعظم کو اکائی مان کر میجارٹی کے فیصلہ کو وہ لوگ ہندوستانی فیصلہ جانتے ہیں۔ انھوں نے ہماری مدلل بات سنی اور اعداد و شمار میں غور کیا تو ان کی رائے ہمارے موافق ہو گئی۔ جرمن کیپٹن نے کہا کہ ہماری گورنمنٹ نے ایک دفعہ غلطی کی ہے۔ دوسری دفعہ نہیں کرے گی۔

راجہ مہندر پرتاب

ہمارے راجہ صاحب ہیومنیٹرین HUMANI - TARIAN ہیں اور اسی کا پروپیگنڈا کرتے ہیں لیکن اعلیٰ انسانیت کا معیار ان کے ذہن میں ایک کٹر سیاسی سے اونچا نہیں ہے ان کے نزدیک ہندوستان میں (میرے ابتدائی مطالعہ کے مقابل) مسلمانوں کی کوئی ہستی نہیں تھی۔ کابل میں مہمانوں کی رواداری ایک مرض کے درجہ تک ترقی کر چکی تھی۔ وہ مہمان کی بات

صریحاً غلط سمجھ رہے ہیں مگر اپنے آپ کو جاہل سمجھ کر مہمانوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری جانتے ہیں۔ عام مجلسوں میں ان کی غلط باتوں کے لئے شاعروں کے مقولے پیش کر دیں گے۔ اس سے مہمان سمجھ رہا ہے کہ میرے پروپیگنڈے کا خوب اثر ہو رہا ہے۔ ہمارے راجہ صاحب بھی اس غلط فہمی میں کافی زمانہ تک مبتلا رہے۔ یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ میرے تبادلہ خیالات نے راجہ صاحب کو مجبور کیا کہ ہندوستانی معاملات میں وہ صحیح طور پر مسلمانوں کو شریک کر لیں۔ اور میں ان کے لئے ایسا نرم اور میٹھا ثابت نہیں ہوا جیسے مولوی برکت اللہ مرحوم۔ اس کے بعد ہمارے اور راجہ صاحب کے اکثر معاملات محبت سے طے ہوتے رہے اور میں نے ان کے معاملہ کو پروفیسر کرپلانی کی طرح معمولی تصور کیا (یعنی ایک غلط فہمی) اور ادلہ کی روشنی میں اس کی درستی کر دی گئی۔ مگر واقعہ ایسا نہیں تھا۔

راجہ صاحب کا حملہ

انھوں نے ہندو مہاسبھا کا نظریہ اس وقت سے قبول کر لیا۔ یا صحیح طور پر کہا جائے تو انھوں نے اپنے قلبی فیصلہ کو عملی صورت دینا شروع کیا۔ یعنی آریہ سماج کو ہراول بنا کر لالہ ہردیال کے نام سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا (یعنی شدھی سنگھٹن کی تحریک) انھوں نے کافی محنت کے بعد اپنے بھائی سے سوئٹزرلینڈ میں ملاقات کی صورت نکالی اور انھیں نشیب و فراز سمجھا کر واپس کر دیا۔ راج کمار شاردا کا بیج لاہور میں جلوس اور پنڈت مالوی جی کا لالہ لاجپت رائے اور سوامی شردھانند سے جیل میں مل کر انھیں معافی کے لئے تیار کرنا معمولی واقعہ نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس میں راجہ صاحب کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔

لالہ لاجپت رائے کی ملاقات استنبول میں

راجہ صاحب فرماتے ہیں کہ حکومت مؤقتہ ہند (عارضی حکومت) کی کتاب سوئٹزرلینڈ کے سفر میں چرائی گئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ بھی پنڈت جی (پنڈت مدن موہن مالوی تک پہونچ گئی ہے یا پہونچا دی گئی ہے۔ اس سے جس قدر معلومات حاصل ہوئیں ان کا عام پروپیگنڈا آسان نہیں۔ فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے گھرے واقعات کیسے معلوم ہوئے۔ ہمارا خیال ہے کہ راجہ صاحب کی عزت محفوظ کرنے کے لئے لالہ راجپت رائے ہم سے ملے۔ اس کے بعد ہر ایک بات ہمارے نام سے کہی جا سکتی ہے۔ ہماری ملاقات سے

لالہ جی نے اور بھی فائدہ حاصل کرنا چاہا جس میں افسوس کہ انہیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ یہاں پر ایک جملہ معترضہ ہے،

جرمن ممبروں کی شکایت

مفصل ملاقاتوں سے ہمیں معلوم ہوا کہ مشن کے ہندوستانی ممبر اور جرمنی ممبر یک جہتی قایم نہ رکھ سکے جو ایسی سیاسی مہمات کے لئے ضروری ہے۔

ہندوستانی ممبر سارا الزام جرمن ممبروں پر تھوپتے تھے لیکن جرمن ممبر شکایت کرتے تھے کہ برلن اور استنبول میں جو سبز باغ دکھلائے گئے ان کا عشر عشیر بھی یہاں نظر نہیں آتا اس مشن کا جو مقصد بیان کیا جاتا ہے انصاف یہ ہے کہ مشن نے اس کے موافق کوئی تیاری نہیں کی تھی راجہ صاحب کو جب میں نے بعض کوتاہیوں سے متنبہ کیا تو فرمایا کہ جرمن چانسلر نے بھی مجھے اس طرف توجہ دلائی تھی اور میرے لئے آسانی پیدا کرنی چاہی تھی مگر میں نے خلاف شان سمجھ کر انکار کر دیا۔

ہندوستانی مشن کا مقصد

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں فقط اس قدر تھا کہ جرمنی ترکی اتحاد میں اگر افغانستان شمولیت کا قصد کرے تو مالوی جی کا ایک نمایندہ اس سے واقف ہوتا رہے اور جہاں تک ممکن ہو ہندوستان کی سرحد سے اس مصیبت کو ٹالتا رہے۔ معاملات میں جو پوزیشن شاہ افغانستان کو حاصل ہو اس میں مہاراجہ نیپال کو شریک کرنے کی کوشش کرے۔ انڈین سوسائٹی برلن نے پوری دانشمندی سے اس ہندو تحریک کو ہندوستان کا رنگ دینے کے لئے مولانا برکت اللہ صاحب کو بھی برائے نام اس میں شریک کیا۔

مولانا برکت اللہ صاحب مرحوم کی شمولیت کو جس قدر ہم بے معنی دکھلا رہے ہیں اس کا مولانا کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کی اس غفلت کی سزا ہے جو اپنے آپ کو اقلیت میں فرض کرکے اکثریت کے رحم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب ایک شخص کے ذہن میں یہ ٹھونس دیا جائے کہ تم اس تبکدہ کی اجازت نہ ہونے کی صورت میں کوئی کام نہیں کر سکتے تو اس شخص کے بیکار ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ میں اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے ایک دو مثالیں لکھتا ہوں۔ مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام جب اپنا اختیار مہاتما گاندھی کے سپرد کرتے ہیں تو کیا وہ اپنی لیڈر بانیوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یا ڈاکٹر انصاری کو اگر سوامی شردھانند کے

ساتھ وابستہ کر دیا جائے تو اس کی محنت کوئی نتیجہ دے سکتی ہے اسی طرح اگر مولانا برکت اللہ مرحوم راجہ صاحب سے اختلاف کر کے اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتے تو ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے (ذاتی ڈائری از صفحہ ۷۰ تا ۹۶)

جنود اللہ کا قیام جب ہم سردار نائب السلطنت (سردار نصر اللہ خاں صاحب) سے مل چکے تو وہ ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوان جو لاہور سے یاغستان ہو کر کابل اس ارادہ سے پہونچے تھے کہ ترکی جا کر وہ جنگ میں شریک ہوں گے لیکن کابل میں روک دئے گئے تھے انھیں پولیس کی حراست سے آزاد کر دیا گیا اور ان کے رہنے کے لئے وہی گھر تجویز ہوا جس میں ہم رہتے تھے۔ ہماری خواہش تھی کہ وہ ترکی جانے کا خیال چھوڑ دیں اور کابل میں ہمارے ساتھ رہ کر حکومت کی مصلحت جس قدر اجازت دیتی ہو اسی قدر کام میں مصروف رہیں۔ وہ جب لاہور سے نکلے تھے تو منظم شکل میں سفر کر رہے تھے مگر کابل میں لاہوری نوجوانوں کے ساتھ چند نوجوان پشاوری بھی شامل ہو گئے اور ان میں اختلاف شروع ہو گیا۔ بے کاری میں آہستہ آہستہ لاہوری جماعت کے افراد بھی کسی قدر مختلف ہو رہے تھے ہمیں جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو میں نے پہلے اون کے پرانے نظام کو تازہ کرنے کی کوشش شروع کی اور ایک نوجوان عبدالباری ایم اے جماعت کا صدر منتخب ہوا ہمارا تعلق اس جماعت سے اس رئیس کے توسط سے تھا۔ چونکہ ہندوستانیوں کی ایک جماعت سیاسی سازش کے الزام میں محبوس تھی اور وہ لوگ افغانستان کے محکمہ تعلیمات سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ہم افغانستان میں دلچسپ کام بھی جاری نہیں کر سکتے تھے لیکن جب یہ نوجوان ہمارے ساتھ رہنے لگے تو ہمیں دہلی کے نظارۃ المعارف کا سا لطف آنے لگا۔ ان کے متعلق ہمیں کسی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ اس جماعت میں کم از کم دس آدمی ایسے تھے جو تین سال سے زیادہ کالج میں پڑھ چکے تھے انھیں ہم نے علیحدہ کر لیا اور کسی قدر مذہبی اور سیاسی عام اصول پیمان سے مذاکرات ہونے لگے اس میں شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی قصوری بھی شریک تھے۔ اس عرصہ میں ہمارے بعض دوست دیوبند سے بھی پہونچ گئے جن میں سے مولانا منصور انصاری تھے جمعیۃ الانصار میں ہم دونوں ساتھ کام کر چکے تھے اور مولانا سیف الرحمن دہلی سے یاغستان ہوتے ہوئے کابل پہنچے

مولانا سیف الرحمٰن اصل میں قندھاری افغان ہیں ان کے آباؤ اجداد پشاور کے پاس رہنے لگے انھوں نے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے حدیث پڑھی اور زیادہ عرصہ تک ٹونک میں پڑھاتے رہے اخیر میں دہلی کے مدرسہ فتحپوری کے مدرس اول تھے۔ جب حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے مشورہ سے انھوں نے یاغستان کی طرف ہجرت کی تو حاجی ترنگ زئی صاحب کی بیعت میں کچھ عرصہ جہاد میں[1] شریک رہے پھر کابل تشریف لائے ان کے وکیل مولانا محمد بشیر جو جماعت اہل حدیث لاہور کے معزز رکن تھے اور ہجرت کر کے جماعت مجاہدین میں رہتے تھے نوجوانوں کی ہجرت میں اس کا خاص کام تھا وہ بھی اپنی جماعت کے فرائض انجام دینے کے لئے کابل پہونچے۔ ان لوگوں کے مشورے سے ہم نے کام کرنے والوں کی ایک جماعت بنوائی جسے جنود اللہ کہا جاتا ہے اس میں عسکریت بھی تو اسی قدر جتنی سالویشن آرمی میں موجود ہے۔ اس نظام سے ہم نوجوانوں کی باہمی رقابتوں کو دور کر سکے اور انھیں مفرور طالب علموں کے مکروہ نام سے نجات دلانے میں کامیاب ہوئے سرحد میں حاجی ترنگ زئی کے آنے پر افغانی مجاہدین کی ایک جماعت پیدا ہوگئی۔ حاجی ترنگ زئی چونکہ حضرت شیخ الہندؒ کے خاص دوستوں میں سے تھے ان کے ساتھیوں میں سے بہت سے لوگ دیوبند کے پڑھے ہوئے تھے اس لئے جب ان کے وکلاء کابل آئے تو وہ بھی جنود اللہ میں شامل ہوگئے۔

حکومت موقتہ ہند (عارضی حکومت)

ہندوستانی مشن کو اپنے مطلب میں کامیابی نہ ہوئی۔ اعلیٰ حضرت اپنے ملک کو جنگ میں دھکیلنا نہیں چاہتے تھے

---

[1] سرحد میں مجاہدین کی ایک جماعت تھی جس کا تعلق حضرت مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادیؒ سے تھا۔ یہ جماعت جب بھی موقع ملتا انگریز کو نقصان پہونچانے کے لئے میدان میں نکل آتی ۔ مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادی حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے خاص شاگردوں میں سے تھے حضرت سید صاحب کے ساتھ ہجرت کی۔ یہ کابل میں سفارت کا کام کرتے رہے۔ اس کے بعد مولانا محمد اسحاق صاحب دہلویؒ کے ماتحت ہند میں داعی بنا کر بھیجے گئے حیدرآباد اور بنگال میں کام کرتے رہے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد ۱۲۴۶ھ میں انھوں نے اپنی مستقل جماعت قائم کر لی ۱۲۷۰ھ میں حجاز، یمن، نجد کا سفر کیا۔ ۱۲۶۲ھ میں مشرقی افغانستان میں تشریف لائے۔ مولانا ولایت علی مرحوم سید صاحب کی شہادت کے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کے انتظار میں بیٹھنے والی ایک خاص جماعت قائم کر لی ان کے بھائی مولوی عنایت علی مرحوم اس خیال کے مخالف تھے اس لئے جماعت میں منتظرین اور مجاہدین دو دونوں فریق ملتے تھے۔ ان مجاہدین کی امامت مولانا ولایت علی کے خاندان میں منحصر ہوگئی

اور انگریزوں سے انھیں بہت کچھ مراعات کی توقع تھی۔ اس کے مقابل فریق ثانی کوئی تسلی بخش پروگرام نہ بنا سکا اور ممبروں کا اختلاف سونے پر سہاگے کا کام دے گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ مستقبل ہند کے متعلق ہمارے نظریات چونکہ مشن کے ممبروں سے پورے پورے نہ ملتے تھے اس لئے ہمیں دربار میں جلدی بڑھنے کا موقعہ مل گیا حکومت نے مشن کے ممبروں کو آخری جواب دینے سے پہلے ہمیں ان سے ملنے کے سامان بہم پہونچا دیے جس سے ان کے خواب کو مختلف تعبیرات سے پریشان کرنے کی کوشش کی گئی۔ مشن کی جو گفتگو اعلیٰ حضرت سے ہوتی وہ حرف بحرف برٹش قونصل کے ذریعہ وائسرائے کو بھیجی جاتی اس کے معاوضہ میں کافی روپیہ انگریزوں نے اعلیٰ حضرت کے لئے بھیجا اور ان کے سالانہ گرانٹ میں مستقل اضافہ ہو گیا۔ البتہ سردار نائب السلطنت کی صدارت میں جو باتیں ہوتیں وہ محفوظ رہتیں اور ان سے افغانستان گورنمنٹ اپنی ترقی کے لئے راستے چوستی۔ اس قسم کے کاموں میں سے ایک کام حکومت موقتہ ہند کا ہے۔

روسی ہندوستانی مشن

راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ نے مل کر حکومت موقتہ ہند کی بنیاد ڈالی جس میں بعض جرمن اور ترک بھی شامل ہوئے۔ اس حکومت نے ایک وفد روسی گورنمنٹ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ سردار نائب السلطنت نے منظور کر لیا اس پروگرام پر کام کرنے کے لئے ان کے پاس ہندوستانی نہیں تھے وہ چاہتے تھے کہ یہ نوجوان ان کے ساتھ کام کریں۔ مگر یہ لوگ ہماری تنظیم میں جکڑے ہوئے تھے اس لئے ہم سے براہ راست باتیں شروع ہوئیں۔ ہماری ابتدائی گفتگو میں ایک افغان افسر بھی موجود رہتا تھا اور ہمارے تبادلہ خیالات سے وہ بہت سی ایسی باتوں کو سمجھنے لگا جو پہلے سے اس کی توجہ جذب نہیں کر سکتی تھیں۔ ہمارے ساتھ ان نوجوانوں کے علاوہ دو سکھ بھی تھے جو غدر پارٹی کے ممبر تھے اور ہندوستان سے بھاگ کر بلا پاسپورٹ افغانستان میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ بھی پہلے پولیس کی حفاظت میں تھے پھر آزاد ہو کر ہمارے پاس رہنے لگے تھے۔ راجہ صاحب کی تجویز یہ تھی کہ ان میں سے ڈاکٹر متھرا سنگھ کو اس روسی مشن میں بھیجا جائے۔ مولانا برکت اللہ صاحب مرحوم کی تائید کے بعد دوسرے ممبر اس داخلی مسئلہ سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے اس لئے وہ موافق ہو گئے۔ اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ ایک فیصلہ شدہ صورت میں ظاہر کیا گیا لیکن ہم ڈاکٹر متھرا سنگھ کی علم سیاسی واقفیت سے آشنا ہو چکے تھے۔ اس میں ترمیم پیش کر دی کہ اس مشن میں ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ

ایک نوجوان مسلمان بھی ہونا چاہیئے۔ راجہ صاحب نے پسند نہیں کیا اور اس پر مباحثہ ہوگیا۔ میرا خیال تھا کہ مسلمانوں کے اشتراک کا یہ مطلب نہیں کہ کام سوچنے والی جماعت میں ایک مغلوب حصہ مسلمانوں کا شامل رہے اور کام کرنے والی طاقت خالص غیر مسلم رہے بلکہ عملی کاموں میں مسلمانوں کی شرکت ضروری ہے۔ اس مناظرہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ سردار نائب السلطنت کے سامنے پیش ہوا۔ ترک، جرمن، افغان بھی اس میں شریک ہوئے۔ طرفین کی باتیں سن کر ہماری رائے کے موافق فیصلہ ہوا۔ ہماری اور راجہ صاحب کی تلخ گفتگو کا یہ آخری حصہ ہے اس کے بعد پھر کبھی اس قسم کی ضرورت پیش نہ آئی۔

روسی مشن کا مسلمان ممبر

ہم نے نوجوانوں کے رئیس سے اس کام کے لئے ایک ممبر مانگا اس نے اپنی جماعت کے پورے مشوروں کے بعد ڈاکٹر خوشی محمد کو منتخب کیا یہ نوجوان جالندھر کا رہنے والا ہے۔ میڈیکل کالج لاہور میں دو سال سے زیادہ تعلیم حاصل کر چکا ہے مذہبی جذبات جیسے نوجوان میں ہوتے ہیں اس میں کسی سے کم نہیں سمجھ دار ہے سنس رکھتا ہے۔ نوجوانوں کی ہجرت کی تحریک کا لیڈر رہے اس کا نام مرزا محمد علی تجویز کیا گیا اور ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ دوسرا ممبر قرار پایا۔ شیخ محمد ابراہیم جب کابل چھوڑنے پر مجبور ہوگئے تو اسی مرزا محمد علی کو میں نے اپنا رفیق بنایا اور قرار دیا۔ میری جس قدر کامیابی افغانستان اور اس کے بعد روس میں مانی جاسکتی ہے اس میں مرزا محمد علی کی محنت و ہمت کا حصہ غالب ہے اس میں شک نہیں کہ اگر وہ ہمارے ساتھ نہ مل جاتا تو شاید کوئی بڑا کام نہ کر سکتا۔ خدا نے صحیح اشتراک میں قوت رکھی ہے۔ اجزاء کے انفرادی قوت میں اضعافاً مضاعفہ قوت نازل ہوتی ہے (ع) دو دل یک شود بشکنند کوہ را۔ اگر آپس میں کارکن شریک ہو جائیں۔ عقلی اصول صحیحہ پر شرکت ہو۔ عمل اور تقسیم فوائد میں عدل ملحوظ رہے۔ فقط اتنی طاقت دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک عالمگیر برادری جو قرآن پر ایمان کا دعویٰ رکھتی ہے کیا ان میں سے ایک مختصر جماعت سمجھ دار پیدا نہیں ہو سکتی۔ یقیناً ہو سکتی ہے مگر ان کو قرآن پر غور کرنے کی فرصت کہاں۔ مخالفین کے پروپیگنڈے سے مرعوبیت نے انہیں کسی کام کا نہیں چھوڑا انا للہ وانا الیہ راجعون کابل سے سفر کرنے کے چند دن پہلے مرزا محمد علی، روس کی انقلابی اشتراکی جماعت کا ممبر بن گیا اسکے بعد ہمارا انکا رسمی اشتراک باقی نہیں رہا فقط دوستی اور محبت ہے۔

مرزا محمد علی کیلئے سفر خرچ

راجہ صاحب نے ڈاکٹر متھرا سنگھ کا سفر خرچ دے دیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ راجہ صاحب پورے مشن کا خرچ دیں گے یا شاید حکومت افغانیہ انتظام کر دیگی مگر ایسا نہیں ہوا ہماری ساری زندگی اسی طرح گذری کہ روپیہ پیسہ کا کوئی خاص اہتمام نہیں جب ضرورت پیش آئی کسی نہ کسی طرح روپیہ مل گیا۔ اس طرح ہمارے دل میں اپنے پروردگار پر زیادہ اعتماد پیدا ہوتا گیا اور اسی کو ہم اپنی زندگی کا روشن پہلو شمار کرتے رہے۔ کابل کا سفر بھی اسی قاعدہ پر تھا۔ جب ہم قندہار پہونچے تو ہمارے پاس فقط ایک پونڈ تھا اور ہم چار آدمی تھے نائب الحکومت نے ہمیں سفر خرچ دے دیا مگر اسے معلوم نہ تھا کہ یہ خالی ہاتھ ہیں۔ جب ہم کابل پہونچے تو ایک مہینہ میں ہمارا خرچ ختم ہو گیا اور ہم نے جس قدر کپڑے یا سامان راحت خریدا تھا سب بیچ ڈالا اس وقت ہندوستان سے ایک دوست نے کسی قدر روپے بھیجے اور لوگوں سے ملنے کے قابل ہم کپڑے بنا سکے۔ پھر سردار نائب السلطنت نے بطور مہمانی شاید پانچسو روپے بھیجے تو ہمارے بعض ساتھی جو ہندوستان سے واپس ہوئے ان کی ضروریات میں صرف ہو گیا میں شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ کھانے میں شروع سے شریک ہو گیا تھا۔ مگر اور قسم کی اعانت ہم ان سے نہیں چاہتے تھے وہ سمجھتا تھا کہ میں ہندی کام کے لئے بہت سا روپیہ لایا ہوں اور میں اسے مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب مرزا محمد علی کا خرچ دینا ضروری تھا۔ میں نے شیخ محمد ابراہیم سے روپیہ مانگا مگر اس مرحوم نے اس وقت انکار کر دیا۔ اگرچہ بعد میں ان کا تمام روپیہ اور سب سامان اسی کام میں صرف ہوا۔ اپنے فیصلے سے انھوں نے یہ سب کام کیا۔ لیکن اسی خاص وقت پر ان سے غلطی ہو گئی۔ ان کے دوسرے ساتھی مولوی محمد علی قصوری تھے مولوی عبدالقادر قصوری سے ہماری سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ مولوی محمد علی کا تعارف مولانا ابو الکلام نے کرا دیا تھا مگر وہ شیخ محمد ابراہیم کی طرح ہمارے کام میں شریک نہیں تھے۔ خاص مشوروں میں فقط شیخ محمد ابراہیم پر ہمارا اعتماد تھا عام حالات میں مولوی محمد علی بھی شریک ہوتے تھے۔ اپنی تکلیف کا ہلکے الفاظ میں ان سے ذکر کیا وہ بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے جلد اپنی دو ماہ کی تنخواہ پیشگی وصول کر کے ہماری ضروریات پوری کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کا خاص لطف دیکھا اور مولوی محمد علی کے از حد ممنون ہوئے جیسے آخر میں شیخ محمد ابراہیم کا تمام اندوختہ ہمارے کام میں صرف ہوا۔ اسی طرح مولوی محمد علی نے جس قدر کابل میں کمایا تھا وہ سب ہمارے ہندوستان کاموں میں صرف ہوا جزاہم اللہ خیرا۔

سیاسی کام فقط نظریات یا عملی تجربات کے مالک ہونے سے نہیں چلتے۔ اس کی کامیابی کے لیے ایک متعد جماعت اور روپیہ کی بھی ویسے ہی ضرورت ہے جیسے علم وعمل کی۔ ہندوستان کے مسلمان جس قدر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں وہ تھوڑا سمجھا جائے گا کہ ان کے نام سے کابل میں بے سروسامانی سے کام شروع ہوتا ہے تو ان کے نوجوان بہترین کارکن ثابت ہوتے ہیں اور روپیہ تو مولوی محمد علی اور شیخ محمد ابراہیم کا تھا جو وقت پر کام آیا۔ ہمارا خیال ہے کہ ان لوگوں کا نام قوم کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہیے اور ہمیشہ کے لیے ان کو دعا کرنی چاہیے

حکومت موقتہ ہند میں ہماری شمولیت

اس مشن کے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے جرمن ممبروں سے زیادہ ملنا شروع کر دیا۔ اس میں ہمارے دوست عبدالباری بی اے کی رفاقت ہمارے کام آئی۔ راجہ صاحب نہیں چاہتے تھے کہ وہ (جرمن ممبر) کسی دوسرے ہندوستانی سے ملیں ہماری ملاقاتوں کا تسلسل دیکھ کر راجہ صاحب نے ہمیں حکومت موقتہ ہند میں شمولیت کی دعوت دی۔ انھیں خیال تھا کہ شاید اس میں شامل ہونا پسند نہ کریں گے کیونکہ اس کا جس قدر نظام ان دونوں صاحبوں نے تجویز کیا تھا اس میں راجہ صاحب کے نام وفاداری کا حلف ضروری تھا۔ مگر میں نہایت مسرت سے اس میں شامل ہو گیا۔ البتہ حلف نامہ تبدیل کر دیا جسے انھوں نے منظور کر لیا۔ اس کے بعد ہندوستانی معاملات میں ہماری گفتگو بیرونی مداخلت سے پاک ہو گئی۔ ابتدا میں حکومت موقتہ کے تین ممبر رہے امیر امان اللہ خاں کے زمانہ میں جنگ افغانستان کے خاتمہ پر اور ممبر بڑھائے گئے۔ اس میں جماعت مجاہدین کے وکیل مولانا محمد بشیر صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

راجہ صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں۔ مگر اپنی شخصی ڈکٹیٹر شپ کا خیال ان کے دماغ پر غالب تھا یوروپین لوگوں سے وہ ان کی زبان میں باتیں کر لیتے اور ڈیموکریسی کے لکچر دے ڈالتے لیکن ہندوستانی معاملات میں ان کی موروثی خصلت نمایاں رہتی۔ ہم نے بڑے داؤ پیچ سے انھیں راضی کیا کہ حکومت موقتہ اپنا چارج اس جماعت کو دے دے جسے انڈین نیشنل نے اس کام کے لیے معین کیا ہو۔ وہ اس کے سوا کوئی بات نہیں جانتے تھے کہ کام پریذیڈنٹ کے اختیار میں چھوڑ دینا چاہیے اور وہ لالف پریذیڈنٹ اپنے ہی تجویز کردہ قانون سے مقرر ہو چکے تھے۔ جب پہلی بار راجہ صاحب نے کابل چھوڑا تو حکومت موقتہ کے لیے تین مرکز تجویز

ہوئے۔ کابل، نیپال، بنگال شمال مشرقی۔ کابل کے مرکز میں کام ہمیں تفویض ہوا۔ اس کے بعد ہم نے جنود اللہ اور باقی تمام کارروائیوں کو حکومت موقتہ مرکز کابل سے متعلق کر دیا۔ امیر امان اللہ خاں صاحب جب برسر اقتدار ہوئے تو انھوں نے ہمیں حکومت موقتہ ہند کا نمائندہ مان کر سرکاری معاملات صلح و حرب میں شریک کر لیا۔ جب جنگ کا فیصلہ ہونے لگا تو اس خاص مجلس میں مجھے بلا کر سرافراز فرمایا۔ دوران جنگ میں بعض اہم امور میرے حوالے کئے گئے۔ جنگ ختم ہونے پر اچھی کامیابی حاصل کرنے میں ہماری خدمات خاص طور پر تسلیم کی گئیں۔ اس تمام زمانہ میں ہمارے نوجوان رفیقوں کے کارنامے سنہری حرفوں سے لکھے جائیں گے۔ اگرچہ ایک زمانہ تک ان پر پردہ ڈالنا ضروری ہے۔ جب جنگ ختم ہونے پر راجہ صاحب دوبارہ کابل تشریف لائے تو امیر امان اللہ خاں نے ان کے اعزاز میں ایسے کام کئے جن کی راجہ صاحب کبھی توقع نہیں رکھتے تھے۔ اس میں امیر صاحب نے ہمارے مشورے حرفاً بحرفاً قبول فرمائے۔

آخری سال جب ہم کابل سے رخصت ہوئے امیر صاحب نے ہمیں افغانستان میں رہ کر حکومت موقتہ کا کام کرنے سے روک دیا۔ انٹرنیشنل سیاسیات کی پابندی ضروری ہے۔ ہم نے ایک شرط پر اسے منظور کر لیا۔ جب وہ وعدہ کرنے میں تعلل نظر آیا تو ہم نے افغانستان سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں بذات خود تھوڑے سے تغیر کے بعد آرام و عزت سے کابل میں رہ سکتا تھا مگر میرے نوجوان رفیقاں جن کی مشقتیں ہماری عزت افزائی کی سبب بنی تھیں ان کا مستقبل برباد ہو جاتا اس لئے میں کابل سے نکلنا ضروری سمجھتا تھا۔ اب ہم اطمینان سے مجتمع نہیں ہیں لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ فلاں نے اپنے فائدہ کے لیے دوسروں کا نقصان کر دیا اگر کبھی موقع میسر آیا تو تمام دوست پھر یک جا ہو جائیں گے واللہ الموفق والمعین (ذاتی ڈائری صفحہ ۹۹ تا ۱۱۰)

ہندوستانی مشن کی روس کو روانگی

ڈاکٹر متھرا سنگھ اور مرزا محمد علی روسی مشن پر بھیجے گئے ان ممبروں کے ساتھ دو خادم بھی روانہ کئے گئے۔ محمد علی کا خادم افغان تھا اور ڈاکٹر متھرا سنگھ کا خادم ایک کابلی سکھ۔ مشن ترمذ سے تاشقند پہنچا گورنر نے زار کو مطلع کیا وہ اس وقت پریشان تھا۔ اس نے برطانیہ سے بہت سے مطالبات شروع کر دئے اور اس مشن کی کارروائی بہانا بنایا۔ برطانیہ مشن کو جعلی قرار دیتا مگر لیکن روس اسے تسلیم نہیں کرتا اور افغانی حملہ سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ برطانیہ ہندوستان سے ممبروں کی تشخیص

کرتا ہے۔ مگر صحیح طور سے معین نہ ہو سکے۔ بالآخر زار نے ممبروں کے گرفتار کرنے کا حکم دیدیا۔ مگر گورنر تاشقند کی مداخلت سے یہ لوگ قید سے بچ گئے۔ یہ مشن بیکار ثابت نہیں ہوا۔ روسی انگریزی اتحاد میں کسی قدر مشکلات پیدا کر سکا جس کی تلافی کے لئے لارڈ کچنر کو خود سفر کرنا پڑا۔ روسی انقلابیوں نے ایک پمفلٹ شایع کیا جس کا نام ہے "سونے کی پٹری" (جو سونے کی پٹری پر کندہ کرایا گیا تھا) ایک خط گورنر تاشقند کے نام تھا اس میں اس مشن کے متعلق خط وکتابت مذکور ہے۔ جب یہ مشن واپس آیا تو ڈاکٹر متھرا سنگھ سردار نائب السلطنت کے سامنے پیش ہوا۔ سردار کے تمام سوالوں کے جواب میں یہی کہتا رہا کہ بخیر رفتیم و بخیر آمدیم۔ اس کے بعد سردار نائب السلطنت نے مرزا محمد علی کو بلایا اور سفر کی کیفیت پوچھی۔ محمد علی نے تمام واقعات کی مختصر یادداشتیں لکھ رکھی تھیں جیب سے اپنی کتاب نکالی اور مفصل حالات اور گفت وشنید کا خلاصہ سب ذکر کر دیا۔ اس کے بعد سے سردار نائب السلطنت ہماری بہت زیادہ قدر کرنے لگے۔ انھوں نے اپنے خاص لوگوں سے کہا کہ اگر ہم مولانا عبیداللہ کی بات نہ مانتے تو راجہ صاحب کا فرستادہ ہمیں ایک حرف بھی نہ بتلاتا۔

ہندوستانی حکومت کا ایک اخلاقی حملہ

ہماری تربیت ہندوستانی تعلیمات میں علماء دیوبند کے مسلک پر ہوئی ہے۔ دیوبندی جماعت فقہ حنفیہ کی پابند ہے۔ لیکن بہت سے غلط رسوم کی تردید میں مولانا اسمٰعیل شہید کے طریقہ پر ہے اس میں یہاں تک مبالغہ کیا جاتا ہے کہ مولانا اسمٰعیل کے اصلی اتباع یہ لوگ اپنے سوا کسی کو نہیں مانتے۔ سندھ میں میں نے بیس سال زندگی بسر کی ہے میرے بزرگ سب اسی دیوبندی مسلک سے ملتے جلتے ہیں۔ اگرچہ علماء دیوبند سے ان کے افادہ اور استفادہ کا کوئی رابطہ نہیں۔ ان کے مخالف سندھ میں پیروں اور مولویوں کی تعداد کافی ہے ہندوستانی حکومت نے ان میں سے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جن کا قندہار کے پیروں سے بہت قوی تعلق تھا ان قندہاری بزرگوں میں سے ایک پیر کابل تشریف لائے اور سردار نائب السلطنت سے ملے اور انھیں یقین دلایا کہ مولانا عبیداللہ حکومت ہند کا فرستادہ ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ افغانستان کے لوگوں کا مذہب خراب کرکے افغانستانی حکومت کے اسرار سے انگریزوں کو مطلع کرے سردار نائب السلطنت کے سکریٹری نے ہم سے ذکر کیا ہم نے اس کو تھوڑا سا سمجھا دیا کہ ہمارے متعلق وہ افغان سی آئی ڈی کے افسروں کو مقرر کرکے حکومت کی رائے معلوم کریں اس پر جس قدر سزا ہو اس سے دریغ نہ کریں اگر

ذرا سا شبہ ہوا تو مجھے توپ سے اڑا دیا جائے۔ دوسری صورت میں جہاں سے میں آج کام چھوڑ رہا ہوں وہیں سے شروع کروں گا گویا یہ زمانہ بیماری کی رخصت میں حساب ہوگا۔ غالباً یہ تجویز سردار کو پسند آئی اور اس پر عمل کیا گیا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ افغان خفیہ نویسوں نے کہا کہ اس شخص (قندھاری پیر) کے نامہ اعمال میں ایک نقطہ بھی سفید نہیں رہا۔ اس کے بعد سردار نائب السلطنت نے ہمیں خاص طور سے باریاب فرمایا، اور ہم اپنے کام میں مصروف ہو گئے'۔

استنبول مشن اور جاپانی مشن

پہلے مشن کی کامیابی میں راجہ صاحب نے دو مشن اور بھیجنے کا فیصلہ کیا ایک ہمارے منشا کے مطابق استنبول بھیجا گیا اس میں ہمارے رفیق عبدالباری بی اے اور ڈاکٹر شجاع اللہ مقرر ہوئے یہ ایران کے راستے استنبول جائے گا۔ دوسرا مشن مولانا برکت اللہ کی تجویز پر مقرر ہوا۔ اس میں شیخ عبدالقادر بی اے اور ڈاکٹر متھرا سنگھ روس کے راستے جاپان جائیں گے۔

کیپٹن ہینٹس (جرمن ممبر مشن) سب سے پہلے کابل سے واپس گئے'۔ امیر صاحب نے رخصت کا فرمان دیدیا وہ جانے کے وقت تین سو پونڈ میرے نام چھوڑ گئے' راجہ صاحب نے مجھے حکم دیا کہ وصول کر لوں اس میں سے ایک سو پونڈ تو راجہ صاحب اور مولانا برکت اللہ نے اپنے کپڑے تیار کرنے کے لئے لے لئے' اور دو سو پونڈ شیخ محمد ابراہیم کے پاس امانت رکھ لئے' شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی اور میرا بھتیجا عزیز احمد جس گھر میں رہتے تھے اس پر رات کو ڈاکہ پڑا اور وہ تمام روپیہ اور دونوں صاحبوں کے کپڑے اور سامان ڈاکو لے گئے' مجھے خطرہ ہوا کہ راجہ صاحب اس ڈاکہ کو ہمارے روپیہ ہضم کرنے کا بہانہ تصور کریں گے جب استنبول مشن جانے کا وقت آیا تو اس کے لئے سو پونڈ مولانا محمد بشیر وکیل رئیس المجاہدین سے قرض لے کر ادا کر دئے۔ مولانا محمد بشیر صاحب کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ قرض کا تو فقط نام تھا اگرچہ بعد میں مرزا محمد علی نے ادا کر دیا۔ دوسرے مشن کی روانگی سے پہلے سرکاری طور پر ڈاکہ کی تصدیق ہو چکی تھی اور چوروں کے پاس روپیہ کا ثبوت ہو چکا تھا اگرچہ ہمیں اس میں سے کچھ بھی نہیں ملا۔ اب راجہ صاحب کے کہنے سے میں مولانا برکت اللہ کے ساتھ سردار نائب السلطنت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس واقعہ میں روپیہ ضائع ہونے کا ذکر کیا ایک سو پونڈ کی ضرورت ظاہر کی سردار صاحب نے بکمال مہربانی وعدہ فرمایا اور شام کو خود سو پونڈ ساتھ لائے' اس طرح دوسرا مشن بھی روانہ ہو گیا۔

ممبروں کی گرفتاری

روس نے دوسرے مشن کو جب ان کی سرحد عبور کر چکا تو گرفتار کیا اور انگریزوں کے حوالہ کر دیا۔ استنبول مشن کو ایران میں خود انگریزوں نے گرفتار کیا۔ چار ممبر لاہور پہنچے، ڈاکٹر متھرا سنگھ چونکہ ایک بم کیس میں مفرور تھا اُسے پھانسی پر لٹکا یا گیا اور باقی تین ممبر نظر بند کر دئے گئے ان میں سے عبدالباری جو ہر ایک موقع پر ہمارے ساتھ اور نوجوانوں کی جماعت کا رئیس تھا سر محمد شفیع کارشتہ دار بنکلا۔ اسے معافی مانگنے پر راضی کیا گیا۔ اس نے تمام واقعات حکومت موقتہ کے اور جنود اللہ اور جماعت مجاہدین کے مفصل لکھ دئے اور باقی دو ممبروں نے اس پر دستخط کر دے۔ کچھ عرصہ نظر بند رکھکر انہیں چھوڑ دیا گیا حکومت ہند روسی مشن کے زمانہ سے واقعات کی تحقیق کے لئے پریشان تھی۔ اب اسے باطمینان مفصل حالات کی اطلاع مل گئی۔

نتیجہ

حکومت ہند (ان اطلاعات کے بعد ایسے عناصر کا کابل میں موجود ہونا کیسے گوارا کر سکتی تھی اس نے پر زور پروٹسٹ کیا) اس کے پروٹسٹ کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی حبیبیہ اسکول سے معزول کر دئے گئے اور میرا بھتیجا عزیز احمد جو حبیبیہ اسکول کا طالب علم تھا خارج کر دیا گیا۔ آج عزیز احمد کے ہم جماعت قونصل اور نائب وزیر اور جرنیل اور ممبر بن گئے اور یہ باوجودیکہ علمی اور عملی لیاقت میں ان سے کسی طرح کم نہیں۔ اسی طرح جوتے چٹخاتا پھرتا ہے۔ اسی طرح ہم اپنی حکومت ضائع کر کے اپنی نسلیں برباد کر رہے ہیں

شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی نے فیصلہ کیا کہ وہ یاغستان میں رہیں گے۔ پہلے دونوں مجاہدین میں رہے پھر شیخ محمد ابراہیم حاجی ترنگزی کے پاس چلے گئے اور پشتو سیکھ کر لوگوں کو قرآن شریف کی تعلیم دیتے رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد افغانستان سے گزر کر روس پہونچنے کی کوشش کی۔ راستہ میں افغانستان کے ایک گاؤں میں فوت ہو گئے۔ شبہ کیا جاتا ہے کہ ڈاکو یاغستان سے ان کے ساتھ تھا اُس نے شیخ صاحب کو شہید کر دیا۔ آخری وقت میں شیخ محمد ابراہیم نے دوسرے ساتھی کو ایک خط لکھ دیا وہ میں نے پڑھا ہے اس کے ایک لفظ سے شبہ ہوتا ہے کہ شیخ صاحب سمجھانا چاہتے ہیں کہ بہت ممکن ہے کہ وہ ڈاکو نہ ہو بلکہ انگریزوں کا ایک کارندہ ہو۔ شیخ محمد ابراہیم نے یہ سفر انقلاب روس کے بعد شروع کیا تھا۔ مولوی محمد علی قصوری کچھ عرصہ تک مجاہدین میں رہے اور پھر کسی طرح سر عبدالقیوم کی معرفت معافی لے کر ہندوستان پہونچ گئے۔ ان کے بیانات نے بھی ہندوستانی

گورنمنٹ کے علم میں کچھ اضافہ ہوا۔

ہندوستانی مشن جب یہ دونوں حضرات یاغستان جارہے تھے ان کے ساتھ ایک ہندوستانی مشن بھی بھیجا گیا (ہم جب کابل پہنچے تو اپنے دو ساتھی واپس بھیجے تھے ان کے پاس بعض کاغذات اور پیام تھے انھوں نے احتیاط اور آہستگی سے کام کیا۔ اب راجہ مہندر پرتاپ چاہتے تھے کہ ان کی اطلاع ان کے بھائیوں کو ملے اور وہاں سے خیریت کی خبر آئے اس کے لئے ہم نے اپنے بھتیجے محمد علی کو مامور کیا وہ شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ یاغستان گیا اور وہاں سے منزل مقصود پر پہونچکر خط پہنچادیا۔ جواب لیکر دو مہینے میں بخیریت پہونچ گیا۔ مگر راجہ صاحب اس سے پہلے کابل چھوڑ چکے تھے۔ ان کا خط انھیں مزار شریف میں پہونچا دیا گیا اور راجہ صاحب اس سے بہت مسرور و ممنون ہوئے۔ اس کے بعد راجہ صاحب ہم سے بھائیوں کا سا معاملہ کرتے رہے، اپنے پرائیویٹ امور میں بھی ہم سے مشورہ لیتے رہے اور بسا اوقات ہماری خاطر اپنی رائے چھوڑ دیتے) اس مشن کا ایک حصہ وہ کاغذات تھے جو میں نے اور مولانا منصور نے حضرت مولانا شیخ الہندؒ کی خدمت میں بطور رپورٹ لکھے تھے ہم نے اپنے نوجوانوں میں سے ایک نومسلم شیخ عبدالحق پر اعتماد کیا اس کے کپڑے پر لکھ کر مکتوبات دئے کہ وہ شیخ عبدالرحیم حیدرآبادی کو پہنچادے اور شیخ صاحب حج پر جائیں اور حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کریں۔ اس اللہ کے بندے نے وہ خطوط اللہ نواز خاں کے والد خان بہادر حق نواز خاں کو دے۔ خاں صاحب نے سرمائیکل اڈوائیر کو پہونچادئے اس کے بعد کے واقعات مشہور ہیں۔ ہندوستان میں گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ ہم حیران رہ گئے۔ چند روز بعد حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء مکہ معظمہ سے گرفتار ہوئے۔ ایک عرصہ کے بعد ہمیں حقیقت معلوم ہوئی۔ یہ واقعات ہمارے لئے موت سے زیادہ ناگوار تھے مگر ایک بات کی مسرت بھول نہیں سکتے تھے۔ اگر خدانخواستہ راجہ صاحب کا خط ہم عبدالحق کو دیتے اور ایسا معاملہ پیش آتا تو ہمارے لئے ناقابل برداشت مصیبت ہوتی اب ہم خوش ہوتے ہیں کہ راجہ صاحب کا کام تو ہو گیا گو ہمارے لوگ قید و مصیبت میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لئے آسانی کردے گا۔

ہماری نظربندی اور قید اس کے بعد ہندوستانی حکومت کے اغراض د پروٹسٹ کا اثر یہ ہوا کہ مولانا

منصور انصاری اور مولانا سیف الرحمان کابل سے یاغستان روانہ کر دیے گئے۔ جلال آباد تک دونوں ساتھ رہے۔ مولانا سیف الرحمن کو جلال آباد میں برٹش افغانوں نے اپنی معیت میں لے لیا اور ہندوستانی معاملات سے علاحدگی کا وعدہ کرالیا۔ اب وہ مستوفی الممالک کے مہمان ہوکر رہنے لگے۔ امیر حبیب اللہ خاں کے آخری حکومت تک وہ مستوفی کے ساتھ رہے اور مستوفی کو جو کام انگریزوں کی تائید کے لئے دیا جاتا اس میں اسکی امداد کرتے

انور پاشا کا خط

ہندوستانی حکومت کو اطلاع ملی کہ حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے ایک خط انور پاشا سے لیکر ہندوستان بھیجا ہے اور وہ اکابر دیوبند کے پاس کہیں محفوظ ہے اس لئے ہندوستان میں جس قدر کوشش ہوئی اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اب جب امیر حبیب اللہ خاں کی حکومت سے امداد لی گئی تو مستوفی الممالک نے دیوبند کے ایک پرانے طالب علم کو جو حضرت شیخ الہند سے خصوصیت رکھتا تھا افغانستان میں سے ڈھونڈھ نکالا۔ اسے دیوبند بھیجا گیا کہ اعلیٰ حضرت امیر صاحب وہ کاغذ مانگتے ہیں اس میں اگر مولانا سیف الدین کی واقفیت مستوفی کی امداد نہ کرتی تو یہ تجویز بروئے کار ہی نہ آسکتی۔ اس دیوبندی بزرگ کا پتہ بھی مولانا سیف الرحمن سے دریافت کرلیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس بزرگ کو کچھ شکوک پیدا ہوئے۔ اس لئے خط ہاتھ نہیں آیا۔ اس کے بعد احتیاط پسند لوگوں نے وہ خط جلا دیا۔

مولانا منصور انصاری افغانستان سے یاغستان چلے گئے اور ایک زمانہ تک وہیں رہے۔

مولانا عبید اللہ صاحب اور ان کے رفقار کی افغانستان میں بحکم انگریزی حکومت گرفتاری اور نظر بندی

اس کے بعد ہمیں یکم رمضان ۱۳۳۵ھ کو ایک تنگ مکان میں لاکر قید کر دیا گیا۔ ہم لوگ بیس پچیس آدمی تھے اور وہ گھر کسی حالت میں دس سے زیادہ آدمیوں کے لئے موزوں نہ تھا۔ ہماری نگرانی سردار سپہ سالار کے متعلق رکھی تھی (یعنی سردار محمد نادر خاں) انھیں ہم نے توجہ دلائی اس نے ہمارے لئے ایک سرکاری باغ میں خیمے لگوائے اور عید رمضان پر خود ہمارے خیموں میں تشریف لائے۔ ایک عرصہ کے بعد ہماری نگرانی مستوفی الممالک کے سپرد کی گئی۔ اب ہم نے مولانا سیف الرحمن کی امداد سے مستوفی کے گھر رہنا شروع کر دیا۔ ہمارے ساتھی اسی طرح کوتوال کی حفاظت میں رہے۔ ہمارا ایک رفیق اس مجلس سے بھاگ گیا اور انقلاب روس کے بعد بخارا پہنچا۔ اس کا نام رحمت علی زکریا ہے اس نے اپنی تجویز ہمیں بتلادی تھی اس کو ہم منع کرنا نہیں چاہتے تھے اور ہمیں خوف تھا کہ اس کے بھاگنے کا تمام

الزام ہم پر عاید کیا جائے گا۔ اس لئے ہم نے مولانا سیف الرحمٰن کے توسط سے ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کرلی مستوفی الممالک ہمیں جلال آباد لے گئے۔ ہم وہیں تھے کہ امیر حبیب اللہ خاں قتل کر دیا گیا اور کابل میں امیر امان اللہ خاں مستقل بادشاہ بن گیا۔

(ذاتی ڈائری از صفحہ ۱۱۳ تا ۱۲۲)

امیر حبیب اللہ خاں کے شہید ہونے اور امیر امان اللہ خاں کے بادشاہ ہونے کے اسباب پر مختصر تبصرہ

امیر حبیب اللہ خاں بادشاہ ہوئے تو سردار نائب السلطنت (امیر نصر اللہ خاں) ولی عہد قرار پائے۔ دونوں بھائیوں کے اتفاق سے سلطنت کا کام چلتا رہا۔ جب امیر حبیب اللہ خاں کے بیٹے جوان ہوئے تو ان کی طبعی خواہش تھی کہ سردار عنایت اللہ خاں معین السلطنت ولی عہد بنا دیا جائے اس کے لئے انھوں نے نہایت دانائی سے کام لیا۔ حرب عمومی کے اعلان کے بعد جب ہندوستانی مسلمانوں اور ترکوں کی طرف سے اولاً اور تمام ہندوستانیوں، ترکوں اور جرمنوں کی طرف سے ثانیاً امیر حبیب اللہ خاں پر زور دیا گیا کہ وہ انگریزوں کا ساتھ چھوڑیں تو امیر نے تمام اینٹی برٹش (برطانیہ کے خلاف) معاملات سردار نائب السلطنت (سردار نصر اللہ خاں) کے سپرد کر دئے اور آپ پرو برٹش معاملات کو نمٹاتا رہا۔ انگریزوں نے کافی روپیہ امیر کو دیا کہ یاغستان میں تقسیم کرے اور اپنی سلطنت کے نام پر قبائل افغانیہ سے بیعت نامہ حاصل کرے اور پشاور میں افغانوں کو کہا جاتا کہ امیر کابل جہاد کرے تو اس وقت بیشک جہاد میں شریک ہو جاؤ لیکن بغیر بادشاہ کے جہاد ناجائز ہے اس لئے عام بدنظمی سے پرہیز کرو اسی طرح حاجی ترنگ زئی اور دوسرے مجاہدین کا کام رک گیا بلکہ حاجی ترنگ زئی کے آدمی اور ہندوستانی مجاہدین کے کارندے سب اسی کام پر مامور ہو گئے کہ وہ امیر کابل کے نام بیعت نامے حاصل کریں یہ انگریزی روپیہ انھیں لوگوں کے ہاتھ یاغستان میں تقسیم ہوا۔ اس کے سرانجام دینے والے نائب السلطنت (امیر نصر اللہ خاں) تھے تمام بیعت نامے ان کے دفتر میں محفوظ رہتے تھے۔ امیر صاحب نے اس "ترکی جرمن" ہندی وفد کو یہ جواب دیا کہ جب تک امدادی فوجیں افغانستان نہ پہونچ جائیں اس وقت تک روس اور انگریز دونوں کے خلاف اعلان جنگ خلاف مصلحت ہے البتہ جس وقت ترکی جرمن فوج کا پیش خیمہ افغانستان پہونچ گیا اسی دن اعلان حرب کیا جائے گا۔ دوسری طرف روسیوں نے اور انگریزوں نے تمام راستے روک لئے تھے اور انگریزی فوج کا عراق پر حملہ محض اس پیش قدمی کے

روک لینے کے لئے تھا۔ اسی دوران میں یہ بھی کہا جاتا کہ اگر روس کا خطرہ دفع ہو جائے تو سرحدی قومیں ہند پر حملہ کر سکتی ہیں اس خطرہ کو معلوم کرنے کے لئے ہندوستانی روسی وفد (ڈاکٹر متھرا سنگھ اور مرزا محمد علی کا وفد) تجویز ہوا تھا۔

جب روس کی قوت کمزور ہو گئی اور اس مشن کی معلومات سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ روس افغانستان پر حملہ نہیں کر سکتا تو نائب السلطنت کو جو لوگ ملتے تھے تو انہوں نے اپنا وعدہ پورا کرنے کا تقاضا کیا۔ سردار نائب السلطنت نے اعلیحضرت سے ذکر کیا۔ امیر صاحب نے جرگہ بلایا جس میں تمام فوجی افسر اور قومی بزرگ شریک تھے امیر صاحب نے اس مسئلہ میں رائے طلب کی تو سوائے سردار معین السلطنت (سردار عنایت اللہ خاں صاحبزادہ امیر حبیب اللہ خاں) کے سب نے متفقہ قرار دیا کہ لڑنا ضروری ہے۔ اہل شوریٰ کو اس نقطہ پر جمع کرنا سردار نائب السلطنت (امیر نصر اللہ خاں) کی قوت کا مظاہرہ تھا۔ امیر صاحب (اعلیٰ حضرت) حیران ہو گئے اور اپنے شاہانہ فیصلہ سے اس کو رد کر دیا۔ ایک معین السلطنت (سردار عنایت اللہ خاں) کیونکر امیر کا ہم خیال رہا۔ اس کی حقیقت یوں ظاہر ہوئی کہ انگریزوں نے اس کو اسی شرط پر ولی عہد قبول کر لیا ہے۔ یہ عجیب بات دنیا نے دیکھی کہ حضرت صاحب چہار باغ کو جو کہ معین السلطنت کے مرشد تھے انگریزوں نے مکہ معظمہ سے اس خدمت کے لئے بلایا اور معین السلطنت کو اپنے قومی اور مذہبی فیصلہ سے علیحدہ رکھنے میں کامیاب ہو گئے اور یوں خواب سنائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مامور کیا ہے کہ میں اس کام کو پورا کروں۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت اور سردار نائب السلطنت کا اتحاد ٹوٹ گیا اور افغانوں میں انقلابی آثار ظاہر ہونے لگے۔ سردار نائب السلطنت (امیر نصر اللہ خاں) کو یقین ہو گیا کہ اس تمام کارروائی سے مطلب میری ولایت (ولی عہد) کے فیصلہ کو انگریزوں کی تائید سے منسوخ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا اس نے انتظامی مشن کو ذرا ڈھیلا کر دیا اور سازشیں شروع ہونے لگیں۔ امیر حبیب اللہ عام بادشاہوں کی طرح اخلاقی عیوب سے پاک نہیں تھے۔ اب یہ مرض بہت ترقی کر گیا تھا اور شرفا کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ دراز کرنے لگے تھے اس میں بعض عفیف عورتوں نے عصمت دری کے بعد خودکشی کر لی۔ سردار عین الدولہ امیر امان اللہ خاں تمام خوبیوں سے آراستہ تھے۔ ان کی والدہ علیا حضرت کے مخاطب یعنی مشہور تھیں۔ معین السلطنت کا مخالف سے ملنا ان کا طبعی دام، تھا جشن کی سیر میں رات کو امیر صاحب پر بالا خانے سے گولیاں برسائی گئیں مگر امیر صاحب بچ گئے ابھی حرب عمومی ختم نہیں ہوئی تھی۔ مستوفی الممالک نے اس کا الزام سردار معین الدولہ اور

اس کے رفیقوں پر لگا یا۔ اس سے سردار نائب السلطنت (امیر نصر اللہ خاں) اور سردار معین الدولہ (امیر امان اللہ خاں) میں اتفاق ہو گیا۔ اس کے ساتھ محمود خاں طرزی اور سردار سپہ سالار (محمد نادر خاں) بھی مل گئے۔ اب یہ جماعت بہت قوی ہو گئی۔ یہ دونوں سردار معین الدولہ کے طرف دار تھے اور نائب السلطنت کو پسند نہیں کر سکتے تھے اس لئے کہ امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں جس قدر ظلم اور داخلی نظام میں خرابیاں ظاہر ہوئیں ان کا ذمہ دار براہ راست سردار نائب السلطنت تھا۔ اس طرح جس کا لوگ تجربہ کر چکے ہوں اس کو دوبارہ بادشاہ نہیں دیکھنے۔ معین السلطنت (امیر عنایت اللہ خاں) ایک سادہ مزاج تھا ایسے ایسے سیاسی انقلاب میں اس پر اعتماد نہیں ہو سکتا تھا اور اس وقت تو وہ علانیہ باپ کا طرف دار تھا سردار امان اللہ خاں کی شرکت سے انقلاب کی تکمیل میں بہت آسانی ہو گئی۔ علیا حضرت صاحبہ (والدہ امیر امان اللہ خاں) امیر صاحب کی خانگی زندگی پر حادی تھیں امیر صاحب کو ان کے واسطہ سے پیغام پہنچایا گیا کہ اگر وہ اپنی بداخلاقی سے باز نہ آئے تو ان کی خیر نہیں مگر اس کا ان کے مزاج پر الٹا اثر ہوا۔ اس طرح یہ ڈراما سوچا گیا کہ امیر صاحب کو قتل کر دیا جائے تو وہاں نائب السلطنت کو امیر مان لیں تاکہ معین السلطنت (امیر عنایت اللہ خاں) کا حق زائل ہو جائے اور پھر نائب السلطنت کے مقابلہ میں امیر امان اللہ خاں آجائے اور ان کو ختم کر دیا جائے کئی موقعوں پر ذرا سی فروگذاشت کی وجہ سے تمام کام بگڑ نا رہ گیا۔ لیکن خدا کو منظور تھا اس لئے یہ سارا معاملہ بخیر و خوبی اس طرح انجام پذیر ہوا جس طرح سوچا گیا تھا۔ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے پہلے دن استقلال کا دعویٰ کیا اور ہم قید و بند سے آزاد ہو گئے۔ الحمد للہ علیٰ ذلک

امیر امان اللہ خاں سے ہمارا تعارف

ہم نے بعض اشد ضرورتوں کی وجہ سے ڈاکٹر میر عزت بیگ سے ایک ہزار روپیہ ایک سال کے وعدہ پر قرض لئے تھے جب یہ مدت پوری ہونے کو ہوئی تو ہم مستوفی کے پاس نظر بند تھے روپیہ کہیں سے لے کر ادا نہیں کر سکتے تھے اور اس عدم ادائگی کا اثر ہمارے مستقبل پر بہت برا ہوگا۔ اسے ہم خوب سمجھتے تھے۔ ہم نے مجبوراً سردار معین الدولہ کی خدمت میں اپنی ضروریات مفصل لکھ کر عرض کیا کہ مکمل بارہ سو روپیہ ایک سال کیلئے ضرور دلوایا جائے۔ یہ دو سو روپیہ زائد ہم نے آغا سید علی بخاری کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے لکھے تھے

ایک عرصہ سے وہ بھی پشاور سے ہجرت کر آئے تھے اور امیر صاحب نے انھیں ہم سے علیحدہ نظر بند کر دیا تھا جس وقت سید الاحرار مولانا محمد علی مغفور ہمیں رخصت کرنے کے لئے دہلی میں ملے آغا صاحب مرحوم ان کے پاس تھے۔ الغرض سردار معین الدولہ نے روپیہ شام کو مخفی مستوفی کے گھر پہونچا دئے۔ اس سے پہلے ایک دفعہ سردار نے ہم کو اپنے پاس بلایا تھا اور مستقبل کے متعلق اشارہ کنایہ سے باتیں ہوتی رہیں۔ یہ ملاقات ہمارے خاص کاموں میں سے تھی۔ خدا کے فضل سے اس میں کامیاب رہے۔ ہمارے متعلق مفصل معلومات سردار معین الدولہ کو سرداران محمود طرزی اور سپہ سالار سے ملتی رہتی تھیں۔ شروع میں ہم شیخ ابراہیم سے ملے تو اس نے ہمیں دولت افغانیہ کے تمام اراکین کے متعلق مفصل اطلاعات دیں۔ جب سردار نائب السلطنت اور سردار معین السلطنت کے معاملات تبلا چکے تو آخر میں کہتے ہیں کہ پس پردہ ایک اور قوت ہے جو نہایت سنجیدگی سے باقاعدہ بڑھ رہی ہے اور وہ سردار معین الدولہ ہے اس کے بعد اول ہماری ملاقات ان سے نہ ہو سکی۔ مگر جب کبھی ہم ان سے ملے تو اس طرح جیسے بادشاہ ہونے والے شہزادہ سے ملنا چاہیئے۔ جب امیر حبیب اللہ خاں جلال آباد میں قتل ہوئے اس وقت ہم مستوفی کے گھر نظر بند تھے اور مولانا سیف الرحمن کی زیر نگرانی رہتے تھے مولانا سیف الرحمن کے کاموں سے متجاہل نگران سے معاملہ کرتے رہے ہمیں بعض سخت تکلیفیں پہنچیں۔ مولانا نہیں چاہتے تھے کہ ہمیں واقعات کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہوں۔ مگر خدا کی قدرت اڑتی چڑیا ہمارے کانوں میں بہت کچھ کہہ جاتی تھی۔ بعض حصہ ہم فوراً سمجھ لیتے بعض اوقات واقعہ گذرنے پر حقیقت منکشف ہو جاتی۔ جب جلال آباد پہونچے تو ایک ہفتہ تک ہم پریشان اور دیہات میں پھرتے رہے۔ جب امیر امان اللہ خاں کابل میں مستقل ہو گئے تو انھوں نے ہمیں جلال آباد سے طلب فرمایا۔ جب ہم دربار میں حاضر ہوئے تو مسکرا کر فرمایا "من ہموں ہستم" اس خاص ملاقات کی طرف اشارہ فرمایا۔

(ذاتی ڈائری از صفحہ ۱۲۵ تا ۱۳۰)

امیر امان اللہ کا عہد حکومت ابتدا میں

اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کی سلطنت میں چند روز ہم نے اپنی حکومت کی ذرا سی جھلک دیکھ لی جس قدر وہ اپنے

وزراء کی پہلی صف پر اعتماد کرتے تھے ہمارے ساتھ ان کا معاملہ اسی کے قریب قریب تھا۔ ہم ان کی پرائیویٹ مجلسوں میں شامل ہوتے تو جیسے وہ اپنے خاندان اور قومی بزرگوں کا احترام کرتے تھے ہم سے ان کا برتاؤ اسی طرح کا ہوتا۔ ہم نے کوئی مشورہ عرض نہیں کیا جو قبول نہ فرمایا ہو۔ ہم نے کوئی سفارش نہیں کی جو رد کر دی گئی ہو۔ ایسی حالت میں ہم سے جو کچھ ہو سکتا تھا ہم نے سلطنت افغانستان کے مستقبل و مستحکم بنانے میں کوئی دریغ نہیں کیا۔ یہ تمام سیاسی معاملات ابھی تک تاریخ کے درجہ تک نہیں پہونچے اس لئے ہم تفصیلات نہیں لکھ سکتے۔ حضرت مولانا شیخ الہند کی وفات پر جس شان بے نظیر سے مجلس فاتحہ خوانی منعقدہ کی وہ ایک یادگار ہے۔ میں اس تقریر کا ایک فقرہ نقل کرتا ہوں "مولانا محمود الحسن یک کار را شروع کردند من او را پورا میکنم" راجہ مہندر پرتاپ جب یوروپ سے واپس آئے اور اعلیٰ حضرت سے خاص ملاقاتیں کر چکے تو اعلیٰ حضرت کو آئیڈیل کنگ لکھا کرتے تھے۔ ہم نے اعلیٰ حضرت سے ہندوستانی تعلیم گاہ کھولنے کی اجازت مانگی تھی۔ لیکن برٹش وزیر نے افغان وزیر خارجہ کو اس کے خلاف راضی کر دیا کہ ہمیں ہندوستانی یونیورسٹی کے لئے موقع نہیں دیا جائے گا۔ مگر اس کی قیمت اسے کافی مقدار میں ادا کرنی پڑی۔ اگر ہمارے رفقاء نوجوانوں کا مستقبل ہمارے سامنے نہ ہوتا اور حکومت موقتہ کی بعض کارروائیوں میں ہمیں ضروری شکست نہ ہوتی تو ہم اعلیٰ حضرت کی سلطنت سے شاید باہر جانے پر راضی نہ ہوتے جب سے کابل میں شیخ محمد ابراہیم کی جگہ مرزا محمد علی عرف احمد حسن کو اپنا شریک عمل بنایا اسی وقت احمد حسن کا مددگار ظفر حسن تجویز کر لیا تھا۔ جب احمد حسن یا محمد علی اشتراکی جماعت میں شامل ہو گیا تو ہمارا معتمد اس زمانہ میں ظفر حسن رہا۔ افغانی انگریزی محاربہ میں ظفر حسن سردار سپہ سالار کے ساتھ ٹل کے محاذ پر تھا۔ وہاں اس کے کارنامے بہت زیادہ تحسین کے قابل سمجھے گئے اور سلطنت افغانیہ اسے برائے نام خدمت کرنے پر معزز تنخواہ دیتی رہی جس سے ہمارے کئی ہندوستانی بھائی گذارہ کرتے رہے ظفر حسن کے مددگار اللہ نواز خاں مقرر ہوئے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں ظفر حسن کے ہم جماعت تھے۔ افغانی انگریزی محاربہ میں وہ ہندوستان بھی آئے کابل سے رخصت ہونے پر ہم نے اپنی تمام دستاویزات ان کی تحویل میں رکھ دی تھیں۔ کہتے ہیں کہ سقاوی فتنہ میں وہ تمام کاغذات کھوئے گئے۔ ہمیں بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاغذات برٹش حکومت

سے ہاتھ آگئے ہیں۔ اللہ نواز نے سقاو کے مقابلہ میں خوب کام کیا اس لئے افغانستان کی موجودہ حکومت میں وہ ایک معزز کارکن مانے جاتے ہیں۔ مہاجرین کی کثیر تعداد میں ہمارے بعض عزیز بھی ہم سے ملے۔ مولوی احمد علی کو ہم نے ہندوستان واپس بھیجنا ہی مناسب خیال کیا۔ منت سے ہم اسے اس پر راضی کر سکے۔ ڈاکٹر نور محمد سندھی حیدرآباد سے پہونچ گئے تھے وہ ہمارے ساتھ رہے۔ حکومت موقتہ کا کام جب اعلیٰ حضرت نے روک دیا تو ہم نے کابل کانگریس کمیٹی بنادی جس کا روح رواں ڈاکٹر نور محمد تھا۔ اس کا الحاق گیا کانگریس میں منظور ہوگیا۔ ڈاکٹر نور محمد ہماری کانگریس کمیٹی کا افسر تھا۔ مہاتما گاندھی اور کانگریس کے نوجوان ممبر سے جانے جاتے تھے۔ ہمارے مکرم ڈاکٹر انصاری کانگریس کے سکریٹری تھے اس لئے یہ الحاق کا مسئلہ آسانی سے طے ہوگیا۔ ہماری کانگریس کمیٹی سب سے پہلی وہ کمیٹی ہے جو برٹش امپائر سے باہر قائم ہوئی تھی۔ تیسرے نوجوان جن کا ذکر ہم ضروری سمجھتے ہیں وہ شیخ محمد اقبال شیدائی ہیں میرا مولد سیالکوٹ ہے اور شیدائی بھی سیالکوٹی ہیں۔ ہم وطن کی محبت میں ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوئے۔ شیدائی صاحب سے ہمارا پرانا کوئی رشتہ نہیں تھا اس لئے خیالات میں ہم زیادہ متفق نہ ہوئے ہوں مگر عملاً ہم ایک بن گئے تھے اور آگے چل کر خیالی افتراق بھی کم ہوگیا۔ میں لکھ چکا ہوں کہ شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ میرا بھتیجا عزیز احمد پہلے پہونچ چکا تھا میرے ساتھ جو تین آدمی آئے تھے ان میں سے ایک میرا بھتیجا محمد علی بن حبیب اللہ تھا۔ راجہ صاحب کے گھر پر میں نے محمد علی کو بھیجا تھا اور قندھار کے محاذ پر سردار اعتماد الدولہ کی خدمت میں اس کو معین کیا تھا۔ سردار اعتماد الدولہ نے اس کی خدمات کے اعتراف میں خاص خلعت سے سرفراز فرمایا تھا۔ میرے یہ دونوں عزیز میری خاص خدمات کے متکفل رہے۔ کھانا، کپڑا، دوا کے متعلق مجھے کسی دوسرے کی امداد کی ضرورت نہ ہوئی۔ ہماری کابل کی زندگی کے آخری ایام میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد جیل میں تھے اور ہمارے رفیقوں کو ہم سے علیحدہ کرنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ ایسے حالات میں آرام سے بیٹھکر شاہی مہمانی کا لطف اٹھانا ناممکن تھا۔ سوویٹ رشیا سے تعلقات کی ابتدا اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کی اجازت اور مصلحت سے بروئے کار آئی۔ جس میں راجہ مہندر پرتاپ نے کافی حصہ لیا۔ انھیں کی تجویز پر ہمارے نوجوان آتے جاتے رہے۔ جب ماسکو میں ہندوستانی اشتراکی جماعت قائم ہوئی اور اس کا مرکز تاشقند قرار دیا گیا تو اس کے لیڈر جو مہندر ناتھ رائے مقرر ہوئے جو اسے کئی سال تک چلاتے رہے اس لئے ہمارے دوست بن گئے۔ اب ہم نومبر ۱۹۲۲ء میں دریائے جیحون

عبور کر کے ترمذ میں سوویٹ کارندوں کے مہمان ہوئے اور دنیا کی انٹرنیشنل سیاست کا نیا مشاہدہ شروع کر دیا ہم نے اپنے حالات کسی قدر اختصار سے اپنے سیاسی پروگرام کے شروع میں لکھے ہیں اور مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے بعض واقعات زندگی عرب دوستوں کی واقفیت کے لئے عربی میں لکھے۔ مگر یہ بات ہمیشہ محسوس ہوتی رہی کہ اگر کسی قدر حالات کابل کے قیام اور وہاں سے رخصت ہونے کے متعلق مستقل تحریر نہ کریں گے تو اس اختصار کو سمجھنا بہت مشکل ہو گا۔ الحمد للہ آج اس سے بھی فارغ ہوئے وصلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و آلہ وصحبہ وسلم و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ ۲۵ جمادی الثانی ۱۳۵۲ھ بلدۃ الحرام حارۃ الباب عبید اللہ سندھی سابق ناظم جمعیۃ الانصار و سابق ناظم نظارۃ المعارف دہلی۔

(ذاتی ڈائری از صفحہ ۱۳۳ تا آخر)

از مولانا عبید اللہ مرحوم

مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم پر اجمالی نظر

مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم آزادی ہند کے نصب العین پر کابل بھیجے گئے اور سات سال وہاں رہے پھر سات مہینہ ماسکو (روس) میں تین سال انگورہ (ٹرکی) میں پھر تقریباً بارہ سال مکہ معظمہ میں غرضکہ پچیس برس پردیس میں گذارنے کے بعد مارچ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس ہوئے جس مقصد اور نصب العین کے لئے اس جلاوطنی کو ان کے واسطے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مقرر فرمایا تھا۔ وہ پھولوں کی سیج نہ تھی بلکہ نہایت کٹھن اور کانٹوں سے بھری ہوئی وادی تھی جس میں قدم قدم پر موت کا خطرہ اور مصائب کا انبار تھا۔

مولانا موصوف نے جس جوانمردی اور مستقل مزاجی سے ہلاکت سے بھری ہوئی مصیبتوں کو جھیلا ہے اور ملک و وطن اور تمام ملت ہندوستانی اور مسلمانوں کے لئے جد و جہد کی ہے وہ صرف ان کا حصہ تھا باوجودیکہ قدم قدم پر مشکلات طرح طرح کی پیش آئیں اور اپنوں اور معتمد علیہ لوگوں نے خیانتیں بھی کیں مگر انھوں نے مایوسی کو راہ نہ دی اور نہ ان کا قدم ڈگمگایا۔ ان کی جد و جہد اور کوشش جاری رہی اور پھر مختلف قسم کی کامیابیوں نے قدم بھی چومے۔ اگرچہ مولانا موصوف نے بہت سے واقعات کو اپنی اس ڈائری میں ظاہر نہیں فرمایا ہے تاہم اس مفصل بیان میں موصوف کی ذکر کردہ کارروائیوں سے اہل بصیرت عمدہ سے عمدہ

نتائج نکال سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ موصوف نے کابل پہنچکر ہندوستان کی آزادی کی راہ میں وہ کامیابیاں حاصل کیں جو کہ بغیر ان کے حاصل نہیں ہو سکتی تھیں اور جن کا حاصل ہونا ازبس ضروری تھا (الف) انھوں نے جرمن ممبران مشن کو ہندوستان کی آزادی اور مستقبل کے متعلق صحیح پوزیشن اور حکمت عملی سمجھائی اور ان کو ہمنوا بنایا (ب) راجہ مہندر پرتاپ صاحب کو صحیح راستہ سمجھایا اور ان کو متفق کیا اور غلط راستہ سے ہٹایا (ج) انھوں نے روسی مشن، جاپانی مشن، ترکی مشن میں عمدہ سے عمدہ اور مفید کارروائیاں انجام دیں اگرچہ موانع خارجیہ کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی بلکہ ممبروں کی بعض کمزوریوں نے نقصان بھی پہونچایا (د) انھوں نے اپنا قوی اثر اراکین دولت افغانیہ میں پیدا کیا اگرچہ امیر حبیب اللہ خاں صاحب کو جنگ آزادی پر عملی طور سے آمادہ نہ کر سکے اور انگریزوں کی ان کے پہونچنے سے پہلی ڈپلومیسی اس میں رکاوٹ ہوئی تاہم امیر صاحب مرحوم نے بہت زیادہ تاثر حاصل کیا اور ان کے لئے مفید مشورے دیے جس میں سے ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت بھی ہے اور ان کے لئے کامیابیوں کی راہ نکالی (ہ) انھوں نے عمومی طور سے اراکین دولت افغانیہ کو اپنا ہم خیال بنالیا جس کا کھلا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ روسی مشن کی واپسی کے بعد جب امیر صاحب شہید نے جرگہ بلا کر انگریزوں سے جنگ کی رائے لی تو تمام ممبران جرگہ انھیں کے ہم خیال اور ہم زبان تھے۔ بجز سردار عنایت اللہ خاں کوئی بھی جنگ آزادی میں امیر شہید کا ہمنوا نہ ثابت ہوا جس کو دیکھ کر امیر صاحب مرحوم حیران ہو گئے اور اپنے خصوصی اختیار ملوکانہ سے ان کے اتفاق رائے کو رد کیا جس کا نتیجہ نہایت قبیح صورت میں ظاہر ہوا (و) انھوں نے آئندہ آنے والے امیر امان اللہ خاں کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ اقتدار پا جانے کے بعد بالکل ان کے ہم خیال پائے گئے اور استقلال کامل دولت افغانیہ کا اعلان کر بیٹھے۔ (نوٹ) چونکہ انگریزوں نے امیر عبدالرحمن خاں مرحوم کو روس سے بلا کر تخت کابل پر بٹھایا تھا اس لئے وہ دولت افغانیہ کو اپنی ماتحت ریاست شمار کرتے تھے فارن پالیسی میں وہ ہر طرح انگریزی کی دست نگر رہتی تھی اور مثل حیدرآباد وغیرہ برطانیہ کی محتاج تھی کسی خارجی ملک میں کوئی کام نہیں کر سکتی تھی اور نہ براہ راست ان سے کوئی تعلق قائم کر سکتی تھی اس لئے ہر ترقی میں رکاوٹ ہوتی تھی۔ اس اعلان استقلال پر انگریزی حکومت چراغ پا ہو گئی اور بالآخر افغان انگریز جنگ ظہور پذیر ہوئی (ز) انھوں نے تدابیر جنگ میں پورا حصہ لیا اور ہر محاذ میں جنود اللہ جماعت کے مخلص اور جانباز

نمائندے سرداروں کے ساتھ کیے جن کی مساعی کی حکومت افغانیہ نے نہایت قدر کی۔ فقط مشرقی محاذ پر کوئی نمائندہ نہ ہونے کی وجہ سے خیانت ہوئی اور پسپائی کی نوبت آئی تاہم فتحیابی دولت افغانیہ کی رہی اور برطانیہ کو استقلال افغانستان تسلیم کرنا پڑا۔ اسی پر ہمفرے سفیر برطانیہ کابل کہتا ہے کہ یہ فتح دولت افغانیہ کی نہیں بلکہ عبیداللہ کی ہے اس استقلال کے بعد دولت افغانیہ مثل ممالک مستقلہ آزاد تسلیم ہونے لگی۔ (ح) انھوں نے راجہ مہندر پرتاپ کی عزت اور مقدرت ایسی دولت افغانیہ میں بڑھوادی کہ جس کا وہم وگمان بھی ان کو اور دوسروں کو نہ تھا (ط) انھوں نے ممبران جنود اللہ اور دیگر ہندوستانی نوجوانوں سے ایسے ایسے کام لیے کہ دولت افغانیہ اور اس کے ارکان نہایت ممنون اور شکر گذار ہوئے (ی) انھوں نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی تحریک کو اس قدر ملبند اور مقبول کردیا کہ امیر امان اللہ خاں صاحب نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر نہایت اخلاص سے بے نظیر شان کے ساتھ مجلس فاتحہ خوانی منعقد فرمائی اور اس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا مولانا محمود الحسن یک کار را شروع کردند من او را پورا میکنم" جس سے نہ صرف حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ہم خیالی اور ہم نوائی معلوم ہوتی ہے بلکہ ظاہر ہوتا ہے کہ امیر موصوف پختہ ارادہ اور عمل آزادی ہند اور انگریزوں کے نکالنے کا کر رہے تھے یا کرنیوالے تھے۔ اسی سے انگریزی قصر شہنشاہیت میں زلزلے پیدا ہوئے اور امیر موصوف کے خلاف تدبیریں کی گئیں تا اینکہ تخت کابل سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مولانا عبیداللہ صاحب کی یہ نہایت عظیم الشان کامیابی تھی جس کے لیے کابل کو مرکز بنایا گیا تھا۔ مولانا عبیداللہ صاحب نے جو کامیابیاں صیغۂ راز میں رکھی ہیں۔ اور ان کے متعلق صفحہ ۱۳۲ پر فرماتے ہیں۔

"یہ تمام سیاسی معاملات ابھی تک تاریخ کے درجہ تک نہیں پہونچے اس لئے ہم تفصیلات نہیں لکھ سکتے"

نہ معلوم کیا ہوں گے مگر یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ عظیم الشان امور ہیں، بہرحال سرسری نظر سے دیکھنے والا انسان ان مذکورہ نتائج کو ضرور سمجھ سکتا ہے نیز اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب ہند کے لئے انھوں نے بار بار تحریریں ہندوستان میں بھیجیں جن میں سے بعض میں کامیابی ہوئی اور بعض میں خیانتیں ہوئیں جن میں سے وہ خطوط اور تحریریں بھی ہیں جو کہ کپڑوں پر لکھی گئیں جن کو معتمد علیہ عبدالحق نومسلم نے ایک خاں بہادر حق نواز خاں

تک پہونچا دیں، اور اس نے انگریز حاکم سرائیکل اوڈوائر کو دیدیں (یہ نہیں معلوم کہ ان میں کیا مضمون تھا) علاوہ ازیں بہت سی تحریریں اور کاغذات بہت مرتبہ چوری بھی ہوئے جن کی وجہ سے انگریزوں کو بہت سے رازہائے سربستہ معلوم ہوئے اور انھیں کی بنا پر رولٹ رپورٹ مرتب کی گئی جس کو ہم عنقریب ذکر کریں گے یہ امور حقیقتاً عام ہندوستانی پبلک کے جذبات کے ترجمان ہیں۔ اسی قسم کے جذبات کے نام پر انگریز۔ فرانس اور روس وغیرہ ہمیشہ یورپین اقوام کے بارہ میں انقلاب کی حمایت اور تائید کرتے رہے ہیں اور یونان بلگیریا مانٹی نگرو سرویا کریٹ رومانیہ ہرزی گوینا۔ ارمینیہ وغیرہ کو اس کے عشر عشیر پر آزاد کراتے رہے ہیں۔

افسوس کہ مولانا عبید اللہ صاحب قبل از خروج انگریز ۲۱ اگست ۱۹۴۴ء بمقام دین پور وفات فرماگئے انا للہ وانا الیہ راجعون

(۲) مولانا مرحوم کے علاوہ جن مشاہیر کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحریک میں ہمنوا اور ہم خیال بنایا ان میں سے نہایت سرگرم ممبر جناب حاجی ترنگ زئی صاحب بھی ہیں۔

ترنگ زئی تحصیل چارسدہ ضلع پشاور میں موضع اتمان زئی (جس کے رہنے والے خان برادر عبد الغفار اور ڈاکٹر خاں صاحب ہیں) کے قریب ایک گاؤں ہے حاجی صاحب موصوف اسی گاؤں کے باشندے تھے ان کا نام نامی فضل واحد تھا لوگوں میں اپنے نام سے مشہور تھے۔ نہایت متقی پرہیزگار اور صاحب علم وعمل اور مشہور پیران طریقت وسلوک میں سے تھے اور حضرت مولانا شاہ نجم الدین صاحب مرحوم معروف بہ ہڈے ملا کے خلیفہ اور جانشین تھے حضرت مولانا نجم الدین صاحب (ہڈے ملا) حضرت مولانا شاہ عبد الغفور صواتی معروف بہ حضرت صوات صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ حضرت صوات صاحب اور حضرت ہڈے ملا صاحب ان اطراف (صوبہ سرحد) میں بہت زیادہ با اثر غیور مجاہد گذرے ہیں۔ ان حضرات نے اپنے اپنے زمانہ میں انگریزی اقتدار کے خلاف سالہا سال علم جہاد بلند رکھا تھا اور انگریزی اقتدار کو حد سے زیادہ نقصان پہونچاتے رہے تھے۔ حریت اور آزادی کے جذبات ان کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے تھے۔ حاجی فضل واحد صاحب (حاجی ترنگ زئی صاحب) بھی اپنے پیران طریقت کے قدم بہ قدم تھے۔ جذبات حریت وآزادی اور جہاد دینی کے حد سے زیادہ دلدادہ تھے۔ انگریزی علاقہ ضلع پشاور میں خدمات دینیہ تبلیغ اور تسلیک میں ابتدا سے مشغول تھے۔ ضلع پشاور اور یاغستان میں ہزارہا ہزار ان کے

مریدین اور مخلصین تھے اور انتہائی شہرت اور مقبولیت کے مالک تھے۔ ان اطراف میں عام مسلمانوں میں جس قدر قبولیت ان کی تھی کسی دوسرے پیر کی نہ تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے بار بار مولانا عبید اللہ صاحب اور مولانا محمد علی صاحب کو ان کی خدمت میں بھیجکر اپنی مشن میں داخل کیا اور جہاد حریت کے لئے آمادہ کیا اور استدعا کی کہ وہ اپنے وطن سے آزاد علاقہ (یاغستان) میں ہجرت کر کے چلے جائیں اور وہاں کے مرکز کو سنبھالیں اور اپنے شاگردوں کو (جو کہ بیشمار تھے اور اپنے اپنے علاقوں میں تعلیم و تدریس وغیرہ میں مشغول تھے) لکھا کہ وہ حاجی ترنگزئی صاحب کی تابعداری کریں اور ان کی امداد و اعانت میں کسی کوتاہی کو روا نہ رکھیں۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں اعلان جنگ عمومی کے بعد حاجی ترنگ زئی صاحب وہاں پہونچے اور جہاد آزادی کے جھنڈے کو بلند کیا اور پلٹنوں کی پلٹنیں صاف کر دیں۔ کیونکہ یہ جنگ پہاڑی مقامات میں واقع ہوئی یہ جماعت مجاہدین کی پہاڑی مقامات کی جنگ سے بخوبی واقف اور ماہر تھی بخلاف انگریزی فوجوں کے کہ وہ میدان کی لڑائیوں میں تو کچھ کام توپوں، ٹینکوں، مشین گنوں وغیرہ کے سایہ میں کر لیتے تھے مگر پہاڑوں میں بالکل ناکامیاب رہتے تھے۔ ان مجاہدوں کو نشانہ لگانے میں اس قدر مشق تھی کہ ان کا کوئی نشانہ خطا نہیں جاتا تھا اور نہ کوئی کارتوس ضائع ہونے پاتا تھا۔ پہاڑوں میں پتھروں، چٹانوں، جھاڑیوں کی آڑ سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے تھے اور انگریزی فوجیوں کو جو کہ میدان اور نیچی سطحوں میں صف باندھے توپوں اور مشین گنوں اور ٹینکوں کو استعمال کرتے رہتے تھے نشانہ بنا کر برباد کر دیتے تھے۔ اس کی وجہ سے انگریزی فوجیں مالی اور جانی نقصان سے بہت زیادہ دوچار ہوئیں نیز جنگ عمومی کی وجہ سے تجربہ کار اور پرانی آزمودہ کار فوجیں بلجیم، فرانس وغیرہ یورپ وغیرہ کے میدانوں میں بھیجدی گئی تھیں۔ ہندوستان میں بہت کم تعداد اور نو آزمودہ سپاہی اور پلٹنیں باقی رہ گئیں تھیں۔ غیور اور بہادر سرحدیوں اور مجاہدوں کے مقابلہ میں پرانی اور آزمودہ کار برطانوی فوجوں کے چھکے چھوٹ چکے تھے جیسا کہ ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۳ء تک چار مرتبہ حملے کر کے برطانوی افسر دیکھ چکے تھے اور بالآخر ڈیوائڈ اینڈ رول (تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو) اور تمدّد پاشی (سونا بہاؤ) کی پالیسی عمل میں لا کر جان چھڑائی تھی۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء کی لڑائی کی مہم کے متعلق ڈبلو ڈبلو ہنٹر فوجی معتمد افسروں سے نقل کرتے ہوئے صفحہ ۴۰ میں لکھتا ہے "۱۸۶۳ء کی لڑائی میں ہم نے کافی نقصان اٹھانے کے بعد یہ سبق حاصل کیا تھا کہ مجاہدین کے کیمپ کے خلاف مہم روانہ کرنا تریپن ہزار (۵۳۰۰۰) جنگجو اور بہادر انسانوں کی مجموعی طاقت کے ساتھ جنگ کرنا ہے۔ ملک کے دشوار گذار ہونے کی وجہ سے ہمارے سرحدی افسر قبائل کے مزاج اور

ان کے آپس کے تعلقات کے متعلق اکثر متذبذب رہتے ہیں اور جب کبھی ان باغیوں کو شکست ہوتی ہے تو وہ صرف یہاں کے اندرونی دشوار گزار دروں میں چلے جاتے ہیں (صـ) ۔ ہماری ہندوستانی مسلمان) ڈاکٹر ہنٹر پھر تفصیلی واقعات افسران فوج سے نقل کرکے برطانوی فوجوں کی ناکامی، پسپائی، مشکلات، بربادی وغیرہ کا نقشہ کھینچتا ہے حالانکہ حکومت ہند و پنجاب اور ملٹری افسروں کی ہر قسم کی امداد کے پہونچنے کو بھی تسلیم کرتا ہے دیکھو از صفحہ ۴۴ تا صفحہ ۵۸

"طرح طرح کے نقصانات اور مصائب کو لکھنے کے بعد اخیر میں کہتا ہے کہ بہرحال جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑا تو اس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں موجود تھیں ۔ پنجاب گورنمنٹ نے اس مہم کے نتائج کو بیان کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اس سے پہلے اور کسی موقعہ پر بھی کوہستان میں اس قدر شدید اور دیرپا جنگ نہیں ہوئی اور یہ کہ ان مجاہدین نے قبائل کا ایک خطرناک اتحاد پیدا کر لیا تھا اور اس اتحاد میں ان کی رائے کو بہت وقعت حاصل تھی ۔ نیز مجاہدین بیضرر اور بے طاقت مذہبی مجنون نہیں ہیں بلکہ یہ ہندوستان میں ہماری سلطنت کے لئے ایک مستقل خطرہ ہیں الخ" صـ ہمارے ہندوستانی مسلمان

دوسری جگہ لکھتا ہے مجاہدین نے سرحدی قبائل میں جو اقتدار حاصل کر لیا تھا ہم نے اس کا غلط اندازہ لگایا تھا وہ لوگ جو ان کے ساتھ مذہب کی بنا پر شامل ہوئے تھے فتح یا شہادت کی امید پر بڑے پرجوش اور بے صبر ہو رہے تھے اور وہ قبائل جو ذرا کم متعصب تھے انھیں اس خدشہ کو کام میں لا کر اکسایا گیا تھا کہ ان کے علاقہ پر انگریزی فوجیں چڑھ آئی ہیں یا ان کا علاقہ میدان جنگ بنایا گیا ہے اس طرح شوق اور رقابت نے قبائلی لوگوں میں آگ لگا دی تھی اور وہ تربیت یافتہ فوج کی ہر کوشش کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے"

ہندوستانی مسلمان صـ ۵۷

پھر آخر میں لکھتا ہے " جس کام کو ہماری فوج سرانجام نہ دے سکی اسے اندرونی اختلافات اور اور ڈپلومیسی اور حکمت عملی نے پورا کر دیا شروع کر دیا ۔ اس سے پہلے ۲۵ نومبر کو پشاور کا کمشنر بونیر کے بعض قبائل کے اتحاد کو توڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا ۔ اس نے ایک اور گروہ کو جس کی تعداد ۲۰۰۰ تھی اپنے گھروں کو واپس جانے کے لئے بھی آمادہ کر لیا تھا اور سوات کے پیشوا کو بھی اپنے خاص مریدوں کو منتشر کرنے پر راضی کر لیا تھا ۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار اس برگشتگی کو بھانپ کر خود علیحدہ ہو گئے اور باقی ماندہ لوگوں میں بے اعتمادی کا بیج بو گئے ۔ الخ" صـ ۵۸ ہمارے ہندوستانی مسلمان

یہ تمام وہ امور جو کہ پہلی مہمات ۱۸۶۰ء سے ۱۸۹۷ء وغیرہ میں واقع ہوئے تھے ان سے بدرجہا زائد اس جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں جمع ہوگئے تھے کیونکہ علاوہ ان امور کے جو مقامی طور پر سرحد میں روزمرہ پیش آتے رہتے تھے طرابلس، بلقان ٹرکی وغیرہ میں پیش آچکے تھے۔ جنگ لیبیا و طرابلس غرب اور جنگ بلقان کے خونیں واقعات مدتوں سے طشت از بام ہو رہے تھے دولت عثمانیہ (ٹرکی) کو جنگ میں کھینچا جا چکا تھا اس کے جنگی جہازوں کے چھین لینے وغیرہ کے غاصبانہ امور نے مجاہدین اور قبائل کو حد سے زیادہ مشتعل کر دیا تھا اور ہر طرف یہ مشہور تھا کہ مسلمانوں کی رہی سہی حکومت اسلامی ترکی کو بھی عیسائی یوروپین طاقتیں صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے لئے کھڑی ہوگئی ہیں۔ جنگ عمومی کی چنگاریاں ہر طرف سلگ گئی تھیں۔ اس لئے بے حد اور بے شمار جوش پھیلا ہوا تھا جس کو تحریک آزادی کے ارکان بڑی قوت کے ساتھ تمام مجاہدین اور قبائل میں پھیلا چکے تھے اور پھیلا رہے تھے۔ چنانچہ حاجی ترنگ زئی صاحب اور ان کے رفقاء نے بہت مستعدی اور جوانمردی کے ساتھ اس کا انتظام کیا۔ یہ انتظامات ایسے امور نہ تھے کہ راز سربستہ بن کر رہ جاتے انگریزی محکمہ خفیہ پولیس نے (جو کہ صوبہ سرحد میں بہت سرگرمی ہمیشہ سے رکھتا تھا اور اس زمانہ میں جنگ عمومی کی وجہ سے اس کی سرگرمیاں بہت ہی زیادہ اندرون ہند اور سرحد میں بڑھ گئی تھیں اور اس کے کارکنوں کا جال چاروں طرف آزاد علاقہ کے گاؤں گاؤں اور چپہ چپہ پر پھیلا ہوا تھا) ذرہ ذرہ کی خبریں حکام برطانیہ کو پہونچائیں چنانچہ پیش بندی کے طور پر انگریزی فوجیں قدیمی سرحدوں سے آگے یاغستان میں میلوں داخل ہوگئیں۔ اور متعدد مقامات پر قبضہ کر لیا۔ مجاہدین کب صبر کر سکتے تھے انھوں نے نہایت جوش اور جوانمردی سے یکے بعد دیگرے ایسے زوردار متواتر حملے کئے کہ پلٹنوں کی پلٹنیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ڈالیں اور پھر جو فوجیں آگے بڑھ گئی تھیں ان کی امداد اور رسد بند کر دی۔ اس طرح ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کا وارا نیارا ہوگیا اور سامان تو کروڑوں کا تلف ہوگیا۔ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ پہاڑی جنگ میں مجاہدین ہمیشہ کامیاب ہوتے رہے ہیں اور اعلیٰ درجہ کی مہارت جنگ اور پہاڑی تحفظات کی بنا پر انگریزی باضابطہ اور میدانی فوج ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور ہوتی ہے چنانچہ یہی ہوا انگریزی فوجیں توپوں اور مشین گنوں اور ٹینکوں وغیرہ سے حملے کرتی تھیں۔ مگر یہ سب چیزیں ضائع جاتی تھیں اور مجاہدین پہاڑوں کے دروں اور چٹانوں کی آڑ اور اونچے مقامات وغیرہ سے ایسے کارتوس اور گولیاں برساتے

تھے جو کہ ضائع ہونا جانتے ہی نہ تھے (حدود افغانستان میں کارتوس پیسے پیسے پر فروخت ہوتا تھا اس لئے بافراط موجود تھا۔ افغانستان اگرچہ بظاہر انگریزوں سے ملا ہوا تھا مگر ہتھیاروں کے متعلق اس کے حدود میں کوئی بندش نہ تھی اور نہ آجتک ہے) خلاصہ یہ کہ چند مہینوں کی جنگ میں انگریزوں کو انتہائی نقصان جان و مال کا اٹھانا پڑا اور تمام بلند دعاوی اور اولوالعزمیاں خاک میں مل گئیں بالآخر وہی پرانا طریقہ جو کہ پہلی جنگوں میں اور آڑے وقتوں میں انگریز اختیار کرتے رہے یہاں بھی کرنا پڑا۔ امیر حبیب اللہ خاں کو درمیان میں ڈالا گیا اور سرداران قبائل اور مجاہدین کو توڑ کر اور زرپاشی کی سبیل اختیار کر کے بچی کھچی سپاہ کو واپس لانا پڑا۔ جس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ اشرفیوں اور روپیوں کی بھرمار کر کے دیہات یاغستان کے سرداروں کو توڑ لیا اور یہ پروپیگنڈہ کرایا کہ جہاد بغیر بادشاہ کے شریعت اسلامی میں درست نہیں مسلمانوں کے بادشاہ ان اطراف میں امیر کابل امیر حبیب اللہ خاں ہیں تم ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کر کے منظم ہو جاؤ۔ جب امیر صاحب اٹھیں اور علم جہاد بلند کریں سب ان کے ساتھ ہو کر جہاد کرنا سردار نائب السلطنت امیر نصر اللہ خاں اس کے ناظم بنائے گئے اور تمام بیعت نامہ کے کاغذات ان کے پاس جمع ہونے لگے۔ اس پروپیگنڈے پر پانی کی طرح روپے بہائے گئے نتیجہ یہ نکلا کہ مجاہدین کی قوت کمزور ہو گئی۔ چند لڑائیوں کے بعد جن میں مجاہدین کو کامیابی اور انگریزوں کو ناکامی ہوئی تھی پانسہ پلٹ گیا۔ ادھر تو مجاہدین رسد اور کارتوس کے خرچ ہو جانے کی وجہ سے پورے اجتماع کو سنبھال نہ سکے تھے ادھر دیہاتوں کے مکھیا اور سرداران قبائل ٹوٹ گئے ادھر عوام امیر کابل کے پروپیگنڈے کی وجہ سے اپنے جوش و خروش کو قائم نہ رکھ سکے بالآخر حاجی صاحب اور ان کی جماعت کو چند مہینوں کے بعد شکست برداشت اٹھانی پڑی اور جماعت میں انتشار ہو گیا۔ مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم ڈائری صفحہ ۱۲۵ پر لکھتے ہیں۔

"انگریزوں نے کافی روپیہ امیر کو دیا کہ یاغستان میں تقسیم کرے اور اپنی سلطنت کے نام پر قبائل افغانیہ سے بیعت نامہ حاصل کرے اور پشاور میں افغانوں کو کہا جاتا

کہ امیر کابل جہاد کرے تو اس وقت تم بے شک جہاد میں شریک ہو جاؤ۔ لیکن بغیر بادشاہ کے جہاد ناجائز ہے۔ اس عام بدنظمی سے پرہیز کرو۔ اسی طرح حاجی ترنگ زئی اور دوسرے مجاہدین کا کام رک گیا۔ بلکہ حاجی ترنگ زئی کے آدمی اور ہندوستانی مجاہدین کے کارندے سب اسی کام پر مامور ہو گئے کہ وہ امیر کابل کے نام بیعت نامے حاصل کریں۔ یہ انگریزی روپیہ انھیں لوگوں کے ہاتھ یاغستان میں تقسیم ہوا۔ اس کے سرانجام دینے والے نائب السلطنت (امیر نصر اللہ خاں) تھے تمام بیعت نامے ان کے دفتر میں محفوظ رہتے تھے)"

پہلے سے امیر حبیب اللہ خاں صاحب سے چونکہ معاہدہ ہو چکا تھا اس لئے انگریز مطمئن تھے کہ وہ ہرگز انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے کھڑے نہ ہوں گے۔ اس لئے یہ کھیل کھیلا گیا معاہدہ میں امیر صاحب کو مختلف امور کے سبز باغ دکھلائے گئے تھے جن میں ان کے بیٹے سردار عنایت اللہ خاں کی ولی عہدی بھی تھی۔ جس کا پول ذاتی ڈائری ص۱۲۷ میں کھولا گیا ہے یاغستانی مرکز سے پہلے سے تقاضا بار بار یہ ہوتا رہا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ مرکز میں آجائیں تو اطراف وجوانب سے مجاہدین اس طرح جمع ہو جائیں گے کہ تفرق کا خطرہ نہ رہے گا اور متعدد اوقات میں ایسے لوگ دیوبند آئے جو کہ یاغستان تک اپنی حفاظت میں پہونچا دینے کے ذمہ دار تھے۔ اور ان کو ایسے مخفی راستے معلوم تھے جن سے وہ پہنچاتے اور انگریزوں کو خبر بھی نہ ہوتی" مگر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو مالی امداد کی وجہ سے اس کی مصلحت معلوم نہ ہوئی کیونکہ مرکز کو اس کی (مالی امداد) کی ضرورت زیادہ تھی اور یہاں دیوبند میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جس کی وجاہت سے مالی امداد خفیہ طور سے حاصل کی جائے اس لئے توقف فرمایا۔ اخیر میں جب کہ جہاد کی عملی کارروائی شروع ہو گئی تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بالکل جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے مگر پھر خبر آئی کہ رسد و رکارتوسوں کے ختم ہو جانے کی بناء پر ضروری ہے کہ کوئی باقاعدہ حکومت پشت پناہ ہو جو کہ رسد اور ہتھیار پہونچاتی رہے اس لئے یاغستان جانیکا ارادہ فسخ کرنا اور مولانا عبید اللہ صاحب

کو کابل بھیجکر اس کو مرکز بنانا اور ترکوں کو امداد کے لیے آمادہ کرنا ضروری ہے ثانی اللذکر امر کے لئے خود کو منتخب فرمایا ادھر ڈاکٹر انصاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سے فرمایا کہ مخفی طور پر مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ ہند آپ کو گرفتار کر کے نظر بند کرنا چاہتی ہے اس لئے اشد ضروری ہے کہ جلد آپ حدود حکومت برطانیہ سے باہر ہو جائیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں چوٹی کے مسلم لیڈر مولانا محمد علی صاحب مولانا شوکت علی صاحب مولانا ابو الکلام صاحب وغیرہ گرفتار ہو کر نظر بند ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ حکومت ہند کے یہاں آپ کی گرفتاری طے ہو چکی ہے مگر اس پر غور ہو رہا ہے کہ چونکہ آپ سے عام مسلمانوں کے تعلقات بہت گہرے ہیں تو کون سا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں عام ہیجان کی نوبت نہ آئے۔ یہ زمانہ حج کا تھا اس لئے طے پایا کہ حج کے لئے روانہ ہو جائیں اس طرح حدود برطانیہ سے جلد سے جلد باہر بھی ہو جائیں گے اور ترکی حکومت سے گفتگو اور استمداد کا مسئلہ بھی حل ہو جائیگا پھر براہ ایران واپس ہو کر یاغستانی مرکز پر پہونچ جائیں گے۔ چنانچہ یکبارگی حج کا امادہ کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے قریبی جانے والے جہاز میں بذریعہ تار ٹکٹوں کا انتظام کر دیا اور حضرت دیوبند سے فوراً روانہ ہو گئے۔ انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات اور وثایق اور تحریرات حاصل کرنے کے بعد حضرت نے یہ خواہش کی کہ آپ مجھ کو براہ ایران یاغستان اپنی کفالت میں پہنچا دیں۔ جمال بادشاہ نے جواب دیا کہ ہم اس سے اس وقت عاجز ہیں روس نے ایران کے اور انگریزوں نے عراق کے راستہ کو کاٹ دیا ہے جس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ دولت عثمانیہ اور افغانستان میں مواصلات نہ رہیں۔ ایران میں روسی فوجیں داخل ہو کر سلطان آباد پر جنگ کر رہی ہیں اور عراق میں انگریزی فوجیں کوت العمارہ پر جنگ کر رہی ہیں اس لئے کوئی اطمینان بخش صورت ہمارے قبضہ میں نہیں ہے آپ کو ہندوستان ہی کے راستہ سے یاغستان میں جانا چاہیئے۔ حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ مجھ کو نہایت قوی خطرہ ہے کہ راستہ ہی میں مجھ کو انگریز گرفتار کر لیں گے۔ تو انھوں نے فرمایا کہ پھر آپ حجاز ہی میں اپنا مرکز قائم کریں اور یہاں سے ہی کارروائیاں عمل میں لائیں اگر حضرت شیخ الہند یاغستانی مرکز پر پہونچ جاتے تو قوی امید تھی کہ باوجود بے پائی اور تنگیوں کے

مرکز یاغستان منتشر نہ ہونے پاتا اور کسی نہ کسی صورت میں کسی جگہ قائم رہتا مگر قدرت کو منظور نہ تھا بہر حال حاجی ترنگ زئی صاحب اور ان کے ساتھ کے مجاہدین نہایت استقلال اور پامردی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے اور ایک مورچہ کو چھوڑ کر دوسرا مورچہ بناتے ہوئے پسپا ہوتے رہے مگر انگریزوں کی ٹولیوں میں اور ان پر وگنڈوں کی وجہ سے جن کو ہم نے پہلے ذکر کیا ہے روز بروز ساتھی فرار ہوتے اور کم ہوتے رہے بالآخر کارکن حضرات مجبور ہو کر منتشر ہو گئے۔ حاجی صاحب مرحوم کو ان کے مخلصین مہمند کے علاقہ میں لے گئے وہ وہاں محفوظ ہو کر اقامت پذیر ہو گئے اور مولانا سیف الرحمن صاحب اور دوسرے حضرات کابل وغیرہ چلے گئے۔ حاجی ترنگ زئی صاحب اسی دم خم سے مہمند علاقہ میں اخیر تک رہے اور وہیں ان کی وفات ہو گئی۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ آمین۔

(۳۱) مولانا سیف الرحمن صاحب اصل میں قندہاری افغان ہیں۔ ان کے آباد و اجداد پشاور کے پاس رہنے لگے تھے۔ انھوں نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے علم حدیث شریف حاصل کیا تھا۔ عرصہ دراز تک ریاست ٹونک میں تعلیم و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اخیر میں مدرسہ فتحپوری دہلی میں مدرس اول ہو گئے اور اس عہدہ کے فرائض کئی سال تک انجام دیتے رہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ہم خیال بنایا اور اپنے مشن کا ممبر بنا کر مرکز یاغستان کی طرف ہجرت کرنے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ موصوف ہجرت کر کے یاغستان پہونچے اور لوگوں میں وعظ و تبلیغ عرصہ تک کرتے اور ان کو جہاد آزادی پر آمادہ کرتے رہے۔ مقرر بہت اعلیٰ درجہ کے اور نہایت ذہین اور صاحب علم و عمل تھے ان کے وعظ و تلقین سے بہت زیادہ لوگوں میں تاثر اور جوش پیدا ہوا۔ چونکہ وہ اپنی ملازمت چھوڑ کر بامر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ معہ متعلقین یاغستان گئے تھے اس لئے جب تک حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ ہندوستان میں رہے ان کے مصارف کے لئے ماہ بماہ حسب استطاعت تکفل رہے۔ موصوف حاجی ترنگ زئی صاحب کی معیت میں جہاد میں شریک رہے شکست ہونے کے بعد کابل چلے گئے۔ امیر حبیب اللہ خاں صاحب کے آخری زمانہ میں انگریزی حکومت کے پروٹسٹ پر مولانا منصور (جن کا ذکر آئے گا) اور مولانا سیف الرحمان صاحب

کابل سے یاغستان روانہ کر دئے گئے جلال آباد تک دونوں ساتھ رہے۔ مولانا سیف الرحمٰن صاحب کو جلال آباد میں برٹش افغانوں نے اپنی معیت میں لے لیا اور ہندوستانی معاملات سے علیحدگی کا وعدہ لے لیا (ذاتی ڈائری صفحہ ۱۲۰) اب وہ مستوفی الممالک کے ساتھ رہنے لگے۔ امیر حبیب اللہ خاں کی آخری حکومت تک وہ مستوفی الممالک کے ساتھ رہے اور مستوفی کو جو کام انگریزوں کی تائید کے لئے دیا جاتا اس میں اس کی امداد کرتے۔ سردار امان اللہ خاں صاحب کے عہد میں آزاد ہو کر کابل پہونچے اور بڑے عہدوں پر فائز ہو گئے۔

(۴) مولانا منصور صاحب انصاری مرحوم ان کا اصلی نام محمد میاں تھا۔ موصوف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دار العلوم دیوبند کے نواسے اور پیرجی عبداللہ صاحب انصاری مرحوم ناظم دینیات علیگڈھ یونیورسٹی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ حضرت شمس العلما مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم ناظم اعلیٰ دار العلوم دیوبند کے حقیقی بھانجے تھے۔ ان کا اصلی وطن انبہٹہ ضلع سہارنپور تھا۔ دار العلوم دیوبند میں تکمیل کرنے کے بعد مختلف مقامات میں خدمات تدریسیہ انجام دیتے رہے۔ دار العلوم معینیہ اجمیر میں بعہدہ صدر مدرسی عرصہ تک کام کیا۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اعانت ترجمہ قرآن کی خدمات انجام دینے کے لئے مقرر کئے گئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو اپنے مشن کا ممبر بنایا اور اسکیم میں شریک کر لیا۔ جمعیۃ الانصار میں بھی مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم کے ساتھ ان کے نائب بن کر عرصہ تک کام کرتے رہے۔ نہایت مستقل مزاج ذکی الطبع راز دار اور قابل اعتماد تھے۔ انھوں نے مشن کے کاموں کو نہایت زیادہ راز داری سے انجام دیا گو اعزہ اور احباب نے ان کو بہت کوشش کے ساتھ توڑنا چاہا مگر یہ نہ ٹوٹے اور ہمیشہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ رہے۔ ان کو ڈگمگا دینے والے خطرات سے دوچار ہونا پڑا مگر یہ ثابت قدم رہے حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ سفر حجاز میں رفاقت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ مکہ معظمہ میں گورنر حجاز غالب پاشا کی ملاقات ہونے اور ہدایات و تعلیمات ضروریہ حاصل کرنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو ہندوستان واپس کیا اور اس پر مامور کیا کہ وہ ہندوستان جا کر حسب تعلیمات غالب پاشاؒ کا رہائی

متعلقہ انجام دیں اور مشن کے ممبروں کی رہنمائی فرماتے رہیں۔ حسب بیان رولٹ رپورٹ غالب نامہ اُن کے پاس تھا موصوف جب حسب ہدایات ہندوستان پہونچے تو ریشمی خط انگریزوں کو مل چکا تھا۔ جگہ جگہ تفتیش اور پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ بدخواہوں نے ان کے گرفتار کرانے کی کوشش کی۔ ان کو پتہ چل گیا اور بھیس بدل کر انھوں نے فرائض ہدایات انجام دئے اور روپوش ہو کر یاغستان روانہ ہو گئے۔ سی آئی ڈی نے بہت کوشش کی مگر یہ ہاتھ نہ آئے اور یاغستان (آزاد علاقہ) میں بال بچوں (اہلیہ محترمہ و صاحبزادوں وغیرہ) کو وطن میں چھوڑ کر چلے گئے اور بخیر و عافیت وہاں پہونچ گئے۔ وہاں کچھ عرصہ رہ کر پھر افغانستان (کابل) چلے گئے۔ امیر حبیب اللہ خاں صاحب کے اخیر زمانہ میں مولانا سیف الرحمن صاحب کے ساتھ گورنمنٹ ہند کی پروٹسٹ کی بنا پر کابل سے یاغستان کو روانہ کر دئے گئے۔ انھوں نے یاغستان پہونچنے کے پہلے سے جب کہ بھیس بدلا تھا اپنا نام بھی بدل کر محمد منصور انصاری رکھ لیا تھا جس سے سی۔ آئی ڈی کو گرفتاری میں بڑی ناکامی ہوئی۔ امیر امان اللہ خاں صاحب کے زمانہ میں پھر کابل واپس ہوئے اور اپنی علمی استعداد وغیرہ کی وجہ سے بڑے علمی اور سیاسی عہدوں پر فائز ہوئے۔ جو مشن افغانستان سے استنبول امیر امان اللہ صاحب کے سریر آئی سلطنت ہونے کے بعد بھیجا گیا تھا اس میں موصوف بھی تھے۔ بعہدہ وزیر مختار سفیر افغانستان کے ساتھ فرائض عہدہ انجام دیتے رہے۔ پھر ماسکو میں افغانی سفارت فوق العادت میں بحیثیت مشیر شریک رہے۔ کابل میں انھوں نے مختلف سیاسی اسلامی رسائل بھی تصنیف کئے جو کہ شائع ہو چکے ہیں[ف] ان کی روانگی کے بعد چونکہ ان کے متعلقین معاشی تنگیوں میں مبتلا ہو گئے تھے اس لئے ڈاکٹر انصاری مرحوم ۳۰ ماہوار ے تکفل فرماتے رہے انھوں نے یاغستان میں شادی بھی کر لی تھی۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا حامد انصاری صاحب ہیں جو عرصہ دراز تک مدینہ بجنور کی ایڈیٹری کی خدمات نہایت لیاقت اور دانائی کے ساتھ انجام دیتے رہے

ف ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔ (۱) حکومت الہٰی (۲) اساس انقلاب یا مراقبہ نماز (۳) مجمل بیعت تابعیت (۴) دستور امامت امت (۵) انواع الدول وغیرہ

اور پھر بمبئی چلے گئے، اور روزنامہ جمہوریت جاری فرمایا۔ چھوٹے صاحبزادے والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد کابل چلے گئے، اور ان دنوں وہیں مقیم ہیں منصور صاحب کا انتقال کابل میں ہوگیا رحمۃ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ آمین۔

(۵) مولانا عُزیر گل صاحب قصبہ زیارت کاکا صاحب ضلع پشاور کے باشندہ اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے خادم خاص ہیں۔ مشن کے ابتداء سے ممبر رہے اور نہایت مہتم بالشان اور خطرناک کاموں کو انجام دیتے رہے۔ صوبہ سرحد اور آزاد علاقہ (یاغستان) میں سفارت کی خدمات عظیمہ انھوں نے بہت انجام دی ہیں۔ عموماً حضرت شیخ الہندؒ ان پہاڑی علاقوں میں اپنے ہم خیال اور ہم نوا لوگوں کے پاس انھیں کو بھیجا کرتے تھے۔ دشوار گذار اور خطرناک راستوں کو قطع کرکے نہایت رازداری اور ہمت واستقلال کے ساتھ یہ بار بار آتے جاتے رہے ہیں۔ پہاڑی علاقوں اور ہولناک جنگلوں کو رات دن پیدل قطع کرتے رہے۔ حاجی ترنگ زئی صاحب اور علماء سرحد یاغستان اور دیگر خوانین کو مشن کا ممبر بنایا اور ان کے پاس پیغام اور خطوط پہونچانا ان کو ہموار کرنا ان کا اور مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم کا فریضہ تھا جس کو ان دونوں حضرات نے اوقات مختلفہ میں انجام دیا۔ باوجودیکہ سی آئی ڈی ان کے پیچھے لگی رہی مگر انھوں نے کبھی اس کو پتہ چلنے نہیں دیا بارہا ان کو بھیس بدلنا اور ان جان علاقوں میں گذرنا پڑا اگر نڈر ہو کر ان کو قطع کیا ہر قسم کے خطرات میں بلا خوف وخطر اپنے آپ کو ڈالتے رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے نہایت مخلص اور فدائی ہیں۔ کسی قسم کی طمع اور غرض نفسانی نہیں رکھی نہ حضرت سے جدا ہوئے۔ لوگوں نے بہت کوششیں کیں کہ یہ جدا ہو جائیں مگر انھوں نے گوارا نہ کیا اور ہمیشہ عاشقانہ دلولوں کے ساتھ خدمت میں حاضر رہے حتاکہ مالٹا کی اسارت میں بھی انتہائی دلجمعی سے شریک اور رفیق رہے ہر قسم کی خدمت کو اپنے لئے خوش نصیبی سمجھا کئے۔ لوگوں نے ان کو سی آئی ڈی مشہور کیا۔ آوازے کسے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بھڑکایا بدظن کرنے کی کوششیں کیں۔ مگر حضرت مردم شناس دماغ اور قلب رکھتے تھے ان کی طرف سے اخیر تک بدظن نہ ہوئے اور آخر وقت تک ان کو ساتھ رکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے رازدار اور مالی سرمایہ کے خزانچی اور معتمد علیہ رہے۔ حضرتؒ کی وفات کے بعد بھی حصہ دراز تک حضرت

کے مکان ہی پر قیام پذیر رہے چونکہ ایام اسارت مالٹہ میں اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوگیا تھا اس لئے بعض احباب کی کوششوں سے حضرت کی بھانجی کی لڑکی سے نکاح بھی ہوگیا۔ اُس سے اُن کے دو لڑکے اور لڑکیاں بھی ہوئیں جو کہ ماشاء اللہ اب جوان ہو گئے ہیں۔ ایام تحریک خلافت میں دیوبند خلافت کمیٹی کی صدارت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ضروریات معاشیہ کی بنا پر سوختہ (جلونی لکڑی) کی تجارت بھی کرتے رہے پھر مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں صدر مدرس ہو گئے وہاں ہی ایک میم سو اُسکی خواہش پر دوسری اہلیہ محترمہ کی وفات کے بعد نکاح کر لیا۔ پھر اپنے بچوں اور اس تیسری اہلیہ کو لیکر وطن ضلع پشاور میں چلے گئے۔ اب وہاں ہی اقامت گزیں ہیں۔

(۶) مولانا احمد اللہ صاحب پانی پتی قصبہ پانی پت ضلع کرنال کے باشندے اور حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء قدس اللہ سرالعزیز کی اولاد میں سے تھے موصوف نے علوم دینیہ عربیہ مختلف مدارس میں حاصل کرکے دورہ حدیث اور آخری کتابیں دارالعلوم دیوبند میں پڑھیں پھر مدرس ہو کر مختلف شہروں میں خدمات تدریسیہ انجام دیتے رہے۔ پھر دیوبند میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ قرآن میں معین و مددگار بنے اور سالہا سال اس خدمت کو انجام دیتے رہے ان کی دیانت اور امانت پر حضرت رحمۃ اللہ کو بہت زیادہ اعتماد تھا۔ شروع تحریک آزادی سے یہ حضرت کے رفیق اور ہمراز اور مشن کے مخلص اور جانباز ممبر رہے۔ بسا اوقات حضرت کی ڈاک ان کے سپرد رہتی تھی۔ مہمانوں کی کثرت اور مشاغل کی زیادتی کی بناء پر حضرت رحمۃ اللہ ڈاک کے جوابات نہ دے سکتے تھے اس لئے ان کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔ جب حضرتؒ حجاز جانے لگے تو فروعی کاروبار اور نیچے کی کارروائیوں کا ناظم انھیں کو بنا گئے تھے ان کے پاس ممبران مشن کا رجسٹر چندہ دہندگان کا رجسٹر اور دیگر کاغذات متعلقہ مشن رکھ گئے تھے۔ جن کو لے کر یہ پانی پت چلے گئے تھے اور وہاں ہی سے یہ تمام کارروائیاں عمل میں لاتے تھے۔ اور اصولی اور اونچے مرتبہ کی کارروائیوں کا ناظم حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائپوری کو بنا گئے تھے۔ مشن کے تمام امور انھیں دونوں صاحبوں کے سپرد تھے روزانہ کی جزئیات نہایت رازدارانہ طریقہ پر یہ انجام دیتے تھے اور امور عالیہ

میں حسب ضرورت رائے پور جاکر مولانا رائے پوری سے مشورہ لے کر عمل میں لاتے تھے جس وقت مولانا
شیخ الہند گرفتار ہو گئے اور کاغذات گورنمنٹ کے (حسب تحریر سابق) قبضہ میں آ گئے اور پکڑ دھکڑ، تفتیش
و تنقید شروع ہوئی تو ان کے مکان پر بھی پولیس کی دوڑ پہنچی مگر یہ کسی شبہ کی بنا پر چند گھنٹے پہلے تمام رجسٹر و
اور مشتبہ کاغذات کے بلندوں کو کسی دوسری جگہ منتقل کر چکے تھے اس لئے یہ رجسٹر اور کاغذات پولیس کے
ہاتھ نہ آئے ان سے بہت پوچھا گیا مگر انھوں نے کسی امر کا اقرار نہ کیا ان پر ایک مسلمان سی آئی ڈی
مسلط کیا گیا۔ جو نہایت اخلاص اور عقیدت کا اظہار کرتا ہوا ان سے مرید ہوا اور خدمت میں رہ پڑا
ذکر و اذکار عمل میں لاتا رہا اتباع شریعت میں انتہائی سرگرمی عمل میں لایا اور دن و رات خدمتیں
انجام دیتا رہا ان کو اس پر اعتماد اور اعتبار ہو گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ تمام باتیں پوچھ لیں اور مشن کا ممبر
بن گیا انھوں نے اس کو تمام راز کی باتیں بتا دیں۔ وہ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد غائب ہو گیا
اور جاکر گورنمنٹ کو بتا دیں اس پر ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر چونکہ الزامات کا ثبوت گورنمنٹ کے پاس
نہ تھا اور نہ یہ اقرار کرتے تھے اس لئے ان کو پنجاب کے بعض علاقوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ ایک عرصہ
کے بعد سی آئی ڈی مولانا احمد چکوالی مرحوم کو لے کر آئی جو کہ اس سے پہلے معافی مانگ کر آزاد ہو چکے
تھے۔ کیونکہ گورنمنٹ کے پاس متعدد تحریریں اور خطوط افشاء راز کے بہت سے ذرائع سے پہونچ چکے تھے
مولانا احمد چکوالی مرحوم نے ان کو وہ دکھلائے اور تنہائی میں جب کہ پس پردہ افسران سی آئی ڈی بیٹھے
ہوئے تھے کہا کہ ان تحریرات کے موجود ہونے کے بعد بجز اقرار اور استدعاء معافی کوئی چارہ نہیں رہتا
اب انکار کوئی معنی نہیں رکھتا مجھ کو بھی یہی مجبوری پیش آئی۔ آپ بھی اقرار کر کے وعدہ کر لیجئے کہ آئندہ
کوئی حصہ نہیں لونگا۔ تحریک ختم ہی ہو چکی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس پر عمل کیا۔ یہ ایک ہمدم و ہمراز کا مشورہ
تھا جو کہ قبول کرنا پڑا اس کے چند دنوں بعد ان کو آزاد کر دیا گیا اور پانی پت میں واپس کر دئے گئے۔
وہاں آکر تعلیمی مشاغل قدیمہ میں مشغول ہو گئے اور اخیر تک اسی میں مشغول رہے ہندوستان کی آزادی
کے بعد اور تقسیم ہند سے کچھ پہلے بمرض ہیضہ پانی پت میں انتقال ہو گیا رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

(۷) مولانا ظہور محمد خاں صاحب مرحوم۔ موصوف خاص شہر سہارنپور کے باشندہ اور حضرت شیخ الہند

رحمۃ اللہ علیہ کے فدائی اور نہایت مخلص شاگرد تھے۔ نہایت زیادہ ساکت صامت ٹھوس کام کرنے والے سرگرم ممبر تھے۔ مشن میں ابتدا سے داخل ہوئے اور ہمیشہ ممبر بنانے اور چندہ فراہم کرنے کا کام کرتے رہے حضرت شیخ الہندؒ کو ان پر بہت زیادہ اعتماد تھا مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں صدر مدرس تھے جب پکڑ دھکڑ ہوئی تو ان کو بھی گرفتار کیا گیا اور الہ آباد میں سی آئی ڈی کے دفتر میں لے جایا گیا۔ سی آئی ڈی نے بہت زیادہ پوچھ گچھ اور سختی کی مگر انھوں نے کوئی جواب نفی یا اثبات میں نہیں دیا بالکل گونگے بن گئے دو چار دن سختی کے بعد ان کو چھوڑ دیا گیا بعد واپسی حضرت شیخ الہندؒ چند سال زندہ رہ کر ایام تحریک خلافت میں انتقال ہو گیا رحمہ اللہ تعالیٰ

(۸) شیخ عبدالرحیم صاحب مرحوم سندھی حیدرآباد سندھ کے باشندہ اور مولانا عبیداللہ صاحب کے مخلص اور وفادار دوست نومسلم تھے نہایت دین دار اور مشن کے نہایت سرگرم ممبر تھے۔ مولانا عبیداللہ صاحب نے ان کو ہموار کر کے مشن میں داخل کیا تھا۔ مولانا عبیداللہ صاحب کو سرحد افغانستان تک پہنچانے میں انھوں نے بہت زیادہ مدد کی تھی۔ موصوف مسٹر اچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی تھے یہ عرصہ دراز تک تعلیم یافتہ غیر مسلم سندھیوں کو مسلمان بنانے میں نہایت سرگرمی کے ساتھ کوشاں رہے اور بحمداللہ تعالیٰ اس میں بہت زیادہ کامیاب ہوئے اور بہت سے لوگ ان کی مساعی کاملہ سے مشرف باسلام ہوئے انھیں میں سے ڈاکٹر شمس الدین صاحب بھی ہیں۔ موصوف شیخ صاحب کی جد و جہد سے مسلمان ہوئے شیخ صاحب نے اپنی صاحبزادی سے ان کا نکاح کر دیا جنگ عمومی اول سے کچھ پہلے یہ مدینہ منورہ چلے گئے تھے ایام جنگ میں وہاں ہی رہے۔ بعد میں مشکلات کی وجہ سے حیدرآباد سندھ آ گئے اب وہ مع متعلقین حیدرآباد میں ہی مقیم ہیں۔ ان کے سمجھانے کا طریقہ اس قدر عمدہ اور دلچسپ تھا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مولانا عبیداللہ صاحب تحریک آزادی سندھ میں جب سے داخل ہوئے تو انھوں نے ان کو بھی اپنا ہم خیال بنایا اور اس راستہ میں نہایت عظیم الشان خدمات انھوں نے انجام دیں کابل جانے کے بعد مولانا عبیداللہ صاحب کی خط و کتابت انھیں سے ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ خطوط گورنمنٹ ہند کے ہاتھ لگ گئے اور راز فاش ہو گیا تو سی آئی ڈی ان کے پیچھے لگ گئی ان کی گرفتاری کے لیے بہت زیادہ کوشش گورنمنٹ کی طرف سے

جاری ہوئی۔

مگر یہ روپوش ہوگئے اور اخیر وقت تک سی آئی ڈی کے ہاتھ نہیں آئے۔ نہایت رازدار اور سمجھدار متقی اور پرہیزگار تھے کہا جاتا ہے کہ سرہند میں بیمار ہوکر انتقال فرما گئے رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کے روپوش ہو جانے سے مشن کی برانچ حیدرآباد سندھ کا کام تقریباً بند ہوگیا۔

(۹) مولانا ابو السراج غلام محمد صاحب دین پوری مرحوم۔ مرحوم موضع دین پور علاقہ خان پور ریاست بھاولپور کے باشندے اور حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈوی کے خلیفہ اول تھے ان اطراف میں ان کی بہت شہرت تھی۔ بہت زیادہ لوگ ان سے بیعت ہوکر مستفید ہوئے دین پور شریف بھی اس تحریک آزادی کا مرکز ثانوی تھا جس کے صدر خود مولانا ابو السراج صاحب موصوف تھے آپ کے صاحبزادے اور خدام مشن کے ممبر تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق مولانا عبید اللہ صاحب کے ذریعہ سے پیدا ہوا اور انھیں کے ذریعہ سے مشن کی تحریک میں شریک ہوئے۔ چونکہ مولانا عبید اللہ صاحب کے پیر بھائی اور ان کے پیر و مرشد مرحوم کے خلیفہ تھے اس لئے آپس میں بہت زیادہ تعلق اور ارتباط تھا۔ مولانا عبید اللہ صاحب کابل جاتے وقت اپنی صاحبزادی کو انھیں کی کفالت میں چھوڑ گئے تھے کچھ عرصہ کے بعد مولانا ابو السراج مرحوم نے ان سے عقد نکاح کرلیا۔ جن سے صاحبزادہ پیدا ہوا وہ اب نہایت صالح جوان ہیں ریشمین خط آپ کے پاس بھی پہنچا تھا۔ انقلاب کی تیاری کے جملہ سامان یہاں جمع کرلئے گئے تھے اور مزید کوششیں جاری تھیں کہ فوج کی بڑی مقدار اسٹیشن خان پور شام کو پہونچی۔ وہاں کے مخلصین نے فوراً یہاں مرکز میں خبر کردی۔ راتوں رات ہیں تمام سامان رائفلیں کارتوس وغیرہ منتشر کردیا گیا صبح کو جب افسر انگریز معہ فوج دین پور پہنچا اور تفتیش کی تو کوئی چیز موجود نہ تھی۔ ریشمی خط کو بھی تلاش کیا وہ ایک ڈبہ میں بچوں کے کھلونوں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ انگریز افسر نے اس ڈبہ کو اٹھایا مگر اوپر کے کھلونوں کو دیکھ کر رکھ دیا۔ غرضکہ کوئی چیز جس کی مخبروں نے خبر دی تھی اور کوئی مشتبہ چیز پائی نہ گئی دوڑ آنے کی خبر اطراف و جوانب میں پھیل گئی تو ہزاروں آدمی جمع ہوگئے اس لئے دین پور میں گرفتار نہ کرسکے۔ افسر نے استدعا کی چونکہ ہمارا بڑا افسر خان پور میں رہ گیا ہے اس لئے آپ خان پور تشریف

لے چلیئے اور اس سے گفتگو کر لیجئے۔ وہاں جانے پر کہا کہ یہاں معلوم ہوا کہ وہ بھاول پور چلا گیا ہے۔ اس لئے بہاول پور تشریف لے چلے پھر وہاں سے پنجاب لے گئے اور غالباً جالندھر میں نظر بند کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد کسی ثبوت نہ ہونے اور عوام کے اشتعال کی بنا پر چھوڑ دئے گئے۔ موصوف مرحوم کے کئی صاحبزادے نیک اور جوان صالح ہیں دارالعلوم دیوبند میں علم حدیث وغیرہ پڑھا ہے۔ بڑے صاحبزادے مولانا عبدالہادی صاحب گدی نشین ہیں۔ رحمہ اللہ تعالےٰ ورضی عنہ وارضاہ

(۱۰) مولانا ابوالحسن تاج محمود صاحب مرحوم موصوف موضع امروٹ ضلع سکھر کے باشندہ اور حضرت سیدالعارفین حافظ محمد صدیق صاحب مرحوم بھرچونڈی والے کے دوسرے خلیفہ تھے مولانا عبیداللہ صاحب ان سے بہت وابستہ تھے۔ مولانا عبیداللہ صاحب کا نکاح بھی ماسٹر محمد عظیم خاں یوسف زئی کی صاحبزادی سے انھوں نے کرا دیا تھا۔ عرصہ دراز تک مولانا عبیداللہ صاحب ان کے یہاں رہے انھوں نے مولانا کے لئے کتابوں کا بہت ذخیرہ جمع کر دیا تھا۔ موصوف خدا رسیدہ متقی اور پرہیزگار نہایت جوشیلے بزرگ تھے۔ اطراف وجوانب سکھر میں ان کا بہت بڑا اثر اور رسوخ تھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمان ان کے متوسل اور مریدان اطراف میں موجود ہیں۔ ان کی کرامات کا بہت بڑا چرچا وہاں پایا جاتا ہے۔ مولانا عبیداللہ صاحبؒ نے ان کا تعارف حضرت شیخ الہندؒ سے کرایا۔ متعدد دفعہ یہ دیوبند بھی آئے اور حضرت شیخ الہندؒ ان سے ملنے امروٹ بھی تشریف لے گئے اور مشن آزادی میں شریک کار کیا۔ تحریک خلافت میں بھی نہایت جوش وخروش سے آخر تک شریک رہے۔ ان کا مقام سندھ کے ان اضلاع میں حضرت شیخ الہند کے مشن کا مرکز رہا۔ گورنمنٹ نے اشتباہات کی بناء پر ان کو گرفتار کیا پھر چند دنوں کے بعد رہا کر دیا۔ ایام تحریک خلافت کے آخری دنوں میں ان کی وفات ہوگئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ

(۱۱) مولانا محمد صادق صاحب کراچوی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ مولانائے موصوف محلہ کھڈہ کراچی کے باشندہ ہیں کتب عالیہ درسیہ خصوصاً دورہ حدیث حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھی ان میں اور مولانا عبیداللہ صاحب میں بہت گہرے تعلقات ہمیشہ رہے اور مشن آزادی میں ہمیشہ سرگرمی کے ساتھ

شریک رہے ایام جنگ عمومی میں جب کہ انگریزوں نے عراق پر حملہ کیا تو انھوں نے اور ان کے رفقاء نے لس بیلا وغیرہ کے بلوچستانی قبایل سے بغاوت کرادی۔ کراچی سے ہر ہفتہ میں جہاز میں پوری فورس سپاہیوں اور اسلحہ اور رسد کی جایا کرتی تھی جس کی وجہ سے مسٹر ٹاونشنڈ کمانڈر انچیف محاذ عراق میں بڑھتا ہوا ہر پڑاؤ پر پیش قدمی کرتا۔ ہاتھا فوجیں بھی یکے بعد دیگرے ہر پڑاؤ کو سنبھالتی رہتی تھیں اور پیچھے سے کمک پہونچتی رہتی تھی۔ اسی طرح نظام پیش قدمی کا جاری تھا جب بلوچستان اور لس بیلا میں بغاوت ہوگئی تو وہ فورس اور فوج جو کہ بصرہ جارہی تھی اس داخلی بغاوت کے رفع کرنے کے لئے سندھ میں اتار دی گئی۔ کئی ہفتہ تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ مسٹر ٹاونشنڈ اپنی فتحمندی کے نشے میں بڑھتا چلا گیا مگر پیچھے سے کمک پہونچ نہ سکی۔ بالآخر کوت العمارۃ میں محصور ہوگیا۔ کچھ عرصہ میں بغاوت فرو کرکے انگریزی فوجیں جب وہاں پہونچیں تو ترکی فوجوں نے حصار نہایت مضبوط کر لیا تھا نہ اندر سے کسی کو نکلنے دیتے تھے نہ باہر کی طاقتیں حصار توڑ سکتی تھیں کئی مہینہ تک محصور رہ کر بمجبوری مسٹر ٹاونشنڈ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ابتدا میں جب محصور ہوا تھا اس کی فوج بیس ہزار تھی مگر جب حصار سے آزاد کیا گیا تو کل تیرہ ہزار فوج باقی رہ گئی تھی ستر ہزار آدمی اس حصار میں مر گئے۔ اس کے بعد مولانا محمد صادق کو گرفتار کر لیا گیا۔ ثبوت نہ ہونیکی وجہ سے کاروار (مہاراشٹر کا شہر) میں نظر بند کر دیے گئے اور جنگ عمومی کے اختتام تک وہاں ہی نظر بند رہے۔ نہایت جوشیلے، رازدار، مستقل مزاج شخص ہیں۔ تقسیم ہند تک دار العلوم دیوبند کے ممبران شوری اور جمعیۃ علماء ہند کے ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی کے صدر مہتمم اور صدر مدرس بھی ہیں۔ خلافت کمیٹی سندھ اور جمعیۃ علماء سندھ میں ہمیشہ نہایت اولوالعزمی اور سعی بلیغ سے کام کرتے رہے۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء[لہ]

(۱۲) مولانا فضل ربی صاحب سلمہ اللہ تعالی دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت شیخ الہند

لہ افسوس مولانا موصوف ان سطور کے لکھے جانے کے بعد ۷ رشوال ۱۳۷۲ھ ۱۰ جون ۱۹۵۳ء کو وفات پاگئے۔ رحمۃ اللہ

رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید اور ضلع پشاور کے باشندہ ہیں نہایت جوشیلے اور مستقل مزاج جانباز ہیں اپنے وطن میں علمی مشاغل میں مشغول تھے مولانا شیخ الہندؒ نے حکم فرمایا کہ آپ یاغستان (آزاد علاقہ) میں چلے جائیں اور وہاں لوگوں کو جہاد آزادی کے لئے آمادہ کریں اور اس کی تبلیغ میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں چونکہ ان کو تقریر کی مشق دار العلوم میں رہتے ہوئے بہت اچھی ہو گئی تھی اس لئے ان کی جوشیلی تقریروں کا وہاں بہت اچھا اثر ہوا۔ اور بہت بڑی تعداد میں لوگ جانبازی کے لئے تیار ہو گئے جب حاجی ترنگزئی صاحب مرحوم نے علم جہاد بلند کیا تو مولانا فضل ربی صاحب شریک جہاد رہے پھر شکست کے بعد کابل چلے گئے۔ اپنی علمی استعداد اور اعلیٰ قابلیت کی بنا پر علمی ڈیپارٹمنٹ افغانستان میں ملازم ہو گئے اور آج تک اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں متعلقین ان کے ساتھ ہیں۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء

(۱۳) مولانا محمد اکبر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔ دار العلوم کے فاضل اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ یاغستان کے ہی باشندہ ہیں۔ علمی قابلیت بہت اعلیٰ درجہ کی رکھتے ہیں فنون عقلیہ سے فارغ ہو کر دار العلوم میں داخل ہوئے تھے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ کے پاس علم حدیث پڑھا پھر ساؤتھ افریقہ میں علمی خدمات اور امامت کیلئے چلے گئے وہاں سے چند برسوں کے بعد واپس ہو کر اپنے وطن میں مقیم تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو جہاد آزادی میں شامل ہونے اور لوگوں کو اس کے لئے آمادہ کرنے کا حکم کیا۔ ان کی مساعی جمیلہ سے ... یاغستانی خوانین کے آپس کے افتراقات اور پرانی عداوتیں جو کہ ان میں سالہا سال سے چلی آتی تھیں دور ہوئیں سب میں اتفاق اور اتحاد پیدا کیا گیا اور جہاد آزادی کی صفوف میں کھڑا کیا گیا معلوم نہیں کہ زندہ ہیں یا نہیں۔

(۱۴) مولانا فضل محمود صاحب ضلع پشاور کے باشندہ ہیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے آزاد علاقہ میں چلے گئے اور وہاں نہایت جد وجہد کر کے لوگوں کو جہاد آزادی کے لئے تیار کیا اور بہت کار آمد اور اہم کام انجام دیئے۔ شکست کے بعد مخفی طور پر اپنے وطن واپس

آگئے اور غیر مشہور طریقہ پر زندگی بسر کرتے رہے اس مشن کے سرگرم ممبر تھے نہایت ٹھوس کام کرنے والے ہیں۔

(۱۵) خان بادشاہ عبدالغفار خاں، صاحب موصوف اتمان زئی ضلع پشاور کے مشہور و معروف قومی خادم اور کارکن ہیں ابتدا میں ان کو تعلق حضرت شیخ الہندؒ سے پیدا ہوا خدمت میں حاضر ہوئے کہا جاتا ہے کہ بیعت بھی ہوئے۔ انھوں نے اپنے سیاسی تعلقات کو بڑے مجمع میں دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے ذکر فرمایا کہ میں بارہا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آیا ہوں ملاقات کا وقت اور جگہ کی اطلاع کسی شخص کے ذریعہ کر دیتا تھا اور دیوبند سے پہلے کے یا بعد کے اسٹیشن پر اتر لیتا تھا اور وہاں دونوں مجتمع ہو کر باتیں کر لیتے تھے پھر اپنے اپنے مقصد کے لئے مناسب گاڑیوں پر روانہ ہو جاتے تھے۔ سی۔ آئی۔ ڈی کو کوئی اطلاع نہ ہوتی تھی ٹکٹ آگے کے ہوتے تھے اس طرح بارہا ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہو کہ خاں صاحب بہت بڑے بڑے کام انجام دیتے تھے جن کے انجام دینے کی کارروائیاں اس قدر اخفاء کی محتاج ہوتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے۔

(۱۶) ڈاکٹر انصاری مرحوم ڈاکٹر صاحب مرحوم قصبہ یوسف پور ضلع غازی پور کے باشندہ تھے تین بھائی تھے۔ حکیم نابینا حکیم عبدالوہاب صاحب مرحوم سب سے بڑے تھے۔ حکیم عبدالرزاق صاحب مرحوم منجھلے تھے اور ڈاکٹر صاحب مرحوم سب سے چھوٹے تھے۔ حکیم عبدالوہاب صاحب مرحوم نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی تھی۔ حدیث حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی تھی باوجود نابینا ہونے کے غضب کا ذہن اور حافظہ رکھتے تھے۔ تینوں بھائیوں کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے نہایت گہرا تعلق تھا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے حکیم عبدالوہاب صاحب بیعت بھی تھے۔ انھوں نے وفات سے پہلے وصیت کی تھی کہ میری قبر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب بنائی جائے چنانچہ جب ان کا انتقال دہلی میں ہوا تو ان کی لاش ایک کار میں گنگوہ شریف لائی گئی اور حضرت کی قبر کے قریب بنائی گئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم اگرچہ

ظاہری طور سے آمد ورفت دیوبند میں نہیں رکھتے تھے مگر قلبی تعلق حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے اور ان کی تحریک سے بہت زیادہ ہمیشہ رکھتے رہے اور مالی امداد بہت زیادہ کرتے رہے ان کے منجھلے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب مرحوم دیوبند میں بہت زیادہ آمد ورفت رکھتے تھے اور جب بھی آتے تھے تو کئی کئی روز رہتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم گورنمنٹ کے اعلیٰ دفاتر کے کارکنوں کے ذریعہ بہت سے راز کے کاموں پر حضرت شیخ الہند مرحوم اور ان کی تحریک کے متعلق باخبر رہتے تھے۔ چنانچہ جنگ عمومی کے ابتدا میں جب کہ سیاسی رہنماؤں کی دار وگیر شروع ہوئی تو انھیں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق سی آئی ڈی کی رپورٹیں نہایت سخت ہیں عنقریب گرفتار ہو جائیں گے اس لئے سخت ضرورت ہے کہ جلد از جلد ہندوستان کی سرحد سے باہر ہو جائیں علاوہ ازیں بہت سے امور وائسرائی کے دفتر سے ان کے ان احباب کے ذریعہ سے جو کہ سیاسی اور انتظامی دفاتر سے تعلق رکھتے تھے معلوم ہوتے رہے جب حضرت شیخ الہند نے حجاز کا ارادہ فرمایا تو انھوں نے ہی حضرت کے اور رفقاء خاص کے ٹکٹ وغیرہ کا انتظام اپنے خرچ سے کیا اور ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب ساتھ بمبئی تک تشریف لے گئے اور جملہ امور کا روانگی تک انتظام کیا اور مصاریف حجاز کے لئے نقد عطا کیا اور اس خیال سے کہ حجاز میں گرانی شدید ہے اور وہ رقم ختم ہو گئی ہوگی آئندہ سال حضرت شیخ الہند مرحوم کے بھانجے اور داماد قاضی مسعود احمد صاحب کو ایک ہزار روپیہ دے کر آپ نے خرچ سے حجاز روانہ کیا۔ اسی طرح گھر کے مصارف کا تکفل فرماتے ہوئے ماہانہ بھیجتے رہے پہلے گذر چکا ہے کہ مولانا عبیداللہ صاحب نے جب دہلی میں مدرسہ تعلیم القرآن قائم کرنا چاہا تو حضرت شیخ الہند خود تشریف لے گئے اور ڈاکٹر صاحب سے ان کا تعارف کرایا اور وہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے تعارف کے لئے ذریعہ بنے مولانا عبیداللہ صاحب کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"حضرت شیخ الہندؒ نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا اسی طرح دہلی بھیجکر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا ڈاکٹر انصاری

نے مجھے مولانا ابوالکلام اور محمد علی مرحوم سے ملایا اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔"

ایام جنگ بلقان میں ہلال احمر کے لئے جو وفد استنبول بھیجے گئے تھے اس کی ایک پارٹی کے صدر ڈاکٹر صاحب موصوف تھے اسی میں حافظ محمد یوسف صاحب نواسہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز بھی ایک جانباز اور غیور ممبر تھے جنھوں نے نہایت خلوص اور محبت سے فرائض ہلال احمر انجام دئے تھے اور ذمہ داران حکومت ترکیہ نے اس پارٹی کے شکریہ میں نہایت زوردار الفاظ فرمائے تھے الغرض یہ حضرت شیخ الہند کے مشن آزادی کی چوتھی برانچ کے (جو کہ دہلی میں تھی) صدر رہے اور نہایت رازداری سے سرگرمی کے ساتھ کام کرتے تھے۔ ہاں مولانا عبید اللہ صاحب کے نظارۃ المعارف قائم کرنے کے بعد ان کی ظاہری جد وجہد ایک درجہ تک ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ چونکہ مولانا عبید اللہ صاحب کے سفر کابل کے بعد اور ان کی غیوبت میں توی ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب کو ایام دار وگیر میں بلایا گیا اور ان سے پوچھ گچھ اور سوالات کئے گئے۔ سوائے مالی امداد اور کوئی گرفت کی چیز گورنمنٹ کے پاس ان کی نہیں تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائی صاحب نے اقرار کیا اور کہا کہ مولانا شیخ الہند رحمہ ہمارے مذہبی پیشوا اور مرشد ہیں۔ ہم پر ان کی ضروریات مہیا کرنا اور خدمات بجالانا فرض تھا اور ہے ہم اس کو بجالاتے رہے اور لاتے ہیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے کہا گیا کہ مولانا شیخ الہند گورنمنٹ کے باغی ہیں آپ ان کی امداد کرتے ہیں تو جواب دیا کہ مولانا گورنمنٹ کے باغی نہیں ہیں ان کو بغاوت کے ثبوت میں سی آئی ڈی کی رپورٹیں دکھلائی گئیں تو انھوں نے فرمایا کہ یہ جھوٹ ہے قابل یقین نہیں ہے۔ جب گورنمنٹ کی طرف سے ان رپورٹوں کی صداقت پر اصرار کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے مذہبی پیشوا اور مرشد دین ہونے کی بنا پر امداد کی ہے اگر گورنمنٹ مولانا شیخ الہند کو ایسا ہی سمجھتی ہے تو میں حاضر ہوں جو سزا مجھ کو دینا چاہتے ہو دو۔ چونکہ نہایت سچائی کے ساتھ اقرار کر لیا تھا اور ہر یورپ کے تعلیمافتہ اور آئین سے بخوبی واقف تھے اس لئے حکومت نے ان پر دست درازی کرنا خلاف مصلحت سمجھا۔ اس کے بعد ان کو بھی اور حکیم عبدالرزاق صاحب کو بھی چھوڑ دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اخیر تک سیاسی جد وجہد

میں نہایت سلامت روی کے ساتھ شریک رہے۔ خلافت تحریک اور کانگریس کے ممبر رہے اور ہر اجلاس کانگریس میں شریک ہوتے تھے ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے صدر بھی بنائے گئے جب تک زندہ رہے عموماً قومی لوگوں کا خصوصاً گاندھی جی کا قیام ان کی ہی کوٹھی پر ہوتا تھا قومی جلسے بھی انکے یہاں ہی ہوتے رہے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ آخری ایام میں ان کے یہاں ہی برائے علاج مقیم رہے اور وہیں وفات ہوئی۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ آمین۔ ڈاکٹر صاحب کی سیاسی جدو جہد اور کارنامے معروف ومشہور ہیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں، انہی سیاسی سرگرمیوں کی بناپر کئی مرتبہ جیل گئے اور عرصہ تک دہلی جیل اور پھر ملتان جیل وغیرہ میں رہے۔ ۱۹۳۶ء دہرہ دون سے دہلی آتے ہوئے ریل میں انتقال ہوگیا۔ دہلی ہی مدفون ہوئے۔ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ آمین۔

(۱۷) مولانا محمد احمد صاحب چکوالی مرحوم۔ چکوال (پنجاب) کے باشندہ تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور مولانا عبید اللہ صاحب کے مخلص دوست اور مشن کے سرگرم ممبر تھے۔ مشن تحریک آزادی کی پانچویں برانچ جو کہ پنجاب میں تھی موصوف اس کے صدر تھے نہایت استقلال اور بے جگری کے ساتھ مشن کے کاروبار میں شریک رہے اور ہزاروں کو ممبر اور ہم خیال بنایا دیوبند میں ان کی آمد ورفت بارہا ہوئی۔ ایام دارو گیر میں ان کو بھی گرفتار کرکے نظر بند کردیا گیا ابتدا میں کوئی الزام ثابت نہیں ہوسکا اور نہ آپ نے اقرار کیا مگر جب کاغذات گورنمنٹ کے ہاتھ آگئے اور سی آئی ڈی نے ان کو دکھلائے تو ان کی باتوں میں آکر اقرار کرنے اور آئندہ سیاسیات سے علیحدہ رہنے کا وعدہ کرنے پر مجبور ہوگئے۔ چنانچہ ان کو رہا کردیا گیا اور یہی مولانا احمد اللہ صاحب کے اقرار کا ذریعہ بنائے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے سیاسیات میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ لاہور میں ایک موٹر سے ٹکراکر زخمی ہوگئے اور انتقال فرماگئے رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ ان کے صاحبزادہ ڈاکٹر عبد لنقوی نقمان صاحب اور صاحبزادی زوجہ محترمہ مولانا احمد علی صاحب لاہور میں موجود ہیں۔ سلمہا اللہ تعالیٰ

(۱۸) حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس اللہ سرہ العزیز۔ قصبہ رائے پور ضلع سہارنپور کے

باشندہ تھے نہایت بزرگ و متقی اور باخدا تھے۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے خلیفہ تھے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور حضرت شیخ الہندؒ کے نہایت معتمد دوست تھے ابتدا میں حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو خبر تک نہیں کی اور سالہا سال تک اپنی سرگرمی عمل میں لاتے رہے اور انتہائی اخفار کو جیساکہ مقتضاد وقت تھا کام میں لائے مگر اس قسم کی کارروائی کہاں تک چھپ سکتی تھی ان کو بھی اطراف و جوانب سے خبریں پہونچتی رہیں۔ چنانچہ جب ۱۳۳۰ھ میں مجھ کو حسب وعدہ چند مہینوں کے لئے ہندوستان حاضر ہونا پڑا۔ (میرے خسر حکیم غلام احمد صاحب بچھرایونی مرحوم نے بوقت نکاح وعدہ کرالیا تھا کہ مدینہ منورہ جانے کے بعد اپنے متعلقین کے ساتھ ایک مرتبہ یہاں آنا ہوگا) تو رائے پور بھی حاضر ہونے کی نوبت آئی۔ مولانا عبدالرحیم صاحب مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ حضرت شیخ الہندؒ لوگوں سے بیعت جہاد لیتے ہیں یہ تو بہت خطرناک امر ہے انگریزوں کو اگر خبر ہوگئی تو دارالعلوم کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے اور مسلمانوں کا یہ مرکز علمی اور دینی اجاڑ دیا جائیگا چونکہ مجھ کو اس کی کوئی خبر نہ تھی میں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور یہ عرض کیا کہ میں خود حضرت شیخ الہندؒ سے پوچھوں گا۔ واقعہ یہی تھا کہ باوجودیکہ حضرتؒ مجھ پر بہت زیادہ کرم فرماتے تھے مگر اس وقت تک کسی کارروائی کی خبر نہیں کی گئی۔ مولانا عزیز گل صاحب نے حضرت شیخ الہندؒ سے عرض کیا کہ حسین احمد کو بھی اس مشن میں شامل کرلینا اور اپنی کارروائیوں کی خبر دینا چاہیئے تو فرمایا کہ وہ صرف چند دنوں کے لئے ہندوستان آیا ہے اس کو متوحش مت کرو۔ میں نے رائے پور سے واپسی پر مولانا عبدالرحیم صاحب کا مقالہ ذکر کیا تو حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے دعا فرمائی تھی کہ پچاس برس تک یہ دارالعلوم قائم رہے سو بحمدللہ پچاس برس گذر چکے ہیں اور دارالعلوم اپنی خدمات باحسن وجوہ انجام دے چکا ہے میں یہ جواب سنکر دم بخود ہوگیا اور سمجھ گیا کہ جو واقعات نقل کئے جارہے ہیں وہ صحیح ہیں۔ حضرت کا اس امر میں پختہ خیال قائم ہوگیا ہے اب اپنے ارادہ سے ٹل نہیں سکتے اور نہ کوئی ہٹا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ کچھ عرصہ بعد مولانا عبدالرحیم صاحب کی اور حضرت شیخ الہندؒ کی آپس میں تنہائی میں کھل کر بات چیت ہوئی

تو حضرت شیخ الہند نے ان کو بالکل ہم خیال اور ہمنوا بنالیا اور دونوں حضرات یکجان و دو قالب ہو گئے اور اخیر تک اسی پر قائم رہے۔ جب کہ اعلان جنگ کے بعد حضرت شیخ الہندؒ حجاز جانے لگے تو انھیں کو اپنا قائم مقام بنا گئے اور اپنے کارکنوں کو تاکید کر دی کہ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب کو میرا قائم مقام سمجھنا اور مہتم بالشان امور کو ان سے مشورہ لے کر اور پوچھ کر انجام دینا اور جزوی امور کو مولانا احمد اللہ صاحب انجام دیتے رہیں گے۔ چنانچہ اسی طرح عمل درآمد رہا گیا۔ حضرت رائپوری رحمۃ اللہ علیہ نہایت دل سوزی اور استقلال اور عالی ہمتی سے انتہائی رازداری کے ساتھ امور مہمہ کو انجام دیتے رہے اور ان کے خاص خدام بھی دلچسپی لیتے رہے مگر افسوس کہ ہمارے مالٹہ میں اسیر ہونے کے کچھ بعد ہی مولانا رائے پوری مریض ہوئے اور عرصہ تک بستر مرض پر ناچارگی اور ضعف میں مبتلا رہے ایام دار و گیر میں سی آئی ڈی کا افسران کے پاس بھی تفتیش و استنطاق کے لئے گیا مولانا مرحوم نے تمام الزامات کی تردید کر دی اور بعض میں لاعلمی کا اظہار فرمایا جس پر وہ ناکام واپس آیا اور کہنے لگا کہ مولانا جھوٹ بولتے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا حل

ممکن ہے کہ بعض ناظرین کو خلجان ہو کہ اس جگہ اقرار نہ کرنا یا لاعلمی کا اظہار کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ یہ تو کذب اور جھوٹ ہے جو کہ حرام ہے تو اس میں عرض یہ ہے کہ تعریضی جواب دینا یعنی ایسے کلمات کو جواب میں استعمال کرنا جن کے دو معنی ہوں متکلم ان کے دوسرے معنی لے اور مخاطب کچھ اور سمجھے یہ جھوٹ نہیں ہے اور ایسے موقعہ پر بلا شبہ جائز ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب کہ اپنی زوجہ محترمہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہجرت کرتے ہوئے فلسطین کو تشریف لے جا رہے تھے تو ایک کافر جبار کا ملک راستہ میں پڑا جس کا طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی مرد کسی خوب صورت عورت کے ساتھ اس کی سرحد میں سے گذرتا تھا تو عورت کو چھین لیتا تھا اور اگر وہ مرد عورت کا شوہر ہوتا تھا تو اس کو قتل کر دیتا تھا اور اگر بھائی ہوتا تھا تو چھوڑ دیتا تھا مگر عورت ہر حال میں اپنے قبضہ میں کر لیتا تھا۔ اس کے سی آئی ڈی (جاسوسوں) نے

حضرت سارہ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی خبر بادشاہ کو پہنچائی اس نے فوراً سپاہیوں کو بھیجا تو آپ نے حضرت سارہ سے کہا کہ تم یہ نہ کہنا کہ یہ میرا شوہر ہے بلکہ کہنا کہ یہ (ابراہیم علیہ السلام) میرا بھائی ہے اس سرزمین پر کوئی ایمان والا سوائے میرے اور تمہارے نہیں ہے (یعنی میں تمہارا دینی بھائی ہوں) یہی جواب بادشاہ کے لوگوں کو دیا کہ یہ میری بہن ہے اس لئے انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قتل نہیں کیا۔ تو یہ جواب جھوٹ اور کذب نہیں ہوا بلکہ معاریض میں شمار کیا گیا مخاطبین یعنی بادشاہ اور اس کے لوگ یہ سمجھے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت سارہ علیہما السلام آپس میں نسبی بھائی بہن ہیں۔ اس لئے ان کو چھوڑ دیا۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دینی بھائی بہن ہونے کا ارادہ فرمایا تھا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں" ان فی المعاریض مندوحۃ عن الکذب" (یعنی معاریض میں جھوٹ بولنے سے بچاؤ ہے) اور یہ بھی فرمایا کہ سمجھ دار کو کبھی جھوٹ بولنے کی ضرورت ہوتی ہی نہیں۔ ظلم سے بچنے کے لئے معاریض (تعریضی جواب) صرف جائز نہیں بلکہ بسا اوقات ضروری ہو جاتا ہے اور قسم کھانا بھی درست ہوتا ہے البتہ کسی کے حق تلف کرنے کے لئے ایسا جواب اور قسم درست نہیں۔ یہی طریقہ اکثر سمجھ دار دیانت داروں نے پہلے بھی اختیار کیا ہے اور یہی طریقہ حضرت شیخ الہند رح کے رفقاء حسب ضرورت اختیار کرتے رہے

دوسرا حل عام لوگ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ ہر حالت میں برا اور حرام ہے حالانکہ جھوٹ بعض اوقات میں فرض اور واجب ہو جاتا ہے اور بعض اوقات میں مستحب اور بعض اوقات میں مباح اور بعض اوقات میں حرام اور مکروہ ہوتا ہے۔ اگر کسی بے گناہ غیر مستحق کو کوئی ظالم قتل کرتا ہو اور جھوٹ بول کر اس کو بچانا ممکن ہو تو اس وقت جھوٹ بولنا واجب ہوگا۔ اور اگر جھوٹ کے ذریعہ کوئی بھلائی پیدا ہوتی ہو جیسے دو لڑنے والوں میں صلح کرا دینا) تو اس وقت جھوٹ بولنا مستحب ہو جاتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لیس الکذاب الذی یصلح بین الناس (جو شخص جھوٹ بول کر صلح کرائے وہ جھوٹا نہیں ہے۔) حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں" دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز (اصلاح والا جھوٹ فتنہ والی سچائی سے بہتر ہے) اسی طرح اپنی بیوی سے

ایسا جھوٹ بولنا جس سے محبت میں اضافہ ہو۔ مباح یا مستحب ہے۔ اس کی تفصیل امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب مستصفے الاصول میں اور دوسرے فقہاء احناف و اصولیین نے تحریر فرمادی ہے۔ اس لئے صریح جھوٹ بھی ظالم انگریزوں سے بچاؤ کے لئے کسی طرح ممنوع نہ تھا۔ مالٹہ میں مولانا ع۔ یز گل صاحب نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا (جب کہ بیان لینے والے انگریز کو ہم لوگ جواب دے کر آئے تھے اور وہ سازش اور تحریک آزادی کے متعلق سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹیں پیش کر کے ہم سے اقرار کرانا چاہتا تھا تو مولانا ع۔ یز گل صاحب کو شبہ تھا) کہ ہم لوگوں نے ناجائز کام کیا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ ہمارے بزرگوں نے ۱۸۵۷ء میں سب کچھ کیا تھا مگر جب انگریز حکام نے پوچھا تو سب کا انکار کر کے چلے آئے اور کسی چیز کا اقرار نہ کیا۔ الحاصل یہ شبہ بے علمی کی وجہ سے ہے۔ یہ جھوٹ ناجائز نہیں بلکہ ضروری ہے۔

الحاصل مولانا عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سی آئی ڈی افیسر کے تمام الزامات اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی جماعت کے متعلق تمام باغیانہ سرگرمیوں کا انکار کر دیا حالانکہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے اخلاص اور عقیدت کے دعوے دار ان میں سے بہت سے امور کی خبر دینے والے تھے اسی لئے تصدق حسین افسر خفیہ پولیس مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو نہایت سچا اور حضرت رائے پوری کو نہایت جھوٹا کہتا تھا۔ کیونکہ ان کی رپورٹ سی آئی ڈی تصدق حسین کی دلی خواہش کے مطابق اور اس کے آقا انگریزوں کی طرفداری میں تھی بخلاف مولانا رائے پوری کے بیانات کے کہ وہ بالکل اس کی منشا کے خلاف تھے۔

افسوس کہ ہماری اسارت مالٹہ کے زمانہ ہی میں حضرت رائے پوری کا وصال ہو گیا جس کی خبر مالٹہ ہی میں ہم کو پہونچی۔ اس پر حضرت شیخ الہندؒ کو بہت صدمہ ہوا تھا اور عرصہ تک رہا ان کے مرثیہ میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔ جو کہ آپ کے قصائد میں موجود ہے اور چھپ چکا ہے رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ

(۱۹) مولانا محمد مبین صاحب۔ خطیب دیوبند۔ موصوف دیوبند ہی کے باشندہ اور

عیدگاہ کے قدیمی امام ہیں۔ ان کے خاندان میں امامت عیدگاہ قدیم سے چلی آتی ہے مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں فارغ التحصیل ہوئے اور مدرسہ چھاؤنی انبالہ کے مدرس اور مسجد اسلامیہ کالج انبالہ کے امام سالہا سال رہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ہمیشہ وابستہ اور ان کی مشن کے ممبر رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو بار بار امداد مالی کے لئے برہما رنگون وغیرہ بھیجا جس کو نہایت رازداری کے ساتھ باحسن وجوہ انھوں نے انجام دیا۔ ان پر حکومت ہند کے افسروں نے نہایت زیادہ سختیاں بھی کیں مگر یہ نہایت استقلال سے جواب دیتے رہے اور مرعوب نہ ہوئے آج تک حضرت شیخ الہندؒ کے معتقد اور سچے مخلص ہیں تقسیم ہند کی وجہ سے ان کی معاشی زندگی پر بہت برا اثر پڑا بہت ضعیف اور آنکھوں سے بہت زیادہ معذور ہو گئے ہیں۔ معاشی حالت نہایت گر گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ آمین

(۲۰) مولانا محمد ابراہیم صاحب راندیری موصوف راندیر ضلع سورت کے مشہور و معروف عالم ہیں اگرچہ طبیعت نہایت جوشیلی رکھتے ہیں مگر ساکت وصامت رہ کر ٹھوس کام کے عادی ہیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ہم خیال اور ہمنوا ہیں اور ان کی تحریک آزادی کے موید ہیں انھوں نے اپنے دوستوں سے کوشش کر کے متعدد مرتبہ بڑی بڑی مالی امدادیں فرمائی ہیں۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء افسوس اپریل ۱۹۵۴ء میں ان کی وفات ہو گئی۔

اس تحریک آزادی میں غیر مسلموں کی شرکت

حضرت شیخ الہندؒ نے ایک مستقل مکان اپنے مکان کے قریب کرایہ پر لے رکھا تھا جس کو کوٹھی کے نام سے مشہور کیا جاتا ہے اس میں حضرت کے غیر مسلم ہم خیال دوست اور رفقاء انقلاب ٹھہرا کرتے تھے ان کو نہایت رازداری کے ساتھ خدام خاص ٹھہرا دیتے تھے اور ان کے کھانے پینے کے انتظامات کرتے رہتے تھے اکثر تنہائی کے اوقات میں یا رات کو ان سے حضرت شیخ الہندؒ کی باتیں ہوتی ہیں یہ لوگ سکھ یا بنگالی ہندو انقلابی (بنگال پارٹیشن والے) ہوتے تھے۔ چونکہ رازداری کا بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا تھا اس لئے ان کے نام اور پتے معلوم نہیں

ہو سکے اور نہ حضرت سے پوچھنے کی نوبت آئی۔ علاوہ مذکورہ بالا حضرات کے غیر مشہور حضرات اس تحریک کے ہم خیال اور مشن آزادی کے ممبر بے شمار تھے جن کی تفصیل تطویل چاہتی ہے اور نہ ان کے ذکر کرنے کی ضرورت ہے[1]۔ ہم نے نہایت سرگرم لوگوں کی تفصیل پیش کر دی ہے اور یہ پانچ جماعتیں تبلادی ہیں جو کہ علاوہ مرکز دیوبند کے ہمارے علم میں آسکیں (۱) دین پور شریف (۲) امروٹ شریف (۳) کراچی کھڈہ (۴) دہلی (۵) چکوال ہر جگہ کام کرنے والے حضرات اپنی تیز تر مساعی کی اور انتہائی اخلاص

---

[1] البتہ اس مقام پر مولانا محمد جلیل صاحب کیرانوی کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے مولانا محمد جلیل صاحب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی خدام میں سے ہیں نہایت صغر سنی میں حضرت کی خدمت میں پہونچے یہاں ہی قرآن شریف حفظ کیا اور اس کے بعد فارسی اور عربی کی کتابیں سب پڑہیں چونکہ بہت چھوٹے تھے اس لئے گھر میں جاتے تھے۔ پردہ ان سے اس وقت تک کہ بالغ ہو گئے کسی کا نہ تھا گھر کی تمام خدمتیں اور مہمانوں کی تمام خدمات یہی انجام دیتے تھے اور ہر بات میں ہمیشہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خوشنودی کا خیال رکھتے تھے اس لئے حضرت کو ان کا بہت خیال تھا اور بمنزلہ اولاد ان کی پرورش فرماتے رہے۔ ان کی خدمات ہی کے زمانہ میں حضرت نے اس تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کیا اور ہر قسم کی سرگرمیاں عمل میں لائی گئیں یہ سب کو دیکھتے اور سنتے رہے مگر کبھی کسی راز کی بات کا افشا نہیں کیا۔ حضرت کی اسارت مالٹہ کے زمانہ میں تمام کاروبار اندرون خانہ اور باہر کی خدمات کا یہی انجام دیتے تھے حضرت کو ان پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔ صغر سنی کی وجہ سے اگرچہ یہ مشن کے ممبر نہیں بنائے گئے مگر عموماً تمام باتوں سے کم و بیش ان کو اطلاع تھی جب حضرت کے اسیر ہونے کی خبر آئی تو تلاشی کے خوف سے انھوں نے اس ڈاک کے بہت بڑے ذخیرہ کو جس کو نہایت حفاظت سے مخفی کر لیا تھا رات کے دو بجے جلادیا ان سے بہت لوگوں نے رازہائے سربستہ کو معلوم کرنا چاہا مگر کبھی کسی کو کسی بات کا پتہ نہیں دیا جس وقت حکومت کی طرف سے پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو ان کو بھی زیر حراست الہ آباد لے گئے اور تصدق حسین اور مسٹر سین نے بہت زیادہ پوچھ گچھ کی۔ تصدق حسین نے بہت ڈرایا دھمکایا اور سختیاں بھی کیں مگر کوئی اپنے مقصد کی بات حاصل نہ کر سکے انھوں نے نہایت بے خوفی اور استقلال سے تمام سوالات کے جوابات دئے جہاں پر بڑوں بڑوں کے پیر ڈگمگا گئے تھے یہ ثابت قدم رہے حضرت کی دعاؤں کی برکت سے علمی اور معاشی ترقی کے اچھے پیمانہ پر فائز ہیں حضرتؒ کے بعد پہلے انبالہ میں پھر کراچی میں پھر دارالعلوم دیوبند میں ممتاز حیثیت سے خدمات تدریسیہ انجام دیں اب دارالعلوم ہی میں پہلے درجہ کے مدرسین میں ہیں۔

کی بنا پر صدر کہلانے کے مستحق ہوتے تھے ورنہ باقاعدہ تقرر صدر اور سکریٹری وغیرہ کا مقتضائے وقت اوراحوال گردوپیش کی بناء پر نہ ممکن تھا نہ وقوع میں آیا۔ ہم نے جس جگہ پر بھی صدر یا ناظم وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان میں عملی استحقاق مراد ہے رسمی کارروائی مراد نہیں ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی کارگذاری اس تحریک کی ابتدا میں ضروری سمجھا گیا کہ چونکہ بغیر تشدد (۱) (دائلنس) ہندوستان سے انگریزوں کا نکالنا اور وطن عزیز کا آزاد کرانا ممکن نہیں ہے اس کے لیے مرکز اور اسلحہ اور سپاہی (مجاہدین) وغیرہ ضروری ہیں۔ بنابریں مرکز یاغستان (آزاد قبائل) قرار دیا گیا کہ وہاں اسلحہ اور جانباز سپاہیوں کا انتظام ہونا چاہیئے اس کے علاوہ چونکہ آزاد قبائل کے نوجوان ہمیشہ جہاد کرتے رہتے ہیں اور قوی ہیکل اور جانباز ہوتے ہیں اس لئے ان کو متفق اور متحد کرنا اور ان میں جہاد کی روح پھونکنا بھی ضروری تصور کیا گیا اور انہیں سے کامیابی کی اُمید قائم کی گئی۔ اس بناء پر ضروری سمجھا گیا کہ مندرجہ ذیل امور عمل میں لائے جائیں۔

(الف) ان علاقوں کے باشندوں سے آپس کے نزاعات قدیمہ اور شخصی اور قبائلی دشمنیوں کو مٹایا جائے (ب) ان میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کی جائے (ج) ان میں جوش جہاد اور آزادی کی تڑپ پیدا کی جائے۔ (د) حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کے لوگ (جماعت مجاہدین سرحد جو کہ ستیانا اور چمرقند میں مقیم ہیں اور ان میں اور قبائل میں تنفر اور شکر رنجیاں عرصہ سے چلی آتی ہیں ان کو دور کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس لئے مولانا سیف الرحمٰن صاحب کو دہلی سے مولانا فضل ربی اور مولانا فضل محمود صاحب کو پشاور سے بھیجا اور مولانا محمد اکبر صاحب وغیرہ کو آمادہ کیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اس علاقہ میں بہت سے شاگرد اور مخلص موجود تھے ان سبھوں نے گاؤں گاؤں اور قبیلہ قبیلہ میں پھر کر

---

(۱) اس وقت نان وائلنس کا حربہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا اور کانگریس کی جو کچھ کوششیں اس وقت تک یعنی ۱۹۱۲ء تک تھیں اُن سے کامیابی کی تمنا موہوم بلکہ عبث تھی۔ کیونکہ انگریزانی ڈپلومیسی سے ایسی رکاوٹیں پیدا کر دیتا تھا کہ برسوں کی جدوجہد ایک لمحہ میں خاک میں مل جاتی تھی۔

زمین ہموار کی اور ایک عرصہ میں بفضلہ تعالیٰ بڑے درجہ تک کامیابی نظر آنے لگی۔ انھیں مقاصد کے لیے بار بار حاجی ترنگ زئی صاحب سے بھی استدعا کی گئی کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑیں اور انگریزی حدود سے باہر جا کر ان مقاصد کیلئے کوشش کریں ان کو مختلف مجبوریاں در پیش تھیں ان کے حل کرنے کے خیال سے وہ تاخیر فرما رہے تھے کہ جنگ عمومی چھڑ گئی اور کچھ ہی عرصہ کے بعد ترک بھی مجبور کر دیئے گئے کہ جنگ کا اعلان کر دیں۔ ان کے دو جنگی جہاز جو انھوں نے انگلستان میں بنوائے تھے اور ان پر کروڑوں اشرفیاں خرچ ہوئی تھیں۔ انگریزوں نے ضبط کر لئے اور اسی قسم کے دوسرے غیر منصفانہ معاملات ان سے پیش آئے جو کہ ان کو جنگ میں گھسیٹنے والے تھے یہ ان معاملات کے علاوہ تھے جو کہ طرابلس غرب اور بلقان، کریٹ، یونان وغیرہ میں قریبی زمانہ میں پیش آئے تھے جن کا ہم نے کسی قدر تفصیل سے پہلے تذکرہ کیا ہے۔ بہرحال ترکی حکومت نے مجبور ہو کر اعلان جنگ کر دیا تو اس پر تقریباً آٹھ یا نو محاذوں سے حملہ کیا گیا۔ انگریزوں نے عراق (بصرہ) پر عدن پر سویز پر چناق قلعہ پر اسی طرح روس نے متعدد تین چار محاذوں پر اس یورش کی وجہ سے مسلمانوں میں جس قدر بھی بے چینی ہوتی کم تھی۔ چنانچہ احوال موجودہ سے حضرت شیخ الہند نے حاجی ترنگ زئی صاحب کو مطلع کیا اور ضروری قرار دیا کہ وہ یاغستان چلے جائیں اور ضروری کارروائی عمل میں لائیں اسی طرح مرکز یاغستان اور اس کے کارکنوں کو لکھا۔ چنانچہ جب حاجی صاحب مرحوم پہونچے۔ مجاہدین کا جمگھٹا شمار سے زیادہ ہو گیا۔ مجاہدین چمرقند (حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ) کی جماعت بھی مل گئی۔ بالآخر کچھ عرصہ کے بعد جنگ چھڑ گئی اور بفضلہ تعالیٰ مجاہدین کو غیر متوقع کامیابی ہونے لگی اور انگریزوں کو جانی اور مالی بے حد نقصان اٹھا کر اپنی سرحد پر لوٹ آنا پڑا اور اپنے استحکامات قدیمہ میں پناہ لینا ناگزیر ہو گیا۔ اس پر انگریز نے بالمقابل متعدد مذکورہ ذیل کارروائیاں شروع کر دیں (الف) فوجوں کو اطراف ہندوستان سے جمع کر کے بڑی مقدار میں سرحد پر بھیجنا (ب) عوام میں پروپیگنڈہ کرنا کہ یہ جہاد نہیں ہے جہاد بغیر بادشاہ کے نہیں ہوتا بغیر بادشاہ کے جہاد حرام ہے (ج) پانی کی طرح روپیہ خرچ کرنا اور اپنے لوگوں کو قبائل کے سرداروں کے پاس بھیجنا اور مال و زر بیشمار دے کر ان کو جماعت مجاہدین اور حاجی صاحب موصوف

سے توڑنا (د) عوام میں تبلیغ کرنا کہ مسلمانان سرحد اور افغانوں کے بادشاہ امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان ہیں مسلمانوں کو ان سے بیعت جہاد کرنا چاہیے اور اس وقت تک انتظار کرنا ضروری ہے جب تک وہ جہاد کا علم بلند نہ کریں (ھ) اس وقت مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ کاغذوں پر بیعت جہاد کر کے دستخط کریں اور امیر کابل کے نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں کے دفتر میں یہ کاغذات بھیجیں (و) امیر حبیب اللہ خاں کو مختلف وعدوں کے سبز باغ دکھلا کر اور بے شمار اموال اور نقد روپیہ دے کر اپنی طرف مائل کرنا اور جہاد کے لئے کھڑے ہونے سے روکنا اور یہ وعدہ کرنا کہ اس جنگ سے فارغ ہو کر تمہارے لئے فلاں فلاں وعدے پورے کر دئے جائیں گے ان اور ان جیسی دیگر ڈپلومیسیوں کا اثر ہونا طبعی طور پر لازمی تھا چنانچہ اثر ہوا اور بہت برا ہوا اگر ایسا نہ ہوتا اگر مجاہدین کو رسد اور کارتوسوں کی نیز دیگر اسلحہ کی کمی کی مشکلات نہ پیش آجاتیں۔ ادھر یہ کیا گیا کہ مسلمانان ہند کے ہیجان اور اضطراب کے روکنے کے لئے ہندوستان میں اعلان کیا گیا (الف) ترکوں کو جنگ کے لئے ہم نے مجبور نہیں کیا بلکہ ترک از خود جنگ میں داخل ہوئے ہیں اور ہم تو ان کے اعلان کی وجہ سے جنگ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ حالانکہ ترکوں کو جنگ پر انگریزوں نے مجبور کیا تھا جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں (ب) یہ جنگ سیاسی ہے مذہبی نہیں ہے حالانکہ فتح بیت المقدس پر وزیر اعظم انگلستان لائڈ جارج نے اپنے بیان میں اس کو صلیبی جنگ قرار دیا تھا (ج) ہم مسلمانوں کے مقدس مقامات جدہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بغداد وغیرہ پر نہ بمباری کریں گے اور نہ کوئی اثر جنگ کا ان مقامات مقدسہ پر پڑنے دیں گے مگر بالکل اس کے خلاف عمل کیا گیا جس کا تذکرہ ہم مفصل طور سے عہد شکنیوں کے باب میں کر چکے ہیں (د) ترک مسلمانوں کے خلیفہ نہیں ہیں۔ حالانکہ ۱۸۵۷ء میں سلطان عبد المجید مرحوم سے فرمان مسلمانوں کے لئے انگریزوں سے نہ لڑنے اور ان کی اطاعت کرنے کا بحیثیت خلافت حاصل کیا اور ہندوستان میں پروپیگنڈا کیا کہ خلیفہ کے حکم پر چلنا مسلمانوں کے لئے مذہبی حیثیت سے فرض ہے۔ چنانچہ امیر عبد الرحمن خاں والی کابل مرحوم اپنی تزک میں لکھتے ہیں کہ اسی فرمان خلیفہ کی بنا پر سرحدی قبائل ٹھنڈے پڑ گئے تھے بہرحال ترکوں کے خلیفہ اسلام نہ ہونے اور عدم استحقاق خلافت پر فتوے لکھوائے گئے اور بار بار حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے دستخط

اور تصدیق کے لئے پیش کئے گئے مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دستخط کرنے سے انکار کردیا اور بھرے مجمع میں پھینک کر لکھنے والوں کو بہت برے الفاظ کہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا سفر حجاز

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس برابر کیفیات جہاد کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ ابتدائی کمزوریوں میں کارکنان مرکز کا پیغام آیا کہ ہم رسد اور کارتوسوں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے سخت مجبور ہیں جب تک ان دونوں کا انتظام نہ ہو جہاد حریت جاری نہیں رہ سکتا۔ بحمد اللہ ہمارے پاس بہادر آدمیوں کی کمی نہیں ہے مگر اسلحہ اور رسد کے بغیر ہم بالکل بے دست و پا ہیں ساتھ کی لائی ہوئی روٹیوں کے ختم ہو جانے پر مجاہد کو اپنے گانوں جانا پڑتا ہے اور مورچہ خالی ہو جاتا ہے اور کارتوس کے ختم ہو جانے پر مجاہد بے ہتھیار ہو جاتا ہے اگر کارتوس اور رسد کافی مقدار میں ہو تو توپوں اور مشین گنوں ٹینکوں وغیرہ کا ہم بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں آپ جلد از جلد کسی حکومت کو ہماری پشت پناہی اور امداد کے لئے تیار کیجئے۔ چنانچہ اس امر کی بنا پر حضرت شیخ الہندؒ کا ارادہ بدلا اور مولانا عبید اللہ صاحب کو کابل اور خود کو استنبول پہنچانا ضروری قرار دیا۔ مولانا عبید اللہ صاحب کے کابل جانے کی تفصیل ہم ان کی ذاتی ڈائری سے ناظرین کے سامنے پیش کر چکے ہیں اور حضرت شیخ الہند کے حجاز جانے کی تاریخی تفصیل ہم سفر نامہ مالٹہ میں لکھ چکے ہیں[1] اُن کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ہاں سیاسی کارناموں کو باقتضاء وقت ہم نے اس میں چھپایا اور ذکر نہیں کیا اور بعض امور کا جان بوجھ کر انکار کیا تھا کیونکہ ماحول اس وقت میں اسی کو چاہتا تھا۔ اب چونکہ موانع زائل ہو گئے ہیں اس لئے صرف انھیں کو ناظرین کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چونکہ اس وقت سرحد کے واقعات ہو رہے تھے حکومت ہند بوکھلائی ہوئی تھی اور وہ معمولی شبہ پر بھی گرفتار کر کے نظر بند کر رہی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سی آئی ڈی کی اطلاعات خود ہندوستان میں اور سرحد یاغستان میں بہت زیادہ اور خطرناک تھیں اس لئے بڑی نگرانی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اسی وجہ سے زور دیا تھا کہ آپ جلد از جلد انگریزی عملداری سے نکل جائیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حجاز جانے کا ارادہ کر لیا۔ پہلے سے کوئی تذکرہ نہ تھا فوراً روانہ ہو گئے اب حکومت کا شبہ اور قوی ہو گیا کہ چونکہ ترکی حکومت جنگ کر رہی ہے۔ حضرت شیخ الہند وہاں جا کر

[1] ملاحظہ ہو تتمہ

سازباز کرلیں گے اس لئے ان کو روکنا اور گرفتار کر لینا چاہیئے مگر وہ ملک کی اندرونی ہیجان اور گڑبڑ سے اس زمانہ میں بہت بچتی تھی اس لئے احکام ان کی گرفتاری کے جاری کئے گئے مگر اس طرح کہ ہیجان کی نوبت نہ آئے حضرت کے سفر کی خبر معمولی نہ تھی ہر جگہ تار چلے گئے تھے ہر جنگشن پر آدمیوں کا جمگھٹا ہو جاتا تھا اس لئے راستہ میں کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی۔ بمبئی پہونچے تو وہاں بھی پورا انتظام تھا لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا گرفتاری کے لئے گورنمنٹ بمبئی کے نام گورنر یوپی کا تار پہونچا تو جہاز روانہ ہو چکا تھا۔ پھر گورنر یوپی نے بواسطہ مرکزی حکومت عدن کے گورنر کو تار دیا کہ مولانا محمود حسن صاحب کو جہاز سے اتار لو مگر یہاں بھی لوگ ڈاکٹر انصاری صاحب کے لگے ہوئے تھے انھوں نے تار میں اس قدر تاخیر کردی کہ جہاز عدن سے روانہ ہو گیا۔ پھر تار جدہ میں جہاز کے کپتان کو دیا گیا کہ ان کو جہاز میں گرفتار کر لو اترنے نہ دو۔ مگر اس وقت گورنر حجاز کا انتظام یہ تھا کہ جدہ سے پہلے حجاج کو جزیرہ سعد میں اتار کر مکہ معظمہ پہونچایا جائے اس لئے وہ تار کپتان کو اس وقت ملا جب کہ تمام حجاج جزیرہ سعد میں اتر چکے تھے۔ البتہ حضرت شیخ الہند کے ساتھ متعدد سی آئی ڈی بمبئی بلکہ پہلے سے کردئے گئے تھے تاکہ وہ تمام حرکات وسکنات کی نگرانی رکھیں اور نوٹ کرتے رہیں۔ مگر جزیرہ سعد میں اترتے ہی بعض لوگوں نے ترکی پولس کو اطلاع کردی کہ فلاں فلاں اشخاص انگریزوں کے سی آئی ڈی ہیں انکو ترکی پولس نے گرفتار کر لیا اور اپنی حفاظت میں جدہ بھیج کر ہندوستان واپس کر دیا تاہم کچھ مخفی لوگ باقی رہ گئے۔ بہرحال گرفتاری کی کوششیں پیچھے تھیں اور حضرت شیخ الہند اللہ کی حفاظت میں آگے آگے اس طرح محفوظ ہو کر مکہ معظمہ پہونچ گئے۔

حافظ عبدالجبار صاحب دہلوی مرحوم سے مولانا شیخ الہند کی ملاقات

مکہ معظمہ میں بہت سے ہندوستانی تاجر کاروبار کرتے ہیں مگر دہلی کے تاجر حاجی علی جان مرحوم کے خاندان کی وہاں خصوصی حیثیت ہے۔ تجارت بھی ان کی بڑے پیمانہ پر ہے اور دینداری اور علمی حیثیت بھی ان کی اونچی ہے اہل شہر اور حکام میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس خاندان کا حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے متبعین مجاہدین ستھیانہ وغیرہ سے بھی قدیمی تعلق ہے اس لئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حافظ عبدالجبار صاحب سے جو کہ اس خاندان میں معمر اور سمجھ دار اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے ملے اور ان سے

گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات | معاملات ذکر کرکے گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کرانکی استدعا کی انھوں نے اسی وقت ایک ہندوستانی معاملہ فہم نوجوان تاجر کو جوکہ تسبیحوں کی تجارت کرتے تھے اور ترکی اور عربی زبان سے خوب واقف اور وہاں کے ترکی اسکول کے پڑھے ہوئے تھے بلایا اور حضرت شیخ الہند کے ساتھ کر دیا وہ گئے اور غالب پاشا سے ملاقات کرادی اور جو باتیں حضرت شیخ الہندؒ نے کیں ان کا ترجمہ کرکے غالب پاشا کو سمجھایا۔ غالب پاشا نہایت توجہ اور غور سے تمام باتوں کو سنتے رہے معمولی ملاقات کے بعد کہا کہ آپ کل اسی وقت تشریف لائیں اس وقت میں جواب دوں گا۔ حضرت شیخ الہندؒ اس روز واپس آگئے۔ غالب پاشانے ہندوستان کے معزز تاجروں سے بالا بالا تحقیق کی کہ مولانا محمود حسنؒ صاحب کی حیثیت ہندوستان میں کیا ہے لوگوں نے حضرتؒ کی علمی اور عملی حیثیت شہرت اور مقبولیت کی بہت اونچی شان تبلائی لہذا اگلے دن جب حضرت ملاقات کے لئے تشریف لے گئے تو بہت زیادہ اعزاز کیا اور نہایت تپاک سے ملے اور جو کچھ حضرت نے کہا اس کو قبول کیا دیر تک تحریک اور مشن آزادی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں پھر حضرت نے فرمایا کہ میں انور پاشا سے ملنا چاہتا ہوں انھوں نے فرمایا کہ ان سے ملنے کی کوئی ضرورت آپ کو نہیں ہے میں جو کچھ کہتا ہوں وہ انور پاشا ہی کا کہنا ہے مگر حضرت نے انور پاشا سے ملنے پر اصرار کیا تو انھوں نے ایک تحریر تمام ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اپنی طرف سے بحیثیت گورنر حجاز لکھ کر دی اور ایک تحریر گورنر مدینہ منورہ بصری پاشا کو لکھی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں ان کا احترام کرو اور ان کو استنبول انور پاشا کے پاس پہنچا دو اور ایک تحریر انور پاشا کے نام لکھدی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں ان کے مطالبات پورے کیجئے پھر تحریک آزادی کے متعلق حضرت شیخ کو ہدایات کیں کہ آپ تمام ہندوستانیوں کو آزادی کامل کے مطالبہ پر آمادہ کریں۔ ہم ہر قسم کی امداد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے جو کچھ ہو سکیگا ضرور کریں گے عنقریب صلح کی مجلس منعقد ہوگی تو ہم اور ہمارے حلفاء جرمنی اور آسٹریا وغیرہ ہندوستان کی مکمل آزادی کیلئے پوری جد وجہد کریں گے۔ ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ ہندوستانی لیڈر سست پڑجائیں اور انگریزوں کی باتوں میں آکر اس کے انتداب (مینڈیٹ) یا اس کی تابعداری پر راضی ہوجائیں۔ تمام ہندوستانیوں کو اخباروں، عالم مجبوں، تقریروں، تحریروں میں اندرون ہند اور بیرون ہند ایک زبان

اور ایک قلم ہو کر یہی مطالبہ جاری رکھنا چاہیئے اور جب تک مقصد حاصل نہ ہو جائے ساکت نہ ہونا چاہیئے۔ اس کا پروپیگنڈا پوری طرح پر جاری کرنا چاہیئے۔ اس مقصد کیلئے آپ کو واپس جانا اور آپس میں اتفاق و اتحاد کے ساتھ مطالبہ کرانا ازبس ضروری ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس وقت انگریز مجھ کو نہایت خطرناک نظر سے دیکھتے ہیں میں اگر ہندوستان جاؤں گا تو راستے ہی میں گرفتار کر لیا جاؤں گا مگر میں اپنے رفقاء کو اس کام کیلئے تیار کر کے ہندوستان بھیجتا ہوں۔ اگرچہ وہاں کی جماعتیں کانگریس وغیرہ اس پر عمل درآمد کر رہی ہیں مگر اب آپ کے حکم کے موافق کوشش زیادہ ہو گی اور پہلے سے زیادہ زوردار طریقہ پر یہ مطالبہ جاری کیا جائے گا۔ میں بالفعل بالا بالا ہندوستان کی مغربی صدود میں جانا چاہتا ہوں وہاں میرے مشن کے لوگ کام کر رہے ہیں ان میں مل کر کام کروں گا اس پہلی ملاقات کے بعد جب تک وہ مکہ معظمہ میں رہے دو تین ملاقاتیں نہایت راز کے ساتھ ہوئیں مکہ معظمہ کے ہندوستانی باشندوں یا انگریزی سی آئی ڈی کو خبر نہیں ہو سکی۔ پھر غالب پاشا طائف کو اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ کو روانہ ہو گئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ارادہ تھا کہ مدینہ منورہ میں تھوڑے دن قیام کر کے استنبول کو روانہ ہو نگے۔ اپنے تمام ساتھیوں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب مولانا محمد میاں صاحب مولانا سہول صاحب وغیرہ کو آخری قافلہ میں مدینہ منورہ سے ہندوستان کو روانہ کر دیا۔ جدہ پہونچکر ان کو کوئی جہاز ہندوستان جانے والا نہ ملا اس لئے وہاں ٹھہرنا پڑ گیا۔ جدا ہوتے وقت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو دیوبند کے مرکز پر کام کرنے کی ہدایات فرمائیں اور بہت سے خفیہ امور پر مطلع فرمایا اور مولوی محمد میاں صاحب کو جو کہ بعد میں محمد منصور انصاری کے نام سے مشہور ہوئے خاص شعبوں کی نگرانی سپرد کی۔ غالب پاشا کی تحریر بھی انھی کو دی گئی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اگرچہ پہلے سے اس تحریک آزادی میں شریک نہیں تھے۔ مگر مدینہ منورہ میں پہونچکر بالکل متحد اور ہم نوا ہو گئے تھے۔

میرا سیاسیات میں داخل ہونا میں اس وقت تک نہ مشن آزادی ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہندؒ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ مدینہ منورہ

پہونچنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا۔ میں اس وقت تک فقط علمی جدوجہد میں مشغول تھا۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں اس سے پہلے جب کہ محاذ سویز کے لئے متطوعین (والنٹروں) کو بھیجنا شروع کیا گیا تھا ترغیب جہاد پر تقریر کرنے کی نوبت آئی تھی اور اس سے متاثر ہو کر کچھ لوگ اس محاذ پہ جہاد کے لئے مدینہ منورہ سے گئے تھے مگر اس کے علاوہ عملی جدوجہد کی نوبت نہیں آئی تھی اب حضرت شیخ الہندؒ کے واقعات اور خیالات سن کر میں بھی متاثر ہوا اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بھی۔ یہ وقت میری سیاسیات کی ابتدا اور بسم اللہ کا وقت ہے اور یہی وقت مولانا خلیل احمد صاحب کی ابتدائی شرکت کا ہے رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ آمین اس کے بعد مولانا خلیل احمد صاحب جب تک حجاز میں رہے بالکل متفق اور ہم نوا رہے۔

تقدیری امور پیش آکر رہتے ہیں۔ کچھ لوگ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے ساتھ جہاز میں لاہور کے باشندے رفیق رہے تھے ان میں سے دو نوجوان مدینہ منورہ میں رہ گئے ہندوستان واپس نہیں ہوئے۔ جب تک عام حجاج مدینہ منورہ میں مقیم رہے کوئی تفتیش ترکی پولیس نے نہیں کی مگر قافلہ روانہ ہونے کے بعد تجسس شروع ہوا اور ہر باقی رہنے والے کی دیکھ بھال جاری ہوئی وہ دونوں لاہوری نوجوان پولیس انسپکٹر کی نظر میں مشتبہ ثابت ہوئے پولیس نے ان کو گرفتار کر لیا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سیدھے سادھے بزرگ تھے ان کو ان دونوں کے متعلق حسن ظن تھا مولانا نے ان کی گورنر مدینہ کے یہاں برات کی اس لئے پولس کمشنر نے مولانا خلیل احمد صاحب کو بھی مشتبہ قرار دیا اور گورنر مدینہ منورہ بصری باشا کو نہ صرف ان دو نوجوانوں کی طرف سے بلکہ مولانا خلیل احمد صاحب کی طرف سے بھی بدظن کرنا شروع کیا۔ ادھر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے جدہ سے ہر ڈاک میں طویل طویل خطوط پانچ پانچ چھ چھ ورقوں پر بھیجنے شروع کئے وہاں ان کو کوئی کام نہیں تھا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو بلاد ترک مضامین لکھتے تھے اور چونکہ بوجہ جنگ ڈاک خانہ میں کوئی خط غیر عربی یا ترکی نہیں لیا جاتا تھا تو انھوں نے بدویوں کے ذریعہ بھیجنا شروع کیا وہی ڈاک لانے والا بدوی بجی طریقہ پر لاتا تھا پوسٹ

آفس کی مہر اور ٹکٹ اُن پر نہیں تھے۔ یہ طریقہ حجاز میں جاری تھا وہ ڈاک لانے والا بدوی کچھ اجرت لیکر مکتوب الیہ کو پرائیویٹ خط پہونچا دیتا تھا۔ کسی طریقہ سے پولس کمشنر نے وہ خطوط بدوی سے حاصل کر لئے وہ خطوط سنسر ہوئے تو پولس کمشنر کو ان کے ترجموں سے اور بغیر پوسٹ آفس آنے سے شبہ ہوا اس نے گورنر مدینہ "بصری بادشاہ" کو بدظن کر دیا۔ جب کہ ہم سب مطمئن تھے پولس کمشنر کی طرف سے گورنر مدینہ طیبہ کے پاس یہ شکایتیں پونچیں اور وہ ان سب حضرات سے بدظن ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب حضرت شیخ الہندؒ صاحب اس سے ملنے اور استنبول جانے کے لئے تقاضا کرنے گئے تو اس کا رخ بدلا ہوا پایا اور دیکھا کہ وہ غیر اطمینان بخش باتیں کر رہا ہے اس پر مزید یہ کارروائی کی گئی کہ دونوں حضرات (حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ) کو آفس میں بلا کر پوچھ گچھ کی گئی اور جوابات قلمبند کر کے شام کو بھیجے گئے اس لئے سب کو فکر ہوئی کہ کہیں کوئی فتنہ سامنے نہ آجائے۔ جنگ کا زمانہ ہے ہر ایک حکومت اس وقت انتہائی احتیاط سے کام لیتی ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان احوال کو دیکھکر اسی ترجمان (ترکی تاجر) کے واسطے سے غالب پاشا کو خط لکھا کہ یہاں گورنر مدینہ منورہ رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ پولس کمشنر نے گورنر کو مشتبہ کر دیا ہے کیونکہ اس کو ہمارے مخالفین نے بدظن کر دیا ہے۔ اس خط کے پاتے ہی غالب پاشا نے گورنر مدینہ کو نہایت تاکیدی خط لکھا کہ مولانا محمود حسن صاحب بہت بڑے اور معتمد علیہ شخص ہیں میں نے پوری تحقیق کر لی ہے ان پر ہرگز شبہ نہ کرو اور ان کے منشا کے مطابق انکو انور پاشا کے پاس روانہ کر دو۔ اس سے گورنر مدینہ منورہ کا رویہ اور خیال یکبارگی بدل گیا اور اس نے حضرت رحمۃ اللہ کو بلا کر معذرت کی اور پولس کمشنر کو بلا کر تنبیہ کی اور حضرت شیخ الہند کو کہا کہ آپ تیاری کر لیں جب آپ تیار ہو جائیں گے بھیجدیا جائے گا اس کے ایک دو دن بعد ہی خبر آئی کہ انور پاشا اور جمال پاشا مدینہ منورہ آرہے ہیں۔

انور پاشا اور جمال پاشا کی مدینہ منورہ میں آمد اور ملاقات

اس وقت تک مدینہ حجاز ریلوے جا رہی تھی۔ ٹرین آتی جاتی تھی تار بھی جاری تھا۔ یکایک تار آیا کہ یہ دونوں وزیران جنگ دورہ کرتے ہوئے کل کو مدینہ منورہ پہنچیں گے ہم نے بھی عرضی تیار کی حکومت مدینہ منورہ بھی استقبال کی

تیاری میں مشغول ہوگئی اور اہل شہر بھی استقبال کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ چونکہ انور پاشا اس زمانہ میں حکومت ترکیہ کے وزیر جنگ تھے اور جمال پاشا چوتھے فیلق (ڈویژن) کے جو کہ محاذ جنوبی اور غربی پر یعنی میدان سویز سینا، حجاز پر متعین تھا، کمانڈر تھے اس لئے انور پاشا کا فریضہ تھا کہ مرکز کی خبر گیری رکھتے ہوئے ہر محاذ کی محافظت کریں اور جمال بادشاہ کو صرف اپنے محاذ کی خبر گیری ضروری تھی۔ اس لئے انور پاشا تمام محاذوں کا دورہ کرتے ہوئے جب محاذ جنوبی غربی پر پہونچے اور سوریہ (سیریہ شام) اور سویز وغیرہ سے فارغ ہوئے تو ضروری معلوم ہوا کہ بادشاہ دوجہاں سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کا شرف بھی حاصل کر لیں اس لئے مدینہ منورہ کی حاضری کا ارادہ کیا گیا اور جمعہ کا مبارک دن اس کے لئے مقرر کیا گیا۔ چنانچہ جمعہ کی صبح کو تقریباً ۹ یا ۱۰ بجے وہ اسپیشل ٹرین جس میں یہ دونوں وزراء اور ان کے رفقاء تھے حسب اعلان مدینہ منورہ پہونچی۔ وقت معین سے پہلے مشتاقان ملاقات اور زائرین کی بے شمار تعداد نے تمام اسٹیشن اور اس کے جوانب کو بھر رکھا تھا۔ اہل شہر اور حکومت اور فوج کی طرف سے جلوس کا انتظام کیا گیا تھا جب دونوں حضرات اترے تو اسٹیشن کے بڑے ہال میں آئے وہاں میونسپلٹی کی طرف سے ایڈریس پیش کیا گیا چاء کا پہلے سے انتظام تھا روساء شہر اور معززین کا تعارف کرایا گیا۔ ایڈریس کا جواب دینے کے بعد مسجد نبوی کی طرف روانگی ہوئی چونکہ جمعہ کا وقت قریب آ گیا تھا اس لئے یہی قصد کیا گیا کہ زیارت حضور علیہ السلام سے فارغ ہو کر مسجد ہی میں ٹھہرے رہیں نماز جمعہ سے فراغت کے بعد قیام گاہ پر جائیں۔ جلوس کی روانگی کے وقت فٹن سواری کے لئے پیش کی گئی تو انور پاشا نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم غلامانہ طریق سے بارگاہ نبوت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ اس لئے پیدل چلیں گے۔ اہل شہر نے پہلے ہی سے جلوس کی مندرجہ ذیل ترتیب دے رکھی تھی ارباب طریقت کا مجمع معہ اپنے مریدین کے سب سے آگے آگے زرین جھنڈے لئے ہوئے اور ذکر و تسبیح بالجہر کے ساتھ اشعار مدحیہ پڑھتے ہوئے چل رہا تھا۔ ان کی سات یا آٹھ جماعتیں تھیں اس کے بعد حرم محترم نبوی کے خدام کی علیحدہ علیحدہ مختلف جماعتیں تھیں موذنوں کی جماعت جاروب کشوں کی جماعت اماموں کی جماعت خطیبوں کی

کی جماعت علیحدہ علیحدہ تھیں۔ سب سے اخیر میں حجرہ شریفہ کے خصوصی خدام آغاوات (خواجہ سراؤں) کی جماعت تھی۔ سب کے سب اپنی اپنی یونیفارم (وردیاں) پہنے ہوئے حمد وصلوٰۃ دعاؤ ثنا پڑھتے ہوئے خراماں خراماں چل رہے تھے ان کے بعد یہ دونوں وزیر (انور پاشا اور جمال پاشا) نہایت ادب سے ہاتھ باندھے نظریں نیچے کئے ہوئے چل رہے تھے ان کے پیچھے ان کے رفقاء اور حکام شہر تھے ان کے بعد اہل شہر تھے۔ تمام جلوس کے دائیں اور بائیں مسلح فوجیوں کی قطار تھی۔ میں (کاتب الحروف) تاک میں تھا کہ موقع ملے تو انور پاشا کے پاس پہونچوں اور عرضی پیش کر دوں۔ چنانچہ قطار چیر کر انور پاشا کے پاس پہنچا اور اس عرضی کو (جس میں حضرت شیخ نے تنہائی میں ملاقات کی استدعا کی تھی پیش کر دی انھوں نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری کو دیدی۔ مفتی مامون بری کو جو کہ مدینہ منورہ میں تمام مذہبی اور دینی طبقات کے رسمی سردار تھے اور نقیب الاشراف شامیؒ کو جو کہ رفقاء انور پاشا میں سے تھے میں نے پہلے سے تیار کر لیا تھا۔ ان کی اعانت اور ہمدردی کی وجہ سے مجھ کو کسی طرف سے روک ٹوک نہیں کی گئی۔ میں عرضی دے کر واپس آیا تو بعد میں معلوم ہوا کہ عرضی پر غور کیا گیا اور دونوں مذکورہ بالا معززین کی سعی سے مغرب کے بعد کا وقت تنہائی میں ملاقات کا دیا گیا چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ موقعہ ملاقات پر پہونچے ایک تنہا اور بند کمرہ میں ملاقات ہوئی۔ جمال پاشا سے باتیں ہوئیں۔ غالب پاشا کا خط ان کو دکھایا گیا۔ بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے اور تمام باتیں غور اور اطمینان سے سنیں اور فرمایا کہ تحریک مطالبہ آزادی اہل ہند کو متفقہ طور سے جاری رکھنی چاہیئے جب تک مقصود یعنی آزادی کامل حاصل نہ ہو جائے ساکت نہ ہوں۔ عنقریب صلح کی مجلس بیٹھے گی ہم اہل ہند کی آزادی کے لئے پوری جد وجہد عمل میں لائیں گے۔ تم لوگ مطمئن رہو۔ اور جس طرح ممکن ہوگا ہم ان کی (اہل ہند) کی امداد و اعانت کریں گے اس وعدہ اور عہد کے لئے انھوں نے کہا کہ تمہاری خواہش کے موافق تحریر بھی دیں گے ہم نے عرض کیا کہ تحریر صرف ترکی زبان میں نہ ہونی چاہیئے بلکہ عربی اور فارسی میں بھی ہونی چاہیئے تاکہ اہل ہند سمجھ سکیں انھوں نے اس کو قبول کیا مگر یہ کہا کہ چونکہ یہاں کا قیام حسب پروگرام تھوڑا ہے اور مقامی مشاغل بہت زیادہ ہیں اس لئے ہم شام

دمشق) جاکر تحریریں مکمل کر کے بھیجدیں گے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مطالبہ کیا کہ مجھ کو حدود افغانستان تک بالا بالا پہونچا دیا جائے ہندوستان کے راستے سے مجھ کو وہاں تک (مرکز تحریک یعنی یاغستان تک) اس وقت پہونچنا غیر ممکن ہے انھوں نے اس سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ روس نے اپنی فوجیں ایران میں داخل کر کے افغانستان کا راستہ کاٹ دیا ہے اور سلطان آباد تک پہونچ گیا ہے اس لئے یہ امر ہمارے قبضہ سے اس وقت باہر ہے یا تو آپ جدہ ہی کے راستہ سے اپنے وطن واپس جائیں اور اگر آپ کو اپنی گرفتاری کا خطرہ ہے تو حجاز یا ترکی عملداری میں کسی دوسری جگہ قیام فرمائیں۔ اطمینان بخش باتوں کے ہو جانے کے بعد ہم واپس آ گئے۔

مسجد نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں جلسۂ علماء اور حضرت شیخ الہندؒ

مفتی مامون بری مرحوم صدر علماء مدینہ منورہ کے پاس انور پاشا کا حکم اسی شب میں پہونچا کہ میں علماء مدینہ منورہ کی تقریریں سننے کا شائق ہوں مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہر ایک عالم کے حلقہ درس میں علیحدہ علیحدہ جاکر تقریریں سنوں اس لئے میری خواہش ہے کہ صبح کو بعد از اشراق مسجد نبوی میں علماء مدینہ جمع ہو جائیں اور اپنی اپنی تقریروں سے ہم کو مستفیض فرمائیں مفتی صاحب موصوف چونکہ ہمارے استاذ الاساتذہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مرحوم مجددی دہلوی کے شاگرد تھے اس لئے کاتب الحروف اور حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے ساتھ نہایت دوستانہ بلکہ مشفقانہ تعلق رکھتے تھے انھوں نے نقیب العلماء کو بھیجا کہ انور پاشا چاہتے ہیں کہ صبح کو اشراق کے بعد علماء کا اجتماع مسجد نبوی (حرم محترم میں) ہو اور علماء تقریر کر کے حاضرین مجلس کو مستفیض کریں اس لئے تجھ کو اس وقت حاضر ہونا چاہیئے اور میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر دو حضرات مشایخ بھی تشریف لائیں ہمارے لئے یہ زرین موقعہ تھا ہم نے قبول کر لیا۔ چنانچہ اجتماع ہوا اور مقام صدارت انور پاشا کے لئے تعلیم کیا گیا مفتی صاحب ان کے سامنے وسط میں بیٹھے اور اپنے بائیں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے بائیں مولانا خلیل احمد صاحب اور ان کے بائیں کاتب الحروف کو بٹھایا گیا مفتی صاحب نے اولاً انور پاشا اور جمال پاشا سے تمام علماء حاضرین کا تعارف اور مصافحہ کرایا

بعض حضرات نے کچھ نعتیہ اشعار بلند آواز سے پڑھے اس کے بعد تقریر کا حکم ہوا۔ حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب رحمہم اللہ نے یہ عذر کیا کہ چونکہ ہم ہندوستانی ہیں ہم کو عربی زبان میں تقریر کی عادت اور مہارت نہیں ہے اس لئے ہم معافی چاہتے ہیں۔ پھر مجھ کو حکم کیا گیا۔ مجھ کو عربی زبان میں عادت تھی ہی میں نے حسب مناسبت وقت فلسفہ جہاد پر مبسوط اور مفصل تقریر کی جس میں عقلی اور نقلی دلائل سے روشنی ڈالی کہ نوع انسان کی فلاح اور بہبودی کے لئے جہاد عقلی طور پر ضروری ہے اسی میں انسانوں کی ترقی اور بہبودی اور کمال مضمر ہے اس کے علاوہ مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دیا گیا تھا یہ تقریر تقریباً آدھ گھنٹہ یا اس سے زیادہ جاری رہی اس کو حاضرین مجلس نے بہت پسند کیا اور نہایت توجہ اور غور سے سنتے رہے بعد از تقریر سبھوں نے خوشی اور ممنونیت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد دوسرے علمانے دوسرے موضوعوں پر تقریریں کیں مگر افسوس کہ حاضرین مجلس نے انکی تقریروں کو اس قدر استحسان کی نظر سے نہیں دیکھا۔ تقریباً دو گھنٹہ کے بعد یہ جلسہ ختم ہو گیا انور پاشا نے کچھ نقد حاضر ہونے والے علماء کے لئے بذریعہ مفتی صاحب موصوف بطور نذرانہ بھیجا جو کہ پانچ اشرفی فی کس تقسیم کیا گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے عذر کیا کہ ہمارے پاس خرچ کافی مقدار میں موجود ہے ہم کو حاجت نہیں ہے تو کہا گیا کہ یہ نقد صدقہ اور خیرات نہیں ہے یہ عطیہ شاہانہ ہے اس کو قبول کرنا چاہیئے تو دونوں حضرات نے قبول فرما کر مجھ کو ہی دیدیا۔

انور پاشا اور جمال پاشا کا شام کو روانہ ہونا اور تحریرات کا وہاں سے بھیجنا

اس جلسہ کے چند گھنٹہ بعد دونوں حضرات اور ان کے رفقاء اسپیشل ٹرین میں شام کو واپس ہو گئے اور دو تین دن کے بعد تحریریں تینوں زبانوں میں مرتب شدہ دونوں وزیروں کی دستخط سے حضرت شیخ الہندؒ کے پاس بذریعہ گورنر مدینہ منورہ شام سے آگئیں۔ مضمون سب کا ایک ہی تھا صرف زبان کا فرق تھا۔ جس میں ہندوستانیوں کے مطالبہ آزادی کے استحسان اور ان سے اس مطالبہ میں ہمدردی کو ظاہر کرتے ہوئے ان کی اس بارہ میں امداد و اعانت کا وعدہ تھا اور ہر اس شخص کو جو کہ ترکی رعیت یا ملازم ہو حکم تھا کہ مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہندؒ) پر اعتماد کرے اور ان کی اعانت میں حصہ لے۔

تحریرات اور وثایق کا ہندوستان پہونچانا

چونکہ حضرت شیخ الہند کو دھن لگی ہوئی تھی کہ جس طرح ممکن ہو یہ مرکز تحریک "یاغستان" جلد از جلد پہونچ جاوٗں (اگرچہ اعلیٰ درجے کے ترکی افیسر اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اصرار کرتے تھے کہ آپ ترکی قلمرو میں قیام کر کے یہاں ہی سے اپنی تحریک چلاتے رہیں)، اس لئے تجویز فرمایا کہ ان تحریروں کے فوٹو متعدد لئے جائیں اور ہر مرکز اور برانچ پر وہ پہونچادئے جائیں مگر انگریزی عمل داری میں جانے والوں کی چونکہ نہایت سخت تفتیش ہوتی تھی۔ کسی چیز کا نکال کرے جانا نہایت مشکل ہوتا تھا اس لئے یہ تجویز ہوئی کہ لکڑی کا صندوق کپڑوں کے رکھنے کا بنوایا جائے اور اس کے تختوں کو اندر سے کھود کر اس میں کاغذات رکھ دئے جائیں اور پھر تختوں کو اس طرح ملادیا جائے کہ جوڑ ظاہر نہ ہو اس وقت ایک نہایت ماہر اور استاد بڑھئی ہمارے مکان میں لکڑی کا کام کر رہا تھا اس سے کہا گیا اس نے اسی طرح جادی لکڑی کا صندوق بنادیا اور کھدے ہوئے تختہ میں کاغذات رکھ کر اس طرح بند کر دیا کہ باہر سے دیکھنے والا کتنا ہی مبصر کیوں نہ ہو شبہ بھی کر سکے۔ صندوق میں کچھ زائد کپڑے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اور کچھ نئے کپڑے اور شامی تھان ریشمین اور غیر ریشمین مشجر وغیرہ کے بچوں اور عورتوں کے لئے رکھ دئے گئے اور چونکہ ہر مہینہ میں تجارتی جہاز مغل کمپنی کا غلہ اور سامان لے کر جدہ آتا تھا اور واپسی پر بقیہ حجاج کو لے جاتا تھا تجویز ہوا کہ اس میں حضرت شیخ الہندؒ کے بقیہ رفقاء اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور ان کے رفقاء روانہ کر دئے جائیں۔ چونکہ زمانہ جنگ کا تھا اس لئے جہازوں کی آمد ورفت عام دستور کے مطابق جاری نہ تھی اس لئے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے رفقاء میں سے مولانا ہادی حسن صاحب رئیس خانجہاں پور ضلع مظفر نگر اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی (جو کہ حیدرآباد سندھ کے باشندے اور مشن آزادی کے پہلے سے ممبر تھے)، باقی رہ گئے تھے اور جانیکا قصد[1] فرما رہے تھے۔ ان کو وہ صندوق دیدیا گیا اور سمجھا دیا گیا کہ اپنے مکان پر پہونچکر

---

[1] بلکہ اسی مقصد سے دو مہینہ پہلے جدہ روانہ ہو چکے تھے مگر بندر پر جہاز نہ ملنے کی وجہ سے وہ اور شاہ بخش صاحب موصوف مکہ معظمہ جاکر بانتظار جہاز ٹھہر گئے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ مع دیگر رفقاء جب مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ پہونچے تو اسوقت تک یہ وہیں تھے اور جہاز کے منتظر تھے۔

ان کاغذات کو نکال لیں اور حاجی نور الحسن صاحب (رئیس موضع رتھیڑی ضلع مظفر نگر کو دیدیں۔ وہ احمد مرزا صاحب فوٹو گرافر دہلی سے ان تحریروں کے فوٹو اتروا کر چند کاپیاں لے لیں گے اور فلاں فلاں جگہ پہنچا دیں گے۔

حضرت شیخ الہند قدس اللہ العزیز اور آپ کے رفقاء مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ کو

حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقاء کا قافلہ ۱۲ جمادی الثانی کو مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر اخیر ماہ مذکور میں مکہ معظمہ پہونچا حضرت شیخ الہند قدس اللہ العزیز نے چند روز مکہ معظمہ میں قیام فرما کر "طائف" کا قصد فرمایا اور ۲۰ رجب کو آپ طائف روانہ ہو گئے۔ مگر حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ اور دیگر رفقاءؒ مکہ معظمہ میں رہ گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ شریف حسین کی بغاوت کی وجہ سے طائف میں محصور ہو گئے جب دس شوال کو طائف سے واپس ہو کر مکہ معظمہ پہونچے تو معلوم ہوا کہ مولانا خلیل احمد صاحب اور دوسرے رفقاء جہاز آجانے کی وجہ سے جدہ روانہ ہو گئے ہیں چونکہ کوئی خبر حضرت شیخ الہندؒ کے طائف سے واپس ہونے کی نہیں تھی اس لئے یہ سب حضرات بغیر انتظار اور بلا ملاقات روانہ ہو گئے تھے۔ حضرت شیخ الہند نے ضروری سمجھا کہ ان سے وداعی ملاقات کی جائے اس لئے حضرت شیخ الہندؒ بھی جدہ روانہ ہو گئے۔ جب جہاز سامان وغیرہ اتار کر اور اپنی ضروریات پوری کر کے تیار ہو گیا تو جانے والے حضرات ٹکٹ لے کر سوار ہو گئے حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ اور حاجی مقبول احمد صاحب تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھیوں میں سے مولانا ہادی حسن صاحب خانجہاں پوری اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی تھے۔ ان سبھوں کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ساحل (پورٹ) تک رخصت کیا اور جہاز روانہ ہو گیا

تحریرات کا ہندستان پہونچنا اور سی آئی ڈی کی تفتیش سے بچکر نکلجانا

بمبئی میں سی آئی ڈی کو اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخلصین کو خیال تھا کہ اسی جہاز میں حضرت شیخ الہندؒ تشریف لائیں گے اس لئے انگریزی پولس سی آئی ڈی اور اہل شہر کا بہت بڑا مجمع جہاز پر پہونچ گیا تھا۔ اسی مجمع میں سے ایک صاحب نے جو حضرت شیخ الہندؒ کے مخلصین میں سے تھے مولانا ہادی حسن صاحب

سے کہا کہ اگر کوئی چیز محفوظ رکھنی ہو تو مجھ کو فوراً دیدیجئے میں اس کو نکال دوں گا اور جہاں پہونچانا ہو اس کا پتہ دیدیجئے۔ وہاں پہنچا دوں گا۔ مولانا ہادی حسن صاحب اگرچہ پہلے سے ان سے واقف نہیں تھے مگر ان کے مخصوص انداز سے ان کے اخلاص و صداقت کا یقین ہوگیا اور صندوق ان کے حوالہ کردیا یہ صاحب عام مسافروں کے سامان کے ساتھ یہ صندوق بھی قلیوں سے اٹھوا کر لے گئے اور فوراً اسٹیشن لے جا کر بذریعہ پارسل چلتا کردیا۔ پولیس اور سی آئی ڈی کو اس کی ہوا بھی نہ لگ سکی (یہ حضرت شیخ الہندؒ کی کرامت تھی) جب یہ صاحب صندوق اٹھوا کر لے جارہے تھے اس وقت پولیس اور سی۔آئی۔ڈی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو ڈھونڈنے میں مشغول تھی۔ جب یہ یقین ہوگیا کہ حضرت شیخ الہندؒ نہیں ہیں۔ البتہ ان کے ساتھ کے کچھ لوگ ہیں تو پولیس نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور مولانا ہادی حسن صاحب کو حراست میں لے لیا اور نہایت سخت تلاشی لی۔ حتیٰ کہ ہاتھ کی چھڑی بھی توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کردی۔ مگر بحمد اللہ کوئی مشتبہ چیز نہیں نکلی[1]۔ پھر ان سب کو پولیس کی حراست میں نینی تال پہونچا دیا گیا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے وہاں پوچھ گچھ ہوئی تو فرمایا کہ میں فلاں جہاز سے فلاں تاریخ کو گیا تھا۔ مولانا محمود الحسن شیخ الہندؒ کا ساتھ نہ جاتے میں تھا نہ آتے میں۔ البتہ عام حاجیوں کی طرح حج و زیارت میں میری شرکت بھی رہی میں ان کی پارٹی میں نہیں ہوں ایک ہفتہ یا عشرہ حضرت مولانا موصوف کو رکھ کر چھوڑ دیا گیا البتہ مولانا ہادی حسن صاحب کو روک لیا گیا ان سے بہت زیادہ پوچھ گچھ ہوئی۔ ڈرایا دھمکایا گیا۔ سختی بھی کی گئی اور لالچ بھی دیا گیا مگر یہ نہایت مستقل رہے۔ کسی راز کی خبر نہیں دی۔ جب ہر قسم کی سختی اور طمع دینے پر بھی کوئی بات معلوم نہیں

---

[1] حاجی شاہ بخش صاحب سندھی کے پاس ان انقلابی اخباروں کے پرچے تھے جن کو خیری برادرس نے برلین سے جاری کیا تھا اور جو اعلانات ترکی سے ترغیب جہاد وغیرہ میں شائع ہوتے تھے ان سب کو انھوں نے زنبیل میں حفاظت سے رکھ رکھا تھا جب جہاز پر پولیس کی یہ یورش دیکھی تو یہ اسی بھیڑ میں زنبیل ہاتھ میں لٹکائے ہوئے پھرتی سے نکل گئے چونکہ غیر معروف شخص تھے کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا مگر جب وطن پہنچے تو گرفتار کر لئے گئے اور کچھ دنوں نظر بند رہ کر رہا ہوگئے

ہوئی تو ایک ڈیڑھ ماہ بعد آپ کو بھی رہا کر دیا گیا

صندوق خان جہان پور میں مولانا محمد نبی صاحب کو کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ صندوق کے تختوں میں کوئی راز کی چیز ہے لہذا جیسے ہی صندوق پہنچا اس کے کپڑے نکال کر لکڑی کے دوسرے صندوق میں رکھ دیئے۔ اور اس صندوق کو توڑنا شروع کر دیا۔ ان کی اطلاع صحیح ثابت ہوئی اور ایک تختہ کے اندر سے یہ تینوں کاغذات برآمد ہوئے فوراً ہی ان کو نکال کر محفوظ کر لیا۔

پولیس کی یورش۔ تلاشی اور حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز کی کرامت تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ایک صاحب کے بیان سے سی آئی ڈی نے پتہ چلا لیا کہ وہ کاغذات لکڑی کے ایک صندوق میں مولانا ہادی حسن صاحب کے یہاں ہیں فوراً مولانا کے مکان پر پولیس کی دوڑ پہنچی اور مکان کا محاصرہ کر لیا۔ ایک عجیب وغریب اتفاق تھا کہ مولانا محمد نبی صاحب اسی وقت ان تحریروں کو نکالے ہوئے نقل کر رہے تھے سپاہیوں کی دوڑ دیکھ کر جلدی میں ان کاغذات کو موڑ توڑ کر صدری کے جیب میں رکھ لیا اور صدری مردانہ مکان میں ایک کھونٹی پر لٹکا دی۔

تلاشی دس بجے سے شروع ہوئی اور نہایت سختی کے ساتھ چار بجے تک جاری رہی۔ عورتوں کو ایک کمرہ میں الگ بند کر دیا گیا تھا۔ ہر شخص کی تلاشی لے کر مردانہ مکان میں سے بھی نکال دیا گیا۔ صرف ایک نمبردار صاحب پولیس کے ساتھ رہے تھے ہر ایک چیز کی تلاشی لی گئی۔ کھیل کھلونوں اور عورتوں بچوں کی ڈبیوں تک کو کھول کھول کر دیکھا گیا۔ کپڑوں کے صندوق کی کمبختی آئی۔ اس کا ایک ایک تختہ توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔ مگر جس چیز کی تلاش تھی وہ دستیاب نہ ہوئی کیونکہ یہ صندوق وہ صندوق ہی نہ تھا۔ اور عجیب اتفاق یا حضرت شیخ الہندؒ کی کرامت یہ تھی کہ اس صدری پر کسی کی نظر نہ گئی جو مردانہ مکان میں سب کے سامنے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی تھی اور جس میں وہ خزانہ تھا جس کی جستجو میں پولیس سرگرداں تھی۔

چھ گھنٹہ کی سرگرم تفتیش اور تلاشی کے بعد پولیس کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ موضع بھیتٹری بھی ضلع مظفر نگر میں ہے۔ یہاں جناب حاجی نورالحسن صاحب رہتے تھے جن کے متعلق حضرت شیخ الہندؒ

قدس اللہ سرہ العزیز نے یہ طے فرمادیا تھا کہ وہ ان تحریروں کے فوٹو لے کر اور اس کی کاپیاں کرا کر فلاں فلاں مرکز میں بھیجیں گے۔ پولیس حاجی صاحب کے یہاں بھی پہونچی۔ مگر ناکام واپس ہوئی۔

حاجی احمد مرزا فوٹو گرافر دہلی کے یہاں تلاشی اور ناکامی! سراغ رساں نے پولیس کو صحیح بتایا تھا کہ حاجی احمد مرزا صاحب کے یہاں تحریروں کے فوٹو لئے جائیں گے۔ چنانچہ پولیس نے حاجی صاحب کی دوکان پر چھاپہ مارا مگر اب تک وہ تحریریں حاجی صاحب کے یہاں نہیں پہونچی تھیں حاجی نورالحسن صاحب رحمۃ اللہ اسی وقت ان کو لے جارہے تھے جب حاجی صاحب فوٹو گرافر صاحب کی دوکان کے قریب پہونچے تو دیکھا کہ پولیس دوکان کا محاصرہ کئے ہوئے ہے حاجی صاحب ان تحریروں کو جیب میں ڈالے ہوئے الٹے پاؤں واپس ہوگئے۔

دوسرے وقت حاجی نورالحسن صاحب مرزا صاحب کی دوکان پر پہونچے۔ مرزا صاحب کی ثابت قدمی اور پختگی ملاحظہ کیجئے کہ پولیس ایک دفعہ چھاپہ مار چکی ہے خدشہ اور خطرہ موجود ہے مگر ہر خطرہ سے بے نیاز ہوکر حاجی صاحب نے فوٹو لئے۔ عین اس وقت کہ پلیٹیں پانی میں پڑی ہوئی تھیں اور پانی کا طشت میز کے نیچے رکھا ہوا تھا پولیس پہنچ گئی۔ ساری دوکان چھان ماری ہر ایک البم ٹٹولا مگر اس طشت پر کسی کی نظر نہیں گئی اس کو حضرت شیخ کی کرامت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے بہرحال پولیس یہاں سے بھی ناکام واپس ہوئی۔

حاجی صاحب کا حسب ہدایت کام کرنا فوٹو کی کاپیاں تیار ہوگئیں۔ حاجی نورالحسن صاحب نے ان کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور جہاں جہاں پہونچانیکا حکم تھا پہونچادیا یہ غلط ہے کہ ان تحریرات کو جلادیا گیا جیسا کہ مولانا عبیداللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں وہ اس زمانہ میں کابل میں تھے ان کو غلط خبر پہنچائی گئی یہ تمام فوٹو ذمہ داران مراکز کے پاس پہنچا دیئے گئے تھے مگر چونکہ حکومت کی طرف سے تشدد اور چھان بین بہت زیادہ ہورہی تھی تو ممکن ہے کہ بعض لوگوں نے ان کو جلادیا ہو تاکہ کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔

ان تحریرات کا کارآمد نہ ہونا یہ تحریرات اور وثائق بہت زیادہ کارآمد ہوتے اور حکومت ترکیہ

اور اس کے حلفا پوری طرح امداد کرتے مگر قدرت نے پانسہ ہی پلٹ دیا۔ جرمنی اور ترکی کی فتحمندی اور کامیابی کے بعد جب امریکہ انگریزوں کا حلیف ہوگیا اور مسٹر ولسن کے پر فریب نکات سامنے آئے تو یکایک حالت بدل گئی اور کل کی فتح آج کی شکست بن گئی امریکہ کی بے شمار فوجیں اور لاتعداد ہتھیار جب اتحادیوں (انگریزوں اور فرانس وغیرہ) کی مدد پر آگئے اور ادہر شریف حسین نے غدر اور خیانت کر کے انگریزی کی حمایت میں ترکوں اور ان کی قوت کو ہر قسم کا نقصان پہونچایا عربوں اور ترکوں میں انتہائی نفرت پھیلادی تا آنکہ سوریا، فلسطین، عراق وغیرہ میں عرب کے عوام ترکوں کو قتل و غارت کرتے تھے اور عرب سپاہی ترکی فوج میں سے بھاگنے لگے اور جد وجہد سے جان چرانے لگے تو طبعی طور پر ہر جگہ ناکامی پر ناکامی ہی سامنے آگئی اور جو کچھ نہ ہونا چاہیئے تھا وہ واقع ہوگیا۔ تفصیلات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا کا ملک ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا طائف روانہ ہونا اور محصور ہو جانا

انور پاشا اور جمال پاشا سے جب تحریری دستاویزیں حاصل کرلیں تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا قصد تھا کہ کسی طرح ایران کے راستے بالا بالا یاغستان (یعنی اپنی تحریک کے مرکز پر) پہونچ جائیں مگر روسی اور انگریزی فوجوں نے راستہ روک لیا تھا۔ جنگی محاذ ان راستوں پر قائم ہوگئے تھے۔ اس لئے یہی قصد فرمایا کہ بحری راستہ سے سفر کیا جائے اور بمبئی نہ جایا جائے بلکہ بلوچستان کے کسی بندر (مکران وغیرہ) پر بھیس بدل کر بادبانی جہاز سے پہونچیں اور پھر یاغستان کو وہاں سے روانہ ہو جائیں مگر چونکہ مختلف مصالح سے آخری ملاقات غالب پاشا سے ضروری سمجھتے تھے چند ضروری باتیں ایسی ملاقات میں طے کرنی تھیں اس لئے پہلے مکہ معظمہ اور پھر وہاں سے طائف کے لئے روانہ ہوگئے غالب پاشا ان دنوں طائف میں تھے۔ حضرت نے عام لوگوں سے یہی ظاہر فرمایا کہ مکہ معظمہ میں ان دنوں گرمی زیادہ ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی زیارت بھی کرنی ہے اس لئے میں طائف جارہا ہوں نصف شعبان تک واپس آجاؤں گا چنانچہ ۲۰ رجب کو مکہ معظمہ سے روانہ ہو کر ۲۳ یا ۲۴ رجب کو طائف پہونچے اور دو تین دن کے بعد غالب پاشا سے ملاقات کی۔ کچھ باتیں طے ہوئیں

اور کچھ کے لئے دوسری ملاقات کا وعدہ ہوا۔ یہ وقت آنے نہ پایا تھا کہ شریف حسین نے بغاوت کر دی اور ہم سب طائف میں محصور ہو کر رہ گئے جس کی تفصیل[۵۱] ہم نے سفرنامہ میں لکھ دی ہے ایام حصار میں حضرت ایک مرتبہ غالب پاشا سے پھر ملے پاشا موصوف نے چند اصولی باتیں بتانے کے بعد مجوزیاں ظاہر کیں۔ اور کہا کہ آپ مکہ معظمہ جا کر ہندوستان کو جلد از جلد چلے جائیں اور ہندوستانی رائے عامہ کو آزادی کامل کے مطالبہ پر متفق کریں مجلس صلح میں جو کہ عنقریب منعقد ہونے والی ہے انگریز پوری کوشش کرے گا۔ کہ ہندوستان آزاد نہ ہو یا کم از کم ہندوستانیوں کو زیر سایہ برطانیہ اندرونی آزادی یعنی آدھی آزادی ملے مگر ہندوستانی باشندوں کو چاہیئے کہ بغیر مکمل آزادی کے کسی چیز پر راضی نہ ہوں۔

تقریباً ڈیڑھ مہینہ محصور رہنے کے بعد اہل طائف کے ساتھ ہم کو باہر آ جانے کی سہولت حاصل ہوئی اور ۹ شوال کو ہم وہاں سے نکل کر مکہ معظمہ پہونچے۔ شریف عبداللہ بن شریف حسین باغی کیمپ کا کمانڈر تھا اس نے ایک شب ہماری مہمان داری کر کے صبح کو مکہ معظمہ تک سواری کا انتظام کر دیا۔ ہم دس شوال کو مکہ معظمہ پہونچ گئے۔ چونکہ زمانہ حج کا قریب تھا اس لئے حضرت شیخ الہند کا ارادہ ہوا کہ حج تک یہاں قیام کیا جائے آنے والے حجاج سے اہل وعیال کی خیر وعافیت بھی معلوم ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ کوئی متعارف یا رشتہ دار بھی آ جائے تو اس سے اس کا بھی پتہ چل جائے گا کہ انگریزی پالیسی حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق اور دیگر سیاسیوں کے متعلق کیا ہے اگر نرمی معلوم ہوئی تو بمبئی کے راستہ سے واپس ہوں ورنہ کوئی دوسری صورت اختیار کرنی پڑے گی۔ اتفاقاً قاضی مسعود احمد صاحب آخری جہاز میں اوائل ذی الحجہ میں آ گئے ان سے احوال معلوم ہوئے۔

ڈاکٹر انصاری اور حکیم عبدالرزاق صاحب رحمہما اللہ کی غیر معمولی ہمدردی اور حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز کے ایک عزیز

ڈاکٹر انصاری صاحب اور ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب رحمہما اللہ کو خیال ہوا کہ حجاز شریف میں گرانی زیادہ ہے۔ حضرت شیخ الہند تنہا نہیں ہیں بلکہ آپ کے ساتھ اور رفقا بھی ہیں ویسے بھی حضرت موصوف کا حوصلہ فراخ اور دسترخوان وسیع ہے لہٰذا حضرت کے پاس جو اثاثہ ہوگا وہ ختم ہو گیا ہوگا اب کوئی اور رقم بھیجنی چاہیئے حج کا زمانہ تھا حجاج

۵۱۔ ملاحظہ ہو تتمہ۔

جارہے تھے۔ کسی معتمد حاجی کے ذریعہ رقم بھیجی جاسکتی تھی لیکن ان دونوں رہنماؤں کی غیر معمولی ہمدردی کا فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت کے کسی قریبی عزیز کو جو خانگی حالات سے پوری طرح واقف اور خانگی امور میں بے تکلف ہو۔ بھیجا جائے تاکہ رقم کے ساتھ حضرت کو اپنے متعلقین کے حالات بھی تفصیل سے معلوم ہوجائیں۔ چنانچہ حضرت کے ایک خاص عزیز کو (جن کا نام لینا مناسب نہیں معلوم ہوتا) اس خدمت کے لئے (جو ان کے لئے سراسر سعادت تھی کیونکہ حضرت کی زیارت کے ساتھ حج بیت اللہ کی زیارت کا شرف بھی مفت میں حاصل ہو رہا تھا) نامزد کیا گیا۔ مزید براں تار کے ذریعہ جہاز میں سیٹ بھی متعین کرالی اور روانگی کے لئے ایسا وقت مقرر کیا کہ بمبئی پہونچکر جہاز کا انتظار نہ کرنا پڑے بلکہ فوراً ہی جہاز پر سوار ہوجائیں۔ چنانچہ یہ عزیز دفعۃً دیوبند سے روانہ ہوئے اور بمبئی پہونچتے ہی بندرگاہ پر چلے گئے۔

اس عجلت اور رازداری کا یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ حکومت کو رکاوٹ پیدا کرنے کا موقع نہیں مل سکا یہاں تک کہ عزیز موصوف کی روانگی کا علم بھی حکومت کو اس وقت ہوا جب جہاز روانہ ہوچکا لیکن اس طرح روانگی سے حکومت کو شبہ بھی ہوگیا۔ اس لئے حکومت ہند کی طرف سے عدن تار دیا گیا کہ جہاز پر تلاشی لی جائے اور مشتبہ کاغذات وغیرہ قبضہ میں کرلئے جائیں۔ چنانچہ جب جہاز عدن پہنچا تو پولیس کی جمعیت جہاز پر آئی اور عزیز موصوف کی تلاشی پوری سختی کے ساتھ لی۔ مگر کوئی چیز ایسی برآمد نہ ہوسکی جس پر شبہ کیا جاسکے۔ لہٰذا عزیز موصوف بخیریت جدہ اور پھر مکہ معظمہ پہونچ گئے۔ حضرت کو اہل وعیال کی خیریت معلوم ہوئی تو آپ بہت خوش ہوئے۔ پھر عزیز موصوف اور ان کے رفقا نے جن میں مولانا ولی حسن صاحب حسینپوری بھی تھے بیان کیا کہ گورنمنٹ کی پالیسی حضرت کے بارہ میں بہت سخت ہے جب کوئی جہاز بمبئی پہونچتا ہے تو سی۔ آئی۔ ڈی اور باوردی پولیس کا بڑا دستہ جہاز پر پہونچتا ہے اور ڈھونڈتا ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب کہاں ہیں۔ جب تک اطمینان نہیں ہوجاتا کسی مسافر کو اترنے نہیں دیا جاتا۔ اس لئے کسی طرح مناسب نہیں کہ حضرت اس زمانہ میں بمبئی پہونچیں یا ہندوستان تشریف لے جائیں۔

عزیز موصوف نے ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کا بھیجا ہوا ایک ہزار روپیہ پیش کردیا۔

مولانا محمد ابراہیم صاحب کا راندیر سے ایک ہزار روپیہ بھیجنا!

مذکورہ بالا رقم کے علاوہ ایک ہزار روپیہ مولانا محمد ابراہیم صاحب اور راندیر کے احباب نے تاجروں کے ذریعہ بھیجے تھے جو انھیں ایام میں پہونچے تھے ان دونوں رقموں کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ عبد الجبار صاحب دہلوی کے یہاں بطور امانت جمع کرا دیا چنانچہ مالٹہ میں ضرورت پڑنے پر رقم منگوائی گئی۔ اور کام آئی فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

عزیز موصوف کی واپسی

اس وقت تک مدینہ منورہ پر ترکوں کا قبضہ تھا اور ہر قسم کی کوششوں کے باوجود شریف حسین کی اور انگریزوں کی فوجیں کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔ جنگ جاری تھی اور حجاج کی آمد و رفت کے راستے مسدود تھے۔ لہذا عزیز موصوف مدینہ طیبہ نہیں جا سکے اور حج سے فراغت کے بعد پہلے ہی جہاز سے آپ کو واپس ہونا پڑا اس قدر عجلت سے واپسی ایک اور سبب تھا جس سے انگریزی حکومت کے شبہات میں اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ جب واپسی کے لیے عزیز موصوف جہاز پر سوار ہوئے تو بہاء الدین محافظ حجاج اور سی۔ آئی ڈی انسپکٹر نے بڑی سختی سے آپ کی تلاشی لی اور ہر ایک چیز چھان ماری مگر کوئی مشتبہ چیز برآمد نہیں ہوئی۔ جہاز بمبئی پہنچا تو پھر ان کی تلاشی لی گئی اور ان کو حراست میں لے کر الہ آباد پہنچا دیا گیا۔

افشاء راز

یہ محترم عزیز حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز سے جو رشتہ رکھتے تھے اس کا تقاضا تھا کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ تحریک ہی کے کام سے پوری رازداری کے ساتھ ایک کارکن کی حیثیت سے اتنا طویل سفر کر کے آپ حجاز شریف پہونچے تھے اس کے علاوہ چونکہ مولانا ہادی حسن صاحب جو مذکورہ بالا "تاریخی صندوق" لے کر آئے تھے جہاز سے اترتے ہی گرفتار کر کے نینی تال میں نظر بند کر دئیے گئے تھے۔ لہذا تشویش اور بے چینی تھی کہ جس مقصد کے لئے اتنی کوشش کی گئی۔ اتنی مصیبتیں جھیلی گئیں اور جس راز کو اس طرح مخفی کیا گیا۔ یہ سب کچھ بے نتیجہ رہے گا بلکہ ممکن ہے اس کے اثرات تباہ کن ثابت ہوں۔ اس بنا پر حضرت شیخ الہند نے عزیز موصوف کو صندوق کا راز بھی بتا دیا اور یہ بھی فرما دیا کہ ان تحریروں کے فوٹو لے کر فلاں فلاں

مقام پر فلاں فلاں صاحب کے پاس بھجوا دیئے جائیں۔

دوسری طرف عجیب وغریب قصہ یہ تھا کہ عزیز موصوف کمزور دل ناتجربہ کار اور نو گرفتار تھے اور سی۔آئی۔ڈی کے وہ افسر[1] جنھوں نے الہ آباد میں ان سے گفتگو کی وہ پولیس کے کہنہ مشق شاطر اپنے فن کے بہترین ماہر تھے۔ ان افسروں نے ڈرا دھمکا کر پولیس کی تمام جابرانہ کاروائیاں عمل میں لا کر اور متعدد اوقات میں طرح طرح جرح کر کے وہ تمام باتیں معلوم کر لیں جو عزیز موصوف کے حافظہ میں تھیں ان میں کچھ ایسی باتیں بھی تھیں کہ اگر ثابت ہو جائیں تو نہ معلوم کتنوں کو جام شہادت نوش کرنا پڑتا اور کتنے عبور دریا شور اور حبس دوام کی سزا پاتے۔ صندوق کا قصہ بھی انھیں کے ذریعہ معلوم ہوا گویا سی۔آئی۔ڈی کو دولت کا خزانہ مل گیا۔ فوراً مظفر نگر پولیس کو تار دیا گیا اور مظفر نگر سے دوشس خاں جہاں پور پہونچی اور مولانا ہادی حسن صاحب کے مکان کی تلاشی لی گئی۔ پھر حاجی نور الحسن صاحب اور حاجی احمد مرزا فوٹو گرافر کی تلاشی بھی اسی انکشاف کا نتیجہ تھا جس کا ذکر پہلے صفحات میں گذر چکا ہے

حج کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کا مکہ میں قیام اور گرفتاری

حضرت شیخ الہندؒ نے اس سفر میں پہلا حج ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ میں کیا تھا پھر دوسرا حج طائف سے واپسی پر ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ میں کیا قاضی مسعود احمد صاحب اور دوسرے واقف حضرات کے روانہ ہو جانے کے بعد حضرت کو فکر ہوئی کہ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو کر یاغستان پہونچنے کی کوئی تدبیر ہونی چاہیئے حضرتؒ نے بار بار فرمایا کہ مکہ معظمہ میں ہمارا قیام کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ انگریزی حکومت ہم سے بدظن ہی نہیں بلکہ برہم اور مخالف ہے اور شریف حسین انگریزی حکومت کے آلہ کار ہیں لہذا کسی بہتری کی توقع عبث ہے اس لئے جلد از جلد کوئی صورت ہونی چاہیئے کہ یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ لیکن اگر تنہا حضرت کی ذات مبارک ہوتی تو معاملہ آسان تھا مگر یہاں تو صورت یہ تھی کہ حضرت کے ساتھ چند رفقاء تھے جو اپنا سب کچھ قربان کر کے حضرت کے ساتھ ہوئے تھے وہ حضرت کو کسی حال چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے اور نہ حضرت ان کی جدائی پسند کرتے تھے چونکہ ترجمہ قرآن شریف کا سلسلہ جاری تھا۔ لہذا کتابوں کا بھی ایک ذخیرہ ساتھ رہتا تھا سردی اور گرمی کے کپڑوں کے علاوہ

ضعیف العمری

[1] یعنی (۱) مشیر حسین (۲) تصدق حسین ... (۳) مظہر ... حضرت شیخ الہند ... تحریک آزادی

اور امراض کی بنا پر دوائیں بھی ساتھ رہتی تھیں اس قسم کی اور ضروریات بھی تھیں۔ ان سب کے حمل ونقل کے لیے چند سواریاں درکار تھیں اور خاموشی سے دفعتہً روانہ ہو جانا مشکل تھا تاہم جب حضرت کا تقاضا شدید ہوا تو ایسا انتظام کیا گیا کہ خفیہ طور سے یہاں سے روانگی ہو جائے۔ چنانچہ ہم دو چار روز بعد روانہ ہونے والے تھے تدبیر کے راستہ میں تقدیر حائل ہو گئی جس کی تفصیل یہ ہے کہ

محرم ۱۳۳۵ھ کی اخیر تاریخوں میں شیخ الاسلام مکہ معظمہ عبداللہ سراج کی طرف سے نقیب علماء مکہ عصر کے بعد آیا اور کہا کہ مجھ کو شیخ الاسلام نے بھیجا ہے اور حضرت شیخ الہند سے اس محضر کی تصدیق طلب کی ہے مولانا کے اس پر دستخط کرا دو اس کو دیکھا گیا تو عنوان یہ تھا "من علماء مکۃ المکرمۃ المدرسین بالحرم الشریف المکی" (مکہ مکرمہ کے علماء کی جانب سے جو مکہ کے حرم شریف میں درس دیتے ہیں) اور اس میں تمام ترکوں کی تکفیر اس بناء پر کی گئی تھی کہ انھوں نے سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کو معزول کیا ہے شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب اور مستحسن قرار دیا گیا تھا اور ترکوں کی خلافت کا انکار تھا وغیرہ وغیرہ حضرت نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ چونکہ یہ محضر ان علماء مکہ مکرمہ کی طرف سے ہے جو کہ حرم مکی میں پڑھاتے ہیں اور میں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور حرم مکی میں مدرس بھی نہیں ہوں اس لئے مجھ کو کسی طرح اس پر دستخط کرنا درست نہیں ہے وہ واپس چلا گیا۔ حاضرین میں سے بعض احباب نے کہا کہ اس کا نتیجہ خطرناک ہے حضرت نے جواب دیا کہ پھر کیا کیا جائے نہ عنوان اجازت دیتا ہے نہ مضمون۔ مضمون میں جو باتیں ذکر کی گئی ہیں وہ سراسر خلاف شریعت ہیں۔ اس کے بعد سنا گیا کہ شیخ الاسلام عبداللہ سراج بہت برہم ہوئے خطرہ تھا کہ وہ لوٹ کر آئے گا اور کچھ جواب دے گا۔ دو چار دن کے بعد شریف حسین خود جدہ گیا اور وہاں سے حکم بھیجا کہ فوراً مولانا محمود حسن اور ان کے رفقاء اور سید ہاشم اور حکیم نصرت حسین کو گرفتار کر کے بھیجو۔ اس پر بہت تشویش ہوئی اور مختلف طریقوں سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا گیا مگر کچھ نفع نہیں ہوا۔ اس کی پوری تفصیل سفر نامہ میں صفحہ ۳۳ سے اخیر تک صحیح طور پر ذکر کر دی گئی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو تتمہ)

خلاصہ یہ ہے کہ ہم سب گرفتار کرکے جدہ بھیجے گئے ۲۴ صفر ۱۳۳۵ھ کو بوقت صبح زیر حراست جدہ پہونچے اور تقریباً ایک مہینہ زیر حراست رکھے گئے پھر ۱۰ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو خدیوی جہاز سے اسی طرح زیر حراست سویز بھیجے گئے۔ ۲۲ ربیع الاول کو سویز پہونچے وہاں سے گوروں کی حراست میں (جو کہ پندرہ یا سولہ تھے اور بندوق اور سنگینوں سے مسلح تھے) ہم کو قاہرہ ریل میں بھیجا گیا اور اسی دن عصر کے بعد ہم کو جیزہ کے سیاسی جیل (معتقل) میں داخل کردیا گیا اور اگلے دن سے بیانات لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیان لینے والا شخص انگریز تھا اردو نہایت سلیس اور صاف بولتا تھا اس کے پاس بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور فائل تھے۔ جن میں سی آئی ڈی کے بیانات اور رپورٹیں مندرج تھیں۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ ہماری گرفتاری فقط شریف کے محضر پر دستخط نہ کرنے اور شریف کی شکایت کی وجہ سے ہوئی ہے مگر بعد میں بیانات لینے اور سوالات کرنے اور بار بار اس کے ان کتابوں کے دیکھنے اور حوالہ دینے سے ظاہر ہوا کہ یہ گرفتاری تحریک آزادی کی ان جملہ کارروائیوں کی بنا پر ہوئی ہے جو کہ یاغستان کابل، فرنٹیر اور دیوبند وغیرہ میں مدتوں سے ہوتی رہی ہیں اور جن کی مخبری اپنوں اور پرایوں دونوں نے کی ہے بہت سی ایسی باتیں بھی پوچھی گئی ہیں جن کے متعلق یقین تھا کہ کسی کو اطلاع نہیں ہے حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق اس کے پاس رجسٹر بہت بڑا تھا۔ بہرحال ہر شخص نے جوابات حسب اقتضاء وقت اپنی سمجھ کے مطابق دئے۔ اگرچہ ہم میں سے سب کے سب ایسے ہی تھے کہ جن کو ایسے امور کا سابقہ اس سے پہلے نہیں پڑا تھا اور بوجہ اس خیال کے کہ یہاں مصر میں ہندوستان کے واقعات اور وہاں کی کارروائیوں کا جاننے والا کوئی نہ ہوگا ہم نے آپس میں کوئی قرارداد بھی طے نہیں کی تھی مگر اظہار اور جوابات سب کے تقریباً ایک ہی جیسے رہے۔ اگرچہ علیحدہ علیحدہ ہوئے۔ جیزہ کے جیل (معتقل) میں تقریباً ایک مہینہ رکھنے اور بیانات لینے کے بعد پاسپورٹ مرتب کیا گیا اور ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۹۱۷ء ہم کو مالٹہ روانہ کردیا گیا۔ گوروں کی پوری گارد سنگینوں سے مسلح ہماری حراست کرتی تھی اسی روز شام کو مالٹہ جانے والے جہاز پر سوار کئے گئے اور ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ میں مالٹہ پہونچ گئے۔

۲ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو تقریباً ۳ برس دو مہینہ مالٹہ میں رہ کر ہم مالٹہ سے روانہ ہوئے روانگی

کے وقت رخصت کرنے کے لئے تمام ترکی افیسر (جوکہ اس وقت تک رہا نہیں ہوتے) صدر اعظم ترکی سے لے کر نیچے کے عہدوں تک سب کے سب خود جمع ہوگئے اور بہت زیادہ محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے رہے۔ شیخ الاسلام خیرالدین افندی نے خاص طور سے ہاتھ اٹھا کر آواز سے دعا مانگنی شروع کی اور تمام افیسروں نے ان کی موافقت کی آمین آمین کی آوازسے فضا گونج رہی تھی پھر سب نے نہایت تپاک سے آبدیدہ ہوکر رخصت کیا یہ مجمع اور سماں نہایت عجیب وغریب تھا بہت سے دنیاوی وجاہت اور دولت والے مالٹہ سے اس سے پہلے روانہ ہوئے مگر ایسا بڑا مجمع اور اتنے بڑے رتبہ والوں کا اجتماع اور اتنی محبت اور اخلاص کا مظاہرہ اور اس ہیئت دعائیہ اور آمین کا اظہار کسی کے لئے نہیں ہوا تھا۔ انگریزی افیسر بہت سے وہاں موجود تھے اس حالت کو دیکھ کر نہایت تعجب کرتے تھے مگر یہ عزت حقانی تھی جس میں نفسانیت کا کوئی شائبہ نہ تھا وہ شخص جس نے قول وعمل میں کبھی اپنی بڑائی کا مظاہرہ نہ کیا ہو، جس کو اہل دولت اور اصحاب مناصب کے اختلاط سے وحشت ہو، جس کو تکلف سوری اور طلب وجاہت دنیاوی سے نفرت ہو جس کی چال ڈھال بیٹھنا اٹھنا، رفتار وگفتار وغیرہ سب سے مسکنت اور تواضع ٹپکتی ہو اس کی یہ عزت اور تمکنت، خلق خداوندی میں عام قبولیت، اس کے انتہائی تقوی اور للّٰہیت اور بارگاہ خداوندی میں بلند پایگی کا اثر نہ تھا تو کس چیز کا تھا ع قبولیت اسے کہتے ہیں مقبول ایسے ہوتے ہیں ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
گر نہ بخشد خدائے بخشندہ

رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ وامدّنا بامدادہ فی الدنیا والآخرۃ آمین

۲۵ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۵ مارچ ۱۹۲۰ء آگبوٹ اسکندریہ پہونچا اور ۲۶ جمادی الثانی سیدی بشر میں جو کہ قرارگاہ اسرائے مصر میں تھا داخل کردئے گئے۔ تقریباً اٹھارہ روز وہاں قیام کرنے کے بعد ۱۳ رجب ۱۳۳۸ھ کو مطابق ۲ اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے سویس کو روانہ کئے گئے سویس میں بھی ہم سنگیوں کے پہرہ میں اسیروں کے کیمپ میں مثل سیدی بشر داخل کئے گئے۔ یہاں پونے دو مہینہ کیمپ

میں دہنا پڑا۔ ۵ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۲ مئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن آگبوٹ پر پہونچایا گیا ۱۲ رمضان ۱۳۳۸ھ کو جہاز عدن پہونچا۔ چونکہ عدن میں جہاز ایک دن ٹھہرا تھا تو ہم کنارہ پر گئے اور تین تار ہندوستان کو ایک حضرت حکیم محمد حسن صاحب کو دیوبند میں دوسرا ڈاکٹر انصاری کو دہلی میں تیسرا حکیم اجمیری کو بمبئی میں ہم نے دیدیا جس سے تمام احباب کو اطلاع ہوگئی تار کے الفاظ حسب ذیل تھے "ہم لوگ ۸ جون تک بمبئی پہونچیں گے" مختصر یہ کہ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ۸ جون ۱۹۲۰ء کو ۳ برس، ۷ مہینے کے بعد بمبئی پہونچاکر ہم کو رہا کیا گیا۔

بمبئی پہونچنے اور خلافت کمیٹی کے استقبال کرنے کی کیفیت

بمبئی پہونچنے پر سب سے پہلے سی آئی ڈی کا افسر انگریز مع دو تین ہندوستانی افسروں کے آیا اور حضرت شیخ الہندؒ سے کہا کہ میں تنہائی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ حضرت اس کے ساتھ کمرہ میں چلے گئے اس نے کہا "مولوی رحیم بخش صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں آپ بغیر ان کے ملے ہوئے ہرگز جہاز سے نہ اتریں" یہ کہہ کر وہ چلا گیا ہم کو جہاز پر ہی یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اب ہم بالکل آزاد ہیں ہم نے مولوی رحیم بخش صاحب کا بہت انتظار کیا جب وہ پہونچے تو میں اور مولانا عزیر گل صاحب اسباب لے کر کنارہ پر چلے گئے۔ بعد کو مولوی رحیم بخش صاحب آئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ کے لئے اسپشل ڈبہ ریل میں میں ریزرو کرادوں گا آپ ابھی اتریں اور ریل پر چلے چلیں حضرت نے فرمایا کہ آپ کا انتظار کرکے حسین احمد اور مولوی عزیر گل کنارہ پر چلے گئے ہیں وہ آجائیں تو روانگی ہوسکے گی۔ چونکہ ہمارے کنارہ پہونچنے پر زور کی بارش ہوگئی اور دریا میں طوفان آگیا جہاز دریا میں کنارہ سے دور لنگر انداز ہوا تھا اس لئے اس روز کوئی ہوڑی حضرت شیخ الہندؒ کو جہاز سے لانے کے لئے نہ جا سکی اگلے روز ۲۱ رمضان کو حضرت اتر سکے۔ مولوی رحیم بخش صاحب گورنمنٹ کے بھیجے ہوئے آئے تھے مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ تحریک خلافت میں شریک نہ ہوں اور بالا بالا ریل پر سوار ہوکر دیوبند چلے جائیں۔ سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہوجائیں اسی لئے وہ اگلے دن اتارنے کے لئے اسٹیمر پر پہونچے مگر جب لیچ کنارہ پر پہنچی تو مولانا شوکت علی مرحوم اور ہزاروں اشخاص

ممبران خلافت کمیٹی نے زور دار استقبال کیا۔ نعرہ ہائے تکبیر سے فضا کو گونجا دیا اور حضرت کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور کار میں سوار کر کے اپنے قیام گاہ پر جس کو پہلے سے تجویز کر چکے تے لے گئے مولوی رحیم بخش صاحب ہجوم کی شدت کی وجہ سے حضرت کے پاس بھی نہیں پہونچ سکے۔ چونکہ خلافت کی تحریک اور اس کے جملہ کارکن حضرت کے مذاق آزادی ہند اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے ہم نوا تھے اس لئے بالطبع ان سے رل مل گئے مولوی رحیم بخش صاحب مرحوم کا کوئی اثر قبول نہیں کیا

جلسہ عام اور سپاسنامہ مسلمانان بمبئی کی طرف سے خلافت کمیٹی کے زیر انتظام کھتری مسجد میں جلسہ عام کیا گیا اس جلسہ میں خلافت کمیٹی اور اہل شہر کی طرف سے حضرت کی خدمت میں "ایڈریس" پیش کیا گیا۔

دہلی۔ لکھنؤ دیوبند وغیرہ سے استقبال کے لئے آنیوالے حضرات ان حضرات کی فہرست جنھوں نے دور دراز سے بمبئی پہونچکر پورٹ پر حضرت کا استقبال کیا بہت طویل ہے۔ خاص خاص اسماء گرامی یہ ہیں۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب (مرحوم) مہتمم دارالعلوم دیوبند معہ صاحبزادگان مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری (مرحوم) جناب حکیم محمد حسن صاحب (مرحوم) (برادر خورد حضرت شیخ الہندؒ) مولانا محمد حنیف صاحب (مرحوم) (خواہرزادہ و داماد حضرت شیخ الہندؒ) حکیم عبدالرزاق صاحب غازی پوری برادر کلاں ڈاکٹر انصاری مرحوم۔ نواب محی الدین خاں صاحب مرادآبادی قاضی بھوپال (مرحوم) مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب (مرحوم) مہتمم و صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی ڈاکٹر مختار احمد صاحب عرف ڈاکٹر انصاری مرحوم۔ حاجی احمد مرزا صاحب فوٹو گرافر دہلی مرحوم

مولانا عبدالباری صاحب مرحوم فرنگی محلی اور مہاتما گاندھی بمبئی کے دو روزہ قیام میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم بھی قیام گاہ پر تشریف لائے اور تنہائی میں سیاسیات حاضرہ پر بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے اسی اثنا میں مہاتما گاندھی بھی تشریف لائے اور حضرت سے گفتگو کی۔

دہلی کو روانگی بمبئی میں دو روز قیام فرما کر ۲۳ اور ۲۴ رمضان المبارک کی درمیانی شب میں اکسپریس سے دہلی روانہ ہوئے اور ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ (۱۳ جون ۱۹۲۰ء) کی صبح کو دہلی پہونچے ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا شب کے آخر حصہ میں دہلی سے روانہ ہوکر ۲۶ رمضان المبارک کی صبح کو ۹ بجے دیوبند پہونچ گئے فللہ الحمد والمنة

حضرت شیخ الہندؒ کی عام مقبولیت اور راستہ میں اسٹیشنوں پر استقبال ایک وہ زمانہ تھا کہ نہ صرف احباب بلکہ تلامذہ۔ مریدین اور عزیز و اقارب کو یقین تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کو پھانسی دی جائے گی ورنہ کم از کم حبس دوام اور عبور دریا شور کی سزا پائیں گے۔ اس لئے مریدوں اور شاگردوں تک نے نہ صرف تعلق ارادت اور شاگردی سے انکار کر دیا تھا بلکہ تعارف سے بھی منکر ہو گئے تھے۔ خاص خاص لوگ نہ صرف مکان پر آتے ہوئے گھبراتے تھے بلکہ اس محلہ اور کوچہ میں بھی نہیں گذرتے تھے۔ جہاں حضرت کا دولت خانہ تھا اور حضرت کے لئے تحقیر و ملامت کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ بعض مدعیان اخلاص نوجوان دعوت کے خطرہ سے انگریزوں کے سی۔ آئی ڈی اور مخبر بن گئے تھے۔ اب یہ زمانہ بھی ان کے سامنے آگیا کہ ہندوستان اور بیرون ہند جہاں بھی حضرت شیخ پہونچے لوگ سروں پر بٹھاتے ہر ایک اسٹیشن پر عقیدت مند مخلصین کا ہجوم پروانوں کی طرح ٹوٹا پڑتا تھا۔ حضرت شیخ الہند تک پہونچنا اور آپ سے مصافحہ کرنا۔ جوئے شیر سے کم دشوار نہ تھا۔ دہلی۔ غازی آباد۔ میرٹھ شہر۔ میرٹھ چھاؤنی۔ مظفر نگر۔ دیوبند وغیرہ میں یہ حالت تھی کہ باہر لے جانے یا عوام کو زیارت کرانے کے لئے لوگوں کو سروں پر اٹھانا پڑا۔ لوگ اس مقبولیت کو دیکھتے تھے اور انگشت بدنداں تھے کہ کیا سے کیا ہو گیا۔

ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء یعز من یشاء ویذل من یشاء

انہ علیٰ کل شیٔ قدیر

رولٹ رپورٹ کے الفاظ اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ رولٹ کمشن کے الفاظ بھی ناظرین کے سامنے پیش کر دیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ دشمن جو اپنی سطوت

طاقت کے نشہ میں بدمست ہو کر کہتا تھا کہ میں سمندروں کا خدا ہوں ۔ میری حدود مملکت میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا۔ مجھ پر اگر آسمان ٹوٹ پڑے تو میں سنگینوں پر اٹھا لوں گا۔ اس مغرور اور جابر طاقت نے اس تحریک سے کیا اثر لیا۔ اس کی نظر میں اس تحریک کی کیا حیثیت تھی اس کی بنیادیں کتنی مضبوط تھیں اور کس طرح کامیابی کے کنارہ تک پہونچ گئی تھی اس کے نتائج کیا ہوئے اور اس تحریک نے دیس کی کیا کیا خدمتیں انجام دیں اور اس کے کارکنوں نے کس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر کام کیا الفضل ماشهدت به الاعداء

رولٹ کمیٹی رپورٹ کے پیرا ۱۷۴ میں درج ہے ۔ اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا اور حکومت کو اس سازش کا پتہ چلا یہ ایک منصوبہ تھا جو ہندوستان میں اس خیال سے تجویز کیا گیا تھا کہ ایک طرف شمال مغربی سرحدات پر گڑبڑ پیدا کرے اور دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کی شورش[۱] سے اسے تقویت دے کر برطانوی راج ختم کر دیا جائے۔

اس منصوبہ کو مضبوط کرنے اور عمل میں لانے کے لئے مولوی عبیداللہ نامی ایک شخص نے اپنے تین ساتھیوں عبداللہ، فتح محمد اور محمد علی کے ساتھ اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو پار کیا۔ عبیداللہ پہلے سکھ تھا بعد میں مسلمان ہوا اور دیو بند ضلع سہارن پور کے مذہبی مدرسہ میں تعلیم حاصل کر کے مولوی بنا۔ وہاں اس نے اپنے باغیانہ اور برطانیہ کے خلاف خیالات کا زہر چند مدرسین اور طلبہ میں بھی پھیلا دیا

---

[۱] اگر فقط مسلمانوں کے لئے یہ منصوبہ ہوتا تو راجہ مہندر پرتاپ کو صدارت کیوں دیجاتی اور حکومت موقتہ میں غیر مسلم کیلئے ایسی جگہ کیوں تجویز کی جاتی جیسا کہ آئندہ آئیگا (۲) اگر صرف مسلمانوں کیلئے یہ منصوبہ تھا تو ہردیال کی کوششیں اور مولانا برکت اللہ کی عانتیں کیا گواہی دیتی ہیں دیکھو رولٹ رپورٹ فصل پنجاب (۳) جبکہ مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بنانا تھا جیسا کہ آگے آئیگا اور وہ کرتنار سنگھ کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا جیسی راجچندر جیسا معروف و مشہور ممبر بھی تھا تو اسمیں فقط مسلمانوں کی شورش کیوں ذکر کی گئی بلکہ یہ ایک ہندوستانیوں کی آزادی کی تحریک تھی جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک تھے البتہ مسلم عنصر غالب تھا جیسا کہ ہم نے ممبروں کے شمارہ میں دکھلایا ہے اور یہی مولانا عبیداللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھ رہے ہیں۔

جن لوگوں پر اس نے اپنا اثر ڈالا ان میں سب سے بڑی شخصیت مولانا محمود حسن کی تھی جو مدتوں تک درسگاہ دیوبند کے صدر مدرس رہے[۵۱]۔ عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور و معروف فارغ التحصیل مولویوں کے ذریعہ ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف ایک عالمگیر اسلامی (پان اسلامک) تحریک چلائے[۵۲]

---

[۵۱] یہ بالکل برعکس معاملہ ذکر کیا گیا ہے مولانا عبید اللہ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو متاثر نہیں کیا بلکہ مولانا شیخ الہند انگریزوں کے مظالم شنیعہ اور مسلسل بے راہیوں واقعات ماضیہ اور حالات حالیہ سے متاثر ہوئے اور انھوں نے مولانا عبید اللہ صاحب کو اس طرف کھینچا جیسا کہ ہم نے حضرت شیخ الہندؒ کے اس مقولہ کو پہلے بھی نقل کیا ہے اور مولانا عبید اللہ صاحب نے بھی اپنی ڈائری میں بار بار اس کو ذکر کیا ہے یہ بات محض اصحاب غرض نے گورنمنٹ کو سجھائی تھی کہ مولانا عبید اللہ نے حضرت کو متاثر کیا ہے یہ تو کہہ نہیں سکتے تھے کہ تمہارے سابقہ اور لاحقہ طرابلس اور بلقان کے معاملات اور ہندوستان کے مظالم اس کے باعث ہوئے ہیں بیچارے مولوی عبید اللہ کو ہدف ملامت بناتے رہے۔

[۵۲] یہ بھی بالکل غلط اور افترا ہے ہندوں کو اس تحریک سے بھڑکانے کے لئے ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ ہمیشہ سے انگریزوں کی عادت رہی ہے مولانا عبید اللہ صاحب اس تحریک سے بہت پہلے ہی اعتقاد جمائے ہوئے تھے کہ ہندوستان کی آزادی اور بہتری اسی میں ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو وہ اپنی ڈائری ص۸ میں لکھتے ہیں "میری طالب علمی کا پہلا زمانہ تو ایسا ہے کہ اس وقت میں سوائے اسلام اور مسلمانوں کے اور کسی چیز کی ہستی نہیں مانتا تھا لیکن مطالعہ پختہ ہوا تو مجھے ہندوستانیت اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال اور اس کی ضرورت زور سے محسوس ہونے لگی ہاں عملی حصہ لینے کے لئے مجھے اس زمانہ میں کوئی موقعہ نہیں ملا اس کے بعد جب مسلمانوں کی مرکزی جماعتوں سے میرا تعارف ہوا تو میں نے مناسب طور پر اپنے بزرگوں اور دوستوں کو اس طرف توجہ دلانی شروع کی اور میری مسرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے امید سے زیادہ کامیابی نظر آئی" (ذاتی ڈائری صفحہ ۸۸) اور یہی مطمح نظر اور مشورہ حضرت شیخ الہندؒ کا مولانا عبید اللہ صاحب کے لئے نشان راہ تھا چنانچہ امیر حبیب اللہ خاں سے ملاقات کے باب میں صفحہ ۱۸ پر لکھتے ہیں " مجھے یہاں صراحت اعتراف کی ضرورت ہے کہ اگر شیخ مغفور کا صحیح مشورہ مجھے نہ ملتا تو میری بات اس قدر مؤثر نہ ہوتی اور میں اپنے آپ کو بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے دربار میں پیش نہ کرتا بلکہ ایک مسلم کی صورت میں متعارف ہوتا اور چند دنوں بعد مجھے مسلک ہندوستانیت نعا[illegible]

مگر مہتمم اور ارباب شوریٰ نے اسکو اور اسکے چند وابستگان کو نکال کر اس تجویز کو درمیان میں ہی ختم کر دیا۔[۱] مولانا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۹) بنانے کی یقیناً ضرورت پیش آتی" ذاتی ڈائری ص۸۲ امیر حبیب اللہ خاں سے بھی یہی مشورہ مولانا عبید اللہ صاحب کو دیا تھا۔ چنانچہ ڈائری کے صفحہ ۲۱ میں لکھتے ہیں "میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا سنہ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا اس کی تعمیل میرے لئے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے سنہ ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خاں کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ برٹش امپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس پر فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریذیڈنٹ ہوں۔" (ذاتی ڈائری ص۲۲) خیال فرمایئے کہ رولٹ کمیٹی اس تحریک کو پان اسلامک تحریک کہتی ہے اور تحریک چلانے والا اس کو ہندوستانی تحریک کہتا ہے اور اسی نام کو اپنی تحریک کے لئے موثر قرار دیتا ہے یہی اس کا عقیدہ اس سے پہلے کا ہے اور پان اسلامک اور اتحاد اسلامی تحریک کو امیر کابل کی ناپسندیدہ تحریک قرار دیتا ہے اور اسی کو حضرت شیخ الہندؒ کا مشورہ قرار دیتا ہے مگر رولٹ کمیٹی افتراق پھیلانے کیلئے اس کو پان اسلامک کہتی ہے۔ ہم پہلے بارہا عرض کر چکے ہیں کہ غالب پاشا گورنر حجاز نے بھی زور دیا تھا کہ تمام ہندوستانیوں کو متحد کیا جائے یعنی ہندو مسلمان سکھ پارسی وغیرہ ہندوستانیوں کے اتحاد سے آزادی کی اسکیم چلائی جائے پان اسلامک میں یہ کہاں ہو سکتا ہے حضرت شیخ الہندؒ نے نہ صرف اس کو قبول فرمایا تھا بلکہ پہلے سے اس پر عامل تھے ان کے مشن میں سکھ اور انقلابی ہندو شریک تھے جن کی وجہ سے ایک مستقل مکان دیوبند میں کرایہ پر لے رکھا تھا۔ رولٹ کمیٹی کی یہ رپورٹ جھوٹ اور افترا نہیں ہے تو کیا ہے۔ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ حضرت سید احمد صاحب شہید کی تحریک سنہ ۱۲۴۳ھ اور جہاد حریت سنہ ۱۸۵۷ء میں بھی ہندو مسلم اتحاد کام کر رہا تھا۔

[۱] یہ غلط ہے کہ یہ تجویز آزادی ہند اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی اس وجہ سے ختم ہوئی یہ تجویز اسوقت تک ظاہری نہیں ہوئی تھی بلکہ بعض مسائل دینیہ مختلفہ فیہا کو درمیان میں رکھا گیا اور مولانا سندھی دو طلبہ پایہ معاصرین کو بدظن کر کے تضلیل و تکفیر پر آمادہ کیا گیا اور اسی اختلاف کی بنیاد پر مولانا سندھی رحمۃ اللہ کو دارالعلوم دیوبند سے الگ کیا گیا ان میں سے ایک بزرگ کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا چنانچہ آپ نے مولانا سندھی سے معافی مانگی بہرحال اصلی سبب وہ امر ہے جسکی بنا پر مسٹن گورنر یو پی دیوبند اور دارالعلوم میں گیا تھا اور مہتمم صاحب کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا۔

محمود حسن ہر حال میں دیوبند میں ہی رہے اور عبید اللہ سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں مولانا کے مکان پر خفیہ مجالس قایم ہوتیں اور کہا جاتا ہے کہ سرحد کے کچھ آدمی بھی ان میں شریک ہوا کرتے ۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو مولانا محمود حسن نے میاں محمد ایک شخص اور دوسرے دوستوں کے ساتھ مولوی عبید اللہ کی پیروی کی اور ہندوستان چھوڑ دیا مگر یہ لوگ شمال کا رخ کرنے کے بجائے عرب کے خطہ حجاز میں پہونچ گئے ۔ روانہ ہونے سے پیشتر عبید اللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور دو کتابیں شائع کی تھیں ۔ جن میں اس نے باغیانہ تعصب کی تبلیغ کر کے ہندوستانی مسلمانوں کو فریضہ جہاد سے متاثر کرنا چاہا تھا ۔ اس شخص (مولانا عبید اللہ) اور اس کے دوسرے دوستوں اور مولانا (شیخ الہند) کا اہم مقصد یہ تھا کہ بہ یک وقت ہندوستان پر باہر سے حملہ بھی کرایا جائے اور ہندوستانی مسلمانوں میں بغاوت بھی پھیلائی جائے ۔ ہم اس جد وجہد کی تفصیل تبلاتے ہیں جو وہ اپنے مقصد کو کامیاب بنانے کے لئے عمل میں لائے ۔

عبید اللہ اور اس کے دوستوں نے پہلے ہندوستانی متعصب جماعت (مجاہدین) سے ملاقات کی اور بعد میں کابل پہونچے ۔ وہاں عبید اللہ کی ملاقات ترکی جرمنی مشن سے ہوئی اور ان کے ساتھ اس نے بھائی چارہ قائم کیا ۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کا دیوبندی دوست محمد میاں بھی اس سے جا ملا یہ شخص مولانا محمود حسن صاحب کے ساتھ عرب گیا تھا اور وہاں سے ۱۹۱۶ء میں جہاد کا ایک اعلان حاصل کر کے واپس آیا تھا ۔ جو مولانا نے حجاز کے ترکی سپہ سالار غالب پاشا سے وصول کیا تھا یہ دستاویز غالب نامہ کے نام سے مشہور ہے ۔ محمد میاں نے اس کی کاپیاں راستہ میں ہندوستان اور سرحدی قبائل دونوں جگہ تقسیم کیں ۔ مولوی عبید اللہ اور اس کے رفیق ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمہ پر موقتہ حکومت کے لئے ایک تجویز تیار کی تھی ۔ اس تجویز کے مطابق مہندر پرتاب نامی ایک شخص کو صدر ہونا تھا یہ شخص ایک معزز خاندان کا جوشیلا ہندو ہے ۱۹۱۴ء کے اخیر میں اسے اٹلی سویزرلینڈ اور فرانس جانے کا پاسپورٹ دیا گیا یہ سیدھا جنیوا گیا اور وہاں سے بدنام زمانہ ہردیال سے ملا ۔ ہردیال نے اسے جرمن قونصل سے ملایا ۔ وہاں سے یہ برلن آیا ۔ بظاہر اس نے وہاں جرمنوں کو اپنی اہمیت کے مبالغہ آمیز تصور سے متاثر کیا اور اسے ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا ۔ خود مولانا عبید اللہ کو وزیر ہند

اور مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بننا تھا۔ مولانا برکت اللہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا اور برلن کے راستہ کابل پہونچا تھا وہ ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا لڑکا تھا اور انگلستان امریکہ اور جاپان کی سیاحت کر چکا تھا ٹوکیو میں وہ ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہوا تھا وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف سخت لب ولہجہ کا ایک اخبار جاری کیا جس کا نام اسلامک فرٹیرنٹی (اسلامی برادری) تھا حکومت جاپان نے اس اخبار کو بند کر کے اسے پروفیسری سے معزول کیا اور وہ جاپان کو چھوڑ کر امریکہ میں اپنی غدار برادری سے جا ملا۔ ۱۹۱۶ء کی ابتدا میں مشن کے جرمنی ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے۔ ہندوستانی ممبر وہیں رہے اور حکومت موقتہ (پروویژنل گورنمنٹ) نے روسی ترکستان کے گورنر اور زار روس کو خطوط بھیجے جن میں اس سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے امداد کی دعوت دی گئی تھی ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط تھے اور یہ خطوط بعد میں برطانیہ کے ہاتھ میں آگئے زار کو جو خط لکھا گیا تھا وہ سونے کی تختی پر تھا اور اس کی ایک تصویر ہمیں (رولٹ کمیٹی کے ارکان کو) دکھلائی گئی ہے۔ حکومت موقتہ کی ایک تجویز یہ تھی کہ ترکی حکومت سے روابط قائم کئے جائیں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مولانا عبید اللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود حسن (شیخ الہند) کے نام ایک خط لکھا اس خط کو ایک دوسرے خط کے ساتھ جو ۸ رمضان (۹ جولائی ۱۹۱۶ء) کو محمد میاں انصاری نے لکھا تھا ملا کر ایک لفافہ میں شیخ عبدالرحیم کے پاس حیدر آباد سندھ بھیجا گیا۔ شیخ عبدالرحیم تب سے غائب ہے لفافہ پر ایک تحریر تھی جس میں شیخ عبدالرحیم سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ خطوط کسی قابل اعتماد حاجی کے ذریعہ مولانا محمود حسن صاحب کے پاس مکہ معظمہ پہنچائے جائیں اور اگر کوئی دوسرا قابل اعتماد حاجی نہ مل سکے تو شیخ صاحب خود ہی یہ خدمت سرانجام دیں۔ مولانا محمود حسن کے نام کے خطوط جو حکومت برطانیہ کے ہاتھ آئے ہیں ہم نے خود دیکھے ہیں۔ یہ خطوط زرد ریشم پر صاف اور واضح لکھے گئے ہیں۔ محمد میاں کے خط میں جرمن اور ترک مشن کی سابقہ آمد جرمنوں کی واپسی اور ترکوں کے معطل قیام بھاگے ہوئے (مہاجر) طالب علموں کے واقعات غالب نامہ کی اشاعت

---

۵۱ ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء تاریخ کے لئے جو سازش تیار ہوئی تھی۔ اس کا مقصد ایک رجمنٹ کے اسلحہ خانہ اور میگزین پر حملہ کرنا تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۳)

کا ذکر تھا اور حکومت موقتہ اور ایک حزب اللہ کے قیام کی تجویز درج تھی اس فوج کی بھرتی ہندوستان سے کرنی تجویز ہوئی تھی اور اس کا کام اسلامی حکومتوں کے درمیان سلسلہ اتحاد کا قایم کرنا تھا مولانا محمود حسن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ سارے واقعات سلطنت عثمانیہ تک پہونچادیں مولانا عبید اللہ کے خط میں حزب اللہ کا مرتب ومکمل نقشہ تھا اس فوج کا مرکز مدینہ میں قائم ہونا تھا۔ خود مولانا محمود حسن صاحب کو اس کا سالار اعلیٰ بننا تھا۔ ثانوی مراکز مقامی سالاروں کے ماتحت قسطنطنیہ، طہران اور کابل میں قائم ہونے تھے اور کابل کا سالار عبید اللہ کو بننا تھا۔ اس فہرست میں تین سرپرستوں، بارہ جرنیلوں اور کئی اور اعلیٰ فوجی عہدہ داروں کے نام درج ہیں۔ لاہور کے طلبہ میں سے ایک کو میجر جنرل بننا تھا ایک کو کرنیل اور چھ کو لفٹنٹ کرنیل ان اعلیٰ عہدوں کے لئے جن اشخاص کو تجویز کیا گیا تھا ان میں سے اکثر کے ساتھ اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۲) اس تاریخ کو ۔۴۳ آدمی جن میں سے کچھ مسلم تھے ریل کے ذریعہ فیروز پور پہونچے مگر فوج نے پیش بندیاں کی تھیں اور یہ سازش ناکام رہی ان میں سے پندرہ مسلمان طالب علم سرحد کے ہندوستانی متعصبین ومجاہدین سے جاملنے کے لیے نکل چکے تھے (رولٹ کمیشن رپورٹ فصل پنجاب) پیرا ۱۴۴ ہم نے پنجاب سے متعلقہ فصل میں بتایا ہے کہ فروری ۱۹۱۵ء میں لاہور کے پندرہ طالبعلموں نے کالج چھوڑا اور مجاہدین کے ساتھ جاملے اس کے بعد وہ کابل گئے وہاں انکو پہلے تو سختی سے نظر بندی میں رکھا گیا اور بعد میں رہا ہوکر نگرانی کے ماتحت نقل و حرکت کی اجازت دی گئی وہ ہندوستان واپس آئے تین کو حکومت روس نے گرفتار کرکے برطانوی حکومت کے حوالہ کیا انھوں نے اپنے برتاؤ کے متعلق ندامت کا اظہار کیا اور انھیں مشروط معافی مل گئی ان پندرہ طلباء کو ان کے مداحوں نے مہاجرین کا لقب دیا تھا ان میں سے جو دو واپس ہوئے ان کے بیانات ہم نے پڑھے ہیں ایک طالب علم تو ایک مطبوعہ ٹریکٹ سے متاثر ہوا تھا جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ سلطان ترکی نے یہ اعلان کیا ہے کہ چونکہ برطانوی حکومت کی طرف سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملہ کرکے ان مقامات کی بے حرمتی کرنے کا خطرہ ہے اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کو ہجرت کرکے کسی اسلامی ملک میں جانا چاہیئے دوسرے طالب علم کو بھی اسی سلطانی اعلان سے جوش آیا تھا اور ایک انگریزی اخبار کی ایک تصویر سے بھی اسے صدمہ پہونچا تھا جو اس کے خیال میں نفرت کی لہریں پیدا کرنے والی تھی۔

(حاشیہ صفحہ ۵۸ - ۵۹ ذاتی ڈائری)

تقرر کے بارے میں ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ مگر اس ساری اطلاع کی وجہ سے جو ریشمی خطوط میں دی گئی تھی چند پیش بندیاں مناسب سمجھی گئیں اور وہ عمل میں لائی گئیں ۱۹۱۶ء میں مولانا محمود حسن اور اس کے چار ساتھی برطانوی حکومت کے قبضہ میں آگئے اور وہ اس وقت برطانوی نگرانی میں جنگی قیدی ہیں غالب نامہ پر دستخط کرنے والا غالب پاشا بھی جنگی قیدی ہے اس نے یہ اقرار کیا ہے کہ محمود حسن پارٹی نے میرے سامنے ایک خط رکھا تھا اور میں نے اس پر دستخط کئے ہیں اس خط کے مشہور حصوں کا ترجمہ یہ ہے۔

"ایشیا یورپ اور افریقہ کے مسلمان اپنے آپ کو ہر قسم کے ہتھیاروں سے مسلح کر کے خدا کے راستے میں جہاد کرنے کے لئے کود پڑے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین اسلام دشمنوں پر غالب آگئے ہیں۔ اس لئے مسلمانو! جس عیسائی حکومت کے بند میں تم پڑے ہوئے ہو اس پر حملہ کرو دشمن کو مرنے پر مجبور کرنے کے پختہ عزم کے ساتھ اپنی ساری جد و جہد عمل میں لانے کی جلدی کرو ان پر اپنی نفرت اور دشمنی کا اظہار کرو۔ یہ بھی تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مولوی محمود حسن آفندی (سابق مدرسہ دیوبند ہندوستان سے تعلق رکھنے والے) ہمارے پاس آئے اور ہمارا مشورہ طلب کیا۔ ہم نے اس بارے میں اس سے اتفاق کیا اور اسے ضروری ہدایات دیں۔ اگر وہ تمہارے پاس آئے تو تمہیں اس پر اعتماد کرنا چاہیئے اور آدمیوں اور روپیوں اور ہر اس چیز سے اس کی امداد کی جائے جس کی ضرورت اسے پیش آسکتی ہو۔ (ذاتی ڈائری از صفحہ ۵۳ تا ۶۰) رولٹ کمیٹی کی رپورٹ

رولٹ ایکٹ کمیٹی کے ارکان کو اگرچہ واقعات کا صحیح اور مکمل علم نہیں ہو سکا تاہم ان تحریروں سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی جلالت و عظمت اور ان کے بلند ارادوں اور استقلال و عالی ہمتی اور بلند پروازی کا کافی اندازہ ناظرین کو ہو گیا ہوگا۔ مولانا محمد علی (جوہر) مرحوم نے بارہا فرمایا کہ "حضرت شیخ الہند تو اس تحریک میں ایسے بلند مقام پر پہونچ گئے کہ ہمارے اذہان اور خیالات بھی وہاں تک نہیں پہونچے تھے۔" اور جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو تعزیت کے لئے دیوبند تشریف لائے۔ اور رو کر کہنے لگے کہ "حضرت شیخ الہند (رحمۃ اللہ تعالیٰ) کے انتقال نے ہماری کمر توڑ دی۔"

یوروپین قومیں ہر اس شخص کو جو اپنی قوم اور وطن کا فدائی اور خیر خواہ ہو نہایت عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھتی ہیں اور اس کا احترام کرتی ہیں اگرچہ سیاستہً وہ دشمن ہی ہو۔ مالٹہ کی اسارت گاہ میں بڑے بڑے فوجی اور ملکی افیسر انگریز آتے تھے تو حضرت شیخ الہند کو دور سے دیکھ کر ہیٹ (انگریزی ٹوپی) اتار کر سلام کرتے تھے اور باادب کھڑے ہو کر گفتگو کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند کھڑے بھی نہیں ہوتے تھے بلکہ بسا اوقات اپنے ترجمہ قرآن کے لکھنے میں مصروف رہتے مگر یہ فوجی اور ملکی بڑے بڑے افیسر آکر ادب سے کھڑے ہو جاتے تھے اور آپ کی مصروفیتوں کو نہایت ادب سے دیکھتے رہتے تھے۔ حالانکہ معمولی گورا بھی بڑے بڑے گورنمنٹ پرست ہندوستانی نوابوں اور راجاؤں کی ادنیٰ درجہ کی تعظیم و تکریم عمل میں نہیں لاتا تھا۔ پرنس جرمنی (جرمن کا شاہزادہ) جو کہ لنڈن جہاز سے گرفتار ہوا تھا اور مالٹہ میں ایک عرصہ تک رہا تھا ہمیشہ حضرت کی خدمت میں بالخصوص عید بقرعید کے موقعہ پر حاضر ہوتا تھا اور مبارک بادی پیش کرتا تھا اور یہی حال بڑے بڑے فوجی اور سول افسروں جرمنی، اسٹرین، بلگیرین اور ترکوں کا تھا مسٹر برن جو کہ گورنر یوپی کا سکریٹری انگریز تھا مولانا عزیر گل صاحب سے بعض استادوں کے مذکرہ پر کہنے لگا کہ گڑ گڑ ہی رہا اور شکر چینی بن گئی (یعنی تمہارے وہ اساتذہ کم ہمتی کی وجہ سے نیچے ہی رہے اور تم اولوالعزمی اور بلند ہمتی کی وجہ سے اعلیٰ درجہ پر پہونچ گئے۔) یہ تو دنیاوی عزت اور وقعت کا معاملہ ہے مگر ہم کو اللہ تعالیٰ کے یہاں آخرت میں اس سے بدرجہا زائد وقعت کی امیدیں ہیں ؎

سگ اصحاب کہف روزے چند	پئے مردم گرفت مردم شد
پسر نوح بابدان بہ نشست	خاندان نبوتش گم شد

اسی پر جب شریف حسین نے دنیاوی لالچ میں آکر انگریزوں کا ساتھ دیا اور اسلامی ترکی حکومت کو جو کہ اس کی اور اس کے آبا و اجداد اور اولاد و خاندان کی ولی نعمت بھی تھی کفران نعمت کر کے برباد کرایا تو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا تھا ؎

بابدان یار شد شریف حسین	خاندان شرافتش گم شد

چنانچہ بہت ہی تھوڑے زمانہ کے بعد شرافت کا عہدہ اور امتیاز تمام مکہ معظمہ اور حجاز بلکہ عرب سے مٹا دیا گیا۔ شریف حسین کو اس کے آقاؤں نے ہی نظر بند کر کے جزیرہ سائپرس (قبرص) میں پہونچا دیا اور وہ اسی طرح وہاں بے چارگی کی حالت میں مر گیا۔ آخرت کی خبر خدا جانے اس کے لڑکوں شریف عبد اللہ کو شرق اردن کی بے برگ و بے گیاہ وادی کا چھوٹا سا ٹکڑہ اور شریف فیصل کو ماسوپوٹامیا (عراق) کا برباد شدہ اور غیر آباد صوبہ دیدیا اور پھر جو اس کے قتل وغیرہ کے واقعات پیش آئے ان کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں شریف کے ساتھ غدر کرنے والے سوریہ اور فلسطین کے عرب باشندوں کا جو حشر فرانس اور اسرائیل (یہودیوں) کے ہاتھ سے کرایا گیا وہ تاریخ کے سیاہ اوراق اور عربوں کے زخمی اور گہری گھاؤ والے دلوں سے پوچھئے جن پر یورپ کی تیر اندازی آج تک ختم ہونے میں نہیں آتی اور آئے دن قیامت پر قیامت ٹوٹتی رہتی ہے۔ ان ربک لبالمرصاد

گندم از گندم بروید جو ز جو! از مکافات عمل غافل مشو

ترک تو اپنے مقامات پر مستقل اور قابض اور حاکم رہے مگر عربوں کی پریشانیاں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ کہاں عربوں کی مستقل جمہوریت اور تمام عربی بولنے والوں کا صوبائی وفاق اور شریف حسین کی سب پر صدارت جمہوریت جس کا سبز باغ بلکہ خوش آیند خواب برطانی ذمہ داروں نے دکھلایا تھا اور کہاں یہ تفرق، اور یہودیوں کا یہ تسلط اور ظلم و جبر اور عربوں کے لاکھوں نفوس کی جلاوطنی یہ قدرت کے اعجوبات میں سے نہیں ہے تو کیا ہے۔ قل اللّٰھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء مگر افسوس ہے کہ انسان اور مسلمان عبرت پکڑنے کے لئے آج بھی تیار نہیں ہے اور نہ خدائے قدوس مالک الملک کی طرف رجوع کرتا ہے۔ نسوا اللہ فانساھم انفسھم والعیاذ باللہ۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس مدت مدید کی اسارت کی مشقتیں برداشت کر کے ہندوستان آئے تو ان کے جذبۂ حریت اور انگریز دشمنی میں کوئی کمزوری یا کمی نہ تھی بلکہ ہندوستانی مارشل لا، رولٹ ایکٹ کے نفاذ، جلیانوالہ باغ وغیرہ کے واقعات اور ترکی مملکت کی تقسیم اور معاہدہ سیورے اور ترکوں کے

ساتھ انتہائی بے انصافیوں نے اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ بمبئی میں اترتے ہی مولانا شوکت علی مرحوم اور خلافت کمیٹی کے ممبروں وغیرہ سے ملاقات ہوئی مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی لکھنؤ سے اور مہاتما گاندھی احمد آباد سے حضرت شیخ الہندؒ کے استقبال کے لئے تشریف لائے نیز دوسرے لیڈروں سے خلوت اور جلوت میں باتیں ہوئیں تو آپ نے بھی عدم تشدد (نان وائلنس) کا پروگرام ہندوستان کے آزاد کرانے کے لئے ضروری قرار دیا اور پھر اسی طریقہ پر تمام خلافت کمیٹی اور کانگریس کی تجویز کردہ باتوں کی موافقت کی۔ دیوبند پہونچکر چند دنوں قیام فرماکر ضروری سمجھا کہ کوڑا جہان آباد ضلع فتحپور مسوہ میں تشریف لے جائیں اور حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم۔

حضرت شیخ الہند کا کوڑہ جہان آباد اور الہ آباد، غازی پور وغیرہ کو سفر کرنا

کی والدہ محترمہ اور اہلیہ محترمہ اور ان کے بچوں کی تعزیت کریں کیونکہ حکیم صاحب مرحوم حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور مخلص خادم تھے اگرچہ وہ مشن آزادی کے ممبر نہ تھے[1] مگر مکہ معظمہ میں بایں ارادہ ساتھ ہوگئے تھے کہ مدینہ منورہ ساتھ جائیں گے۔ برطانیہ کی غلط کاری نے ان کو بھی رفقاء میں سے شمار کر دیا اور گرفتار کر کے مالٹہ بھیجدیا گیا۔ قاہرہ مصر میں بیان لینے والے انگریز نے خود کہا کہ ان کا غذات (ڈائری اور سی آئی ڈی کی رپورٹوں) میں آپ کا کہیں تذکرہ نہیں پاتا ہوں تو انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں ان باتوں سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا جن کو سی آئی ڈی نے ان کاغذات میں ذکر کیا ہے مجھ کو گرفتار کرنا بالکل دھاندلی ہے (صفحہ ۵۶ سفرنامہ میں ان کے جوابات کی تفصیل درج ہے) مگر اندھیر نگری چوپٹ راج میں کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔ بہرحال وہ ہمارے ہی ساتھ مالٹہ میں نہایت اطمینان اور استقلال سے رہے اور پھر بیمار ہوئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ حضرت شیخ الہند کو ان کے انتقال سے بہت صدمہ ہوا تھا ان کی ضعیف العمر والدہ اور دیگر متعلقین سے حضرت کو بہت زیادہ ہمدردی تھی اس لئے یہ سفر ضروری خیال کیا گیا۔ الہ آباد[2] والوں کو خبر ہوئی تو انھوں نے وہاں اترنے کا اصرار کیا۔ وہاں اچھا خاصہ اجتماع

---

[1] اور نہ ہندوستان سے ساتھ آئے تھے۔ بلکہ اگلے سال وہ اور سید ہاشم صاحب سوڈان اور مکہ ہوتے ہوئے آئے تھے جب حضرت شیخ الہند مدینہ منورہ سے واپس آئے تو ان سے مکہ معظمہ میں ملاقات ہوئی۔ [2] مولانا فاخر صاحب الہ آباد سے ملاقات کرنے کے لئے دائرہ شاہ اجمل صاحب میں تشریف لے گئے اور مبلغ [illegible] سجادہ نشین (یعنی مولانا فاخر صاحب الہ آبادی) کو پیش کئے۔ یہ حضرت شیخ کی کرامت تھی کہ اس بعد ہم نے نذر پیش کی گیارہ روپے ہی پیش کئے بحوالہ مولانا سید محمد شاہد صاحب خلف مولانا سید محمد فاخر صاحب (ناشر)

قاری عبدالرحمان صاحب مرحوم کے مدرسہ میں ہوگیا تو حضرت نے مولانا شبیر احمد کو تقریر کے لئے فرمایا اس تقریر میں خلافت کمیٹی کی حمایت اور تائید پر زور طریقہ پر کی گئی تھی پھر غازی پور فیض آباد لکھنؤ کو تشریف لے جانا ہوا۔ لکھنؤ میں فرنگی محل میں مولانا عبدالباری صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرمایا مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم نے حسب ارشاد حضرت شیخ الہند لکھنؤ میں تقریر فرمائی اس کے بعد مراد آباد ہوتے ہوئے واپس ہوگئے۔

شیخ الہند کا خطاب اور قدوم مبارک کی برکات

حضرت کی تشریف آوری اور خلافت کمیٹی کی شرکت اور تائید اور آزادی ملک کی تڑپ، اور اس راستہ میں جانبازی اور استقلال و اخلاص، یہ امور ایسے نہ تھے کہ قلوب کو مسخر نہ کریں چنانچہ عام مسلمانوں کے قلوب آپ کی طرف نہایت اخلاص کے ساتھ جھک گئے اور عموماً لوگوں میں انتہائی محبت اور قبولیت جاگزین ہوگئی چنانچہ خلافت کمیٹی کے زعماء نے آپ کے لئے شیخ الہند کا لقب تجویز کیا جو کہ ہر طرف اور ہر جماعت میں مقبول ہوگیا اور بمنزلہ جزء اسمی بن گیا اور باوجودیکہ حضرت رحمۃ اللہ تقریر کے عادی نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں مقبولیت نے خلقت میں ایسی قبولیت پیدا کردی کہ لوگ عموماً آپ پر پروانہ وار فدا ہونے لگے اور یہ تحریک خلافت اور آزادی بڑی طاقت کے ساتھ مسلمانوں کے دل اور دماغ پر چھاگئی۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی بیماری

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس سفر حجاز سے پہلے گھٹنوں کے درد اور وجع المفاصل میں مبتلا رہتے تھے سردیوں میں یہ مرض ترقی کر جاتا تھا۔ سیڑھیوں پر چڑھنا اترنا نہایت مشکل ہوتا تھا۔ علاوہ اس کے بواسیر کثرت بول وغیرہ امراض کی بھی شکایات رہتی تھیں مگر اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اس سفر میں اس طرح شامل حال ہوا کہ تمام زمانہ اسارت میں یہ تکالیف بہت کم اور تقریباً معدوم ہوگئی تھیں۔ مالٹہ نہایت سرد جگہ ہے ہم کو ابتداءً خیموں میں رکھا گیا تھا سردی خیموں کے باہر تو انتہائی درجہ کی پڑتی ہی تھی مگر اندر بھی اس قدر پڑتی تھی کہ باوجودیکہ لکڑی کی چارپائیوں پر نیچے گدہ اور اوپر دو کمبل ہوتے تھے پھر بھی

آدھی رات کے بعد سردی کی شدت سے نیند نہیں آتی تھی۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ حسب عادت ڈیڑھ دو بجے اٹھتے پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے اور چونکہ پیشاب کے بار بار آنے کی بیماری تھی ایک شب میں کئی کئی مرتبہ ضرورت پڑتی تھی تاہم بلا تکلف بار بار وضو کرتے تھے اگرچہ بعد میں ہم گرم پانی اور آگ کے مہیا کرنے کا انتظام بھی کر سکے تاہم اس قسم کا انتظام عرصہ تک نہیں ہو سکا تھا تب بھی بلا تکلف حضرت رحمۃ اللہ اپنے اعمال بجالاتے رہے اور اس قدر بیماریوں کی شکایتیں تمام سفر میں نمودار نہیں ہوئیں جو پہلے تھیں البتہ ہندوستان پہونچ جانے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں شکایات لوٹ آئیں اور بڑھنے لگیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وہ جذبہ آزادی ہند اور انگریزوں کے یہاں سے نکالنے کا نہ صرف قائم رہا بلکہ اور قوی اور ترقی پذیر ہو گیا ان مصائب مالٹہ وغیرہ سے کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی بار بار فرمایا کرتے تھے کہ میں پختہ ارادہ کئے ہوئے ہوں کہ اس بیماری سے اچھے ہوتے ہی تمام ہندوستان میں دورہ کروں گا اور ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو آزادی کی مکمل جدوجہد کے لئے آمادہ کردوں گا اور یقیناً اگر عمر وفا کرتی تو ضرور وہ ایسا کرتے۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا گوناگوں امراض ترقی کرتے رہے باوجودیکہ یونانی اور ڈاکٹری معالجوں کی فراوانی تھی اور ہر ایک نہایت فدائیت کا دم بھرتا تھا اور خلوص دل سے کوشاں تھا مگر تقدیر کے سامنے تدبیر کیا کرسکتی ہے۔

میرا ایام بیماری میں غیر حاضر ہونا

چونکہ ۱۳۲۶ھ و ۱۳۲۷ھ و ۱۳۲۸ھ میں مدینہ منورہ سے ہندوستان بحکم والد صاحب مرحوم بوجہ وفات اہلیہ اولی برای عقد ثانی آیا تھا اور فرصت کو غنیمت جان کر دورہ حدیث شریف کی پرانی تمنا کو حاصل کر سکا تھا چونکہ اور رشتہ دار کنبہ والوں نے نکاح کرنے سے بخوف سفر حجاز انکار کردیا تھا اس لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور جناب حافظ زاہد حسن صاحب امروہی کی توجہ اور عنایت سے عقد ثانی قصبہ بچھراؤں ضلع مرادآباد میں سید حکیم غلام احمد صاحب مرحوم کے یہاں ہو گیا تھا۔ اگرچہ حکیم صاحب نے بشرط واپسی بیک سال اہلیہ مرحوم کو مدینہ منورہ لے جانے کی اجازت دیدی تھی مگر مختلف ایسے موانع پیش

آتے رہے کہ مجھ کو دیوبند میں تقریباً تین سال ٹھہرنا پڑ گیا۔ پہلے سال میں میں بخاری شریف اور ترمذی شریف دوبارہ پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس مرتبہ پڑھانے میں خصوصی مراعات فرماتے تھے جو کہ عام طلبہ کو حاصل نہیں ہوتی تھی وجہ یہ بھی تھی کہ اس چھ برس کے عرصہ قیام مدینہ منورہ میں یعنی ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۶ھ تک کتب درسیہ اور غیر درسیہ عموماً میں نے نہایت محنت سے پڑھائی تھیں تقریباً چودہ پندرہ اسباق مختلف علوم درسیہ کے روزانہ پڑھاتا تھا۔ طلبہ کا ہجوم تھا۔ اکثر مضامین غامضہ پر حاوی ہو چکا تھا اس لئے مباحث علمیہ کی مشکلات زیر نظر ہو گئی تھیں اور ان کی گتھیوں کا سلجھانا بجز حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا حضرت رحمۃ اللہ بھی استحضار مسائل دیکھ کر نہایت کشادہ پیشانی سے بحث فرماتے تھے اور مشکلات کو بہت توجہ سے حل فرما کر بہت سے ایسے مضامین ذکر فرماتے تھے کہ عام مستفیدین کو ان کے سننے کی نوبت بھی نہیں آسکتی تھی۔ علاوہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تمام اساتذہ اور ارباب اہتمام انتہائی شفقت فرماتے تھے انھوں نے اگلے سال مجھ کو معقول تنخواہ پر خدمت تدریس پر مقرر کر دیا اور ارباب شوریٰ سے یہ تجویز پاس کرا دی کہ حسین احمد جب بھی ہندوستان میں آئے بلا تجدید تقرر خدمات تدریسیہ انجام دیا کرے اور کتب درسیہ میں اونچے درجہ کی کتابیں حدیث و فقہ و تفسیر وغیرہ کی پڑھانے کے لئے دی گئیں۔ اسی عرصہ میں جلسہ دستار بندی بھی منعقد ہوا اور اس کی خدمات بھی حسب استطاعت انجام دینی پڑیں۔ چونکہ میں اپنی خواہش سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مدینہ منورہ سے اور پھر جدہ سے ہوا تھا تاکہ سفر میں حضرت کی خدمات انجام دوں اور حتی الوسع تکالیف سفر کو کم کروں اس لئے واپسی پر قصد مصمم تھا کہ بمبئی پہونچکر حجاز کو واپس ہو جاؤں گا بمبئی سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خدام کا بہت بڑا گروہ مل جائے گا میرے خدمت میں حاضر رہنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے اور نہ ضرورت ہے مگر اس خیال کو جب میں نے ایک روز سویرے میں ظاہر کیا تو فرمایا کہ میں تراجم ابواب بخاری شریف کی شرح لکھنا چاہتا ہوں مگر یہ کام میں تنہا نہیں کر سکتا میں سمجھ گیا کیونکہ ایام اقامت دیوبند میں بھی ۱۳۲۷ھ میں یہ کام شروع کیا گیا تھا اور حضرت نے میری اس وقت کی خدمات

کو پسند فرمایا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ ایک شرط پر میں تا اختتام شرح تراجم دیوبند میں ٹھہرنے اور امور متعلقہ انجام دینے کے لئے تیار ہوں تو فرمایا کہ وہ کیا شرط ہے میں نے عرض کیا کہ جو وقت آپ اس کے لئے عطا فرمائیں اس وقت میں چاہے کیسا ہی بلند مرتبہ شخص آئے اس کے لئے صرف نہ فرمائیں فرمایا کہ قبول ہے مگر ہماری بھی ایک شرط ہے میں نے عرض کیا کہ وہ کیا ہے تو فرمایا کہ پھر کہیں گے اس لئے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ دیوبند میں حضرت کی خدمت میں تا اختتام تراجم ابواب رہوں گا۔ مگر جب بمبئی پہونچا اور تحریک خلافت کا زور و شور دیکھا اور دیکھا کہ حضرت کا طبعی رجحان تحریک آزادی کی جدوجہد کی طرف قوی تر ہو گیا ہے اور وہی لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں تو یقین ہو گیا کہ کسی قریبی زمانہ میں تراجم ابواب کا کام نہیں ہو سکتا اس لئے میں نے حضرت سے عرض کیا کہ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں مدینہ منورہ چلا جاؤں اور یہاں سے ہی انتظام سفر شروع کر دوں تو فرمایا کہ تیرا جانا تو کسی طرح اس زمانہ شریفی میں مناسب نہیں بلکہ بہتر یہ ہے کہ اپنے دونوں بھائیوں مولوی سید احمد مرحوم اور محمود احمد کو بھی لکھ دے کہ وہ یہاں ہی آجائیں تو پھر میں نے عرض کیا کہ اچھا تو اتنی اجازت عطا فرمائیں کہ میں بمبئی میں تین چار دن ٹھہر کر آپ کے بعد دیوبند پہونچوں میرے چند احباب یہاں ہیں ان سے ملنے کی نوبت نہیں آئی ہے تو اس کی بھی اجازت نہیں دی اور اسی پر اصرار فرمایا کہ ساتھ ہی چلنا ہوگا۔ چنانچہ ساتھ ساتھ ہی دیوبند پہونچنا ہوا۔ حافظ زاہد حسن صاحب امروہوی میرے خصوصی محسن ہیں ان سے ہمیشہ سے بہت گہرے تعلقات چلے آتے ہیں وہ بھی بمبئی تشریف لائے تھے چونکہ وہ مدرسہ امروہہ جامع مسجد کے مہتمم تھے اور صدر مدرس مدرسہ مذکورہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم کسی وجہ سے مدرسہ امروہہ سے برداشتہ خاطر ہو کر منیڈھو یا چھاری کے مدرسہ میں چلے گئے تھے اس لئے حافظ صاحب موصوف نے مجھ پر زور دیا کہ وہاں کی ملازمت قبول کر لے بمقتضائی ضروریات وقتیہ میں نے اس کو قبول کر کے عرض کیا کہ آپ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت لے لیں انھوں نے دیوبند پہونچکر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو راضی کر لیا۔ حضرت مولانا حافظ احمد صاحب کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے دیوبند کے لئے فرمایا کہ اس کی مدرسی یہاں کی پہلے سے منظور شدہ ہے بحیثیت

تحیص کے بعد وہ بھی راضی ہو گئے چنانچہ میں پورب کے سفر کو رُڑہ جہاں آباد الہ آباد غازی پور فیض آباد لکھنؤ مراد آباد سے واپس ہو کر امروہہ چلا گیا اور کتب تدریسیہ متعلقہ مدرس اول کی تدریس میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ حضرت کا حکم محرم ہیں ملا کہ تجھ کو یہاں دیوبند میں میرے پاس رہنا چاہیئے اس زمانہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بیماریوں کی شکایت شروع ہو گئی تھیں مہمانوں کا بہت ہجوم رہتا تھا اور تحریک آزادی کے سلسلہ میں دورہ کی تیاری فرما رہے تھے میں نے عرض کیا کہ حضرت کے ارشاد اور حکم سے میں امروہہ گیا ہوں اور وہ بھی آپ ہی کا مدرسہ ہے اس کا قائم رکھنا ضروری ہے تو فرمایا کہ مجھ کو تیری یہاں ضرورت ہے میں نے عرض کیا کہ یہاں تو خدمات انجام دینے والے بکثرت اور خصوصاً فلاں فلاں حضرات موجود رہتے ہیں فرمایا کہ یہ لوگ تو اپنی نگہداشت بھی نہیں کر سکتے میری نگہداشت کیا کریں گے۔ اس کو سن کر میں چپ ہو گیا اور عرض کیا کہ میں حسب ارشاد حافظ زاہد حسن صاحب کو لکھتا ہوں چنانچہ حافظ صاحب موصوف کو اطلاع دی وہ فوراً آئے اور عرض و معروض کے بعد اس پر راضی کر لیا کہ ایک مہینہ کے لئے حسین احمد کو امروہہ کی اجازت دیدی جائے تاکہ اس مدت میں ہم دوسرے مدرس کا انتظام کر لیں۔ حضرت اس پر راضی ہوئے اور میں امروہہ جا کر تدریس میں مشغول ہو گیا میرے جانے پر مرض میں زیادتی ہو گئی کچھ ہی دن گذرے ہوں گے کہ حضرت کا تار پہونچا کہ میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی جا رہا ہوں تو مجھ سے علیگڈھ میں مل۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سفر علیگڈھ اور بنیاد جامعہ ملیہ

تحریک خلافت کا زور تھا۔ انگریزوں کی غداری سے لوگوں میں سخت برہمی تھی۔ ترک موالات کا جوش تھا اس لئے چاہتے تھے کہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی برطانیہ سے ترک تعلق کرے مگر پرانے سرکار پرست ٹرسٹیاں یونیورسٹی کب اس کو گوارا کر سکتے تھے۔ انھوں نے سخت مخالفت کی جس کے نتیجہ میں مولانا محمد علی مرحوم اور ان کے ہم خیال لوگوں کے ساتھ طلباء یونیورسٹی کی ایک بڑی اور معتد بہ جماعت یونیورسٹی سے جدا ہو گئی اور آزاد درسگاہ قائم کرنے کے لئے جس میں کوئی مداخلت حکومت برطانیہ کی نہ ہو تیاری کرنے لگی یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ناگپور میں اجلاس کانگریس ہوا تھا اور اس میں نان کوآپریشن کی تحریک پاس ہو چکی تھی اس کے

خلاف مسٹر جناح اور ان کے موافقین کی آواز بہت کمزور پڑ گئی تھی - اور یہ پارٹی حد درجہ اقلیت میں آگئی تھی ـــ ملک کے تمام اہل الرائے ہندو اور مسلمان برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے مہاتما گاندھی کی رائے قبولیت عامہ حاصل کر چکی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترک موالات کے متعلق طلباء یونیورسٹی نے فتویٰ حاصل کر لیا تھا جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ترک موالاۃ کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی تھی اور تمام مسلمانوں اور طلباء مسلم یونیورسٹی کو زور دار مشورہ دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں۔ گورنمنٹ سے قطع تعلق کریں اور تمام کالج اور اسکول گورنمنٹی امداد چھوڑ دیں اور اگر کالجوں اور اسکولوں کے زعماء ایڈ نہ چھوڑیں تو طلباء ایسے کالجوں اور اسکولوں سے نکل آئیں۔ نیز ملازمان حکومت انگریزی ان ملازمتوں سے علیحدہ ہو جائیں جن میں حکومت کی امداد خالص طور پر ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ اس ہی فتوی کی وجہ سے گورنمنٹ نے سر رحیم بخش صاحب کو خصوصی طور پر دوسری مرتبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو سمجھانے اور فتویٰ کو واپس لینے کے لئے بھیجا تھا مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اسی فتوی ترک موالاۃ پر اصرار کیا اور واپس نہیں لیا۔ جیسا کہ طلباء مسلم یونیورسٹی کے پاس ترک موالاۃ کا مفصل فتویٰ بھیجا گیا تھا۔ اسی طرح خلافت کمیٹی کے کارکنوں نے بھی فتویٰ حاصل کیا اور وہ چھپ کر شائع ہوا۔ فتویٰ مذکورہ کے الفاظ حسب ذیل تھے"

بسم اللہ الرحمن الرحیم - نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم - قال اللہ تعالیٰ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصابرین (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور آپس میں اختلاف نہ ہونے دو کہ بزدل ہو جاؤ اور تمہاری ہوا بگڑ جائے تم کو نہایت صبر سے کام لینا چاہیئے کہ اللہ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے) وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (اور تم کو نیکی اور تقوی کی معاونت کرنی چاہیئے اور گناہوں اور زیادتیوں کی معاونت مت کرو) ومن یتولھم منکم فانہ منھم ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین (کفار کی موالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے" اور جس نے ان کی دوستی اور معاونت باقی رکھی وہ شخص بھی ان ہی میں سے شمار ہوگا اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا ہے گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرم ضعیف * آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

امابعد آج جب کہ شرق وغرب کے مسلمانوں پر قیامت خیز مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے جب کہ اندیشہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کا جہاز امنڈتے ہوئے طوفان کی موجوں سے ٹکرا کر (خدانکردہ) پاش پاش ہو جائے، جب کہ ہر فرد مسلم کی روح موت کی دھمکیاں دینے والے حوادث سے لرز رہی ہے بلکہ اگر عاقبت بینی سے کام لیا جائے تو ہر ایک ایشیائی اور خصوصاً ہر ایک ہندوستانی اپنی اخلاقی جماعت اور آزادانہ مستقبل کو سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے علماء ہند کی تعداد کثیر اور ہندو ماہرین سیاست کا بہت بڑا طبقہ اس جد وجہد میں ہے کہ اپنے جائز حقوق اور واجبی مطالبات کو پامال ہونے سے بچائیں کامیابی تو ہر وقت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن جو فرض شرعی قومی اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عاید ہوتا ہے تو اس کے ادا کرنے میں ذرہ بھر تاخیر کرنا ایک خطرناک جرم ہے میں اصل فطرت سے کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں اور جیسا کہ میری طویل زندگی شاہد ہے میرا مطمح نظر ہمیشہ مذہب رہا ہے اور یہی وہ مطمح نظر ہے جس نے مجھے ہندوستان سے مالٹہ اور مالٹا سے پھر ہندوستان پہونچایا پس میں ایک لمحہ کے لئے کسی ایسی تحریک سے اپنے کو علیحدہ نہیں پاتا جس کا تعلق تمام جماعت اسلام کی فوز وفلاح سے ہو یا دشمنان اسلام کے حربوں کے جواب میں حفاظت خود اختیاری کے طور پر استعمال کی گئی ہو۔ مالٹہ سے واپس آ کر مجھ کو معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ارباب بسط وکشاد نے آخری طریق کار اپنے فرض کی ادائگی اور اپنے جذبات وحقوق کے تحفظ کا قرار دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کی صحیح اور ایک صریح تعلیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک روشن اسوہ حسنہ کو مضبوط تھام لیں اور نفع وضرر قومی کا موازنہ اور عواقب علیمہ کی پوری جانچ کر کے اس کو بے خوف وخطر انجام تک پہنچائیں اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اعداء اسلام کے ساتھ تعاون وموالات کو اعتقاداً وعملاً ترک کر دیں۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت ناقابل انکار ہے اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہی اقتضا ہونا چاہیئے کہ وہ (۱) سرکاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کر دے (۲) ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کر دے (۳) صرف اپنی ملکی اشیائ اور مصنوعات کا استعمال کرے (۴) سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے

اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں ان پر عمل کریں بشرطیکہ (۱) اتباع شریعت کیا جائے اور عمل درآمد میں خلاف حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ آئے (۲) نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد یا نقض امن کا اندیشہ ہو ان سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں افراط و تفریط سے بچکر اعتدال مد نظر رہے (۳) ارشاد عثمان اذا احسن الناس فاحسن معھم واذا اساؤا فاجتنب اساءتھم (جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے اچھا کرنے میں شریک رہو اور جب کہ برا کریں تو برائی سے بچتے رہو) کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جائے۔ واللہ الموفق والمعین۔

العبد محمود حسن عفی عنہ دیوبندی ۳ ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ

اس کے بعد یہی فتوے جمعیۃ علماء ہند کے متفقہ فتوے کی صورت میں تقریباً پانچ سو علماء کے دستخط سے شائع کیا گیا۔[۱] الغرض اسی تحریک اور اسی فتوی اور اسی تحریر کی بنا پر مسلم نیشنل یونیورسٹی قائم کرنے کی بنیاد ڈالی گئی۔ جو کہ بعد میں جامعہ ملیہ کے نام سے مرسوم ہوئی۔ اگر زعمار مسلم یونیورسٹی پہلے سے آزاد اور قومی لوگوں کی بات مان لیتے تو یہ افتراق نہ ہوتا۔ بہر حال گورنمنٹ پرستوں نے انگریزوں کی چیرہ دستیاں اور غداریاں دیکھتے ہوئے غلامی اور انگریز پرستی کو ہی سراہا۔ جوشیلی روحیں کب اس کو گوارا کر سکتی تھیں انھوں نے ہر قسم کی مشکلات کو برداشت کیا مگر جب اصلاح ممکن نہیں ہوئی تو مجبوراً آنساد نیشنل یونیورسٹی کے لیئے جلسہ کرنا چاہا اور اہل الرائی کو دعوت دی اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو صدر بنانا چاہا۔ حضرت اس وقت سخت بیمار تھے چلنا پھرنا ممکن نہ تھا۔

---

[۱] حضرت مولانا حافظ احمد صاحب صاحبزادہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم اور مہتمم دار العلوم دیوبند کو گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب سرجیمس گورنر یو پی نے دلوایا تھا حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو واپس کر دیا اور ایسی موثر تقریر مجمع خصوصی میں فرمائی کہ نہ صرف حافظ صاحب مرحوم بلکہ تمام مجمع متاثر ہو کر بیک زبان واپسی کا متقاضی ہوا۔

خدام نے اس سفر کو خطرناک اور نہایت تکلیف دہ ظاہر کیا۔ دوسری طرف دعوت دینے والوں کا اصرار تھا کہ ہماری جد وجہد کی کامیابی کا مدار اس پر ہے کہ حضرت صدارت فرمائیں۔ دیر تک فریقین کی گفتگو سننے کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا جواب حسب ذیل تھا۔

"اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا"۔

چنانچہ ۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء اجلاس کی مقرر ہوگئی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے خطبہ صدارت کا مضمون مولانا شبیر احمد صاحب کو بتا کر تحریر کا حکم دیدیا اور جب مولانا شبیر احمد صاحب مسودہ لکھ کر لائے۔ تو اس کو سن کر حسب منشا ترمیم فرما کر چھپنے کا حکم دیا گیا۔

اس مدت میں مرض اور ترقی کرتا گیا۔ ہر قسم کا علاج جاری تھا۔ مگر بجائے فائدہ زیادتی تھی۔ بخار لازمی صورت اختیار کئے ہوئے تھا۔ ضعف اور نقاہت ترقی پذیر تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کا تقاضا تھا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو دہلی لے جایا جائے تاکہ میں پوری توجہ سے اپنی آنکھوں کے سامنے علاج کروں اور دوسرے اہل الرائے سے بھی مشورہ کر سکوں مگر چونکہ علیگڈھ کی تاریخیں مقرر ہو چکی تھیں اس لئے قرار پایا کہ علی گڑھ کے جلسہ سے فارغ ہو کر براہ راست دہلی روانہ ہو جائیں گے اور برائے معالجہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمائیں گے۔

میرا علیگڈھ اور پھر دہلی پہونچنا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا اجلاس میں صدارت فرمانا

دیوبند سے تار آیا کہ میں علیگڈھ فلاں گاڑی سے جا رہا ہوں تو مجھ سے وہاں مل حسب الحکم میں وہاں پہونچا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ مجھ سے پہلے پہونچ چکے تھے۔ جناب عبد المجید صاحب خواجہ کی کوٹھی پر قیام تھا وہیں میں بھی قیام پذیر ہوا۔ اگلے روز جلسہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے شرکت اور صدارت فرمائی۔ ضعف اور بیماری کی وجہ سے خود چل نہیں سکتے تھے دو شخصوں کے کندھوں پر ٹیک کر چلنا ہوتا تھا خطبہ جناب مولانا شبیر احمد صاحب نے پڑھا۔ جو کہ مطبوع ہے اس کے مندرجہ ذیل فقرے قابل یادگار ہیں۔

(۱) میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے

لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں۔ جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا را جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف وہراس طاری ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب وضرب کا۔

پھر چند سطور کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

(۲) اے نونہالان وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علیگڈھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقامون دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔

(۳) آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہونگے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا ہاں یہ بیشک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا اچھا ہے۔

(۴) ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول وفروغ سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کردیں اور ان میں قوم وملت کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے اس لئے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ ہو اور جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت اور تعلیم اور زبان کے متعلق جو ارشاد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے منصف انگریز بھی یہی بلکہ اس سے زیادہ تسلیم کرتے ہیں چنانچہ ڈبلو ڈبلو ہنٹر صفحہ ۲۰۲ میں ۱۸۷۱ء میں لکھتا ہے "مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح وہ لوگ اقلیت میں ہیں جو واقعی باغیرت اور خوددار ہوں۔ دنیادار لوگ ہمیشہ قائم شدہ حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمارے اینگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباء و اجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس کے بخ بستہ حقائق کے مقابلہ میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔ ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقہ کی امداد حاصل ہے۔ یہ لوگ جو کچھ بے ضرر اعتقادات اور تھوڑی بہت جائداد کے مالک ہیں اپنی نمازیں ادا کرنے اور بڑے اہتمام سے مسجدوں میں جاتے ہیں لیکن ضروری اور اہم مسائل پر سوچنے کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے"

(صفحہ ۲۰۲ ہمارے ہندوستانی مسلمان مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین ایم بی بی ایس)

علیگڈھ کے مذکورہ بالا جلسہ کی صدارت اور جامعہ ملیہ کے سنگ بنیاد کی فراغت کے بعد دہلی واپسی اور اجلاس جمعیۃ العلما

اجلاس مذکور سے فارغ ہو کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت توجہ سے علاج جاری فرمایا۔ چونکہ اس سے پہلے امرتسر میں جمعیۃ العلماء کا انعقاد مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی جمیلہ اور مولانا کفایت اللہ صاحب مولانا احمد سعید صاحب اور دیگر حضرات کی جدوجہد سے ہو چکا تھا اور پہلا جلسہ بھی وہیں ہو چکا تھا اس لئے اہل الرائے حضرات نے ضروری سمجھا کہ اب اس کا دوسرا اجلاس دہلی میں بڑے پیمانہ پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں منعقد کیا جائے تاکہ احوال حاضرہ میں علماء اسلام کا زیادہ سے زیادہ اتفاق ہو سکے۔ کیونکہ حضرت کو عام مقبولیت حاصل ہے۔ مسلمان سب سے زیادہ آپ کے گرویدہ اور آپ کے ساتھ حسن اعتقاد رکھتے ہیں اور آپ پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی استدعا کی گئی تو آپ نے قبول فرمایا اور ۷، ۸، ۹ ربیع الاول اجلاس کی تاریخ مقرر کی گئی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کو تحریر خطبہ صدارت پر مامور فرمایا اور مضامین ضروریہ ذکر فرما دیئے۔ چنانچہ مفتی صاحب مرحوم نے مسودہ تحریر کرکے پیش فرمایا اور حضرت کو سنایا بعد ضروری اصلاحات اور ترمیم کے حضرت نے چھپوانے کا ارشاد صادر کر دیا۔ خود حضرت اس قدر بیمار اور ضعیف تھے کہ جلسہ میں باوجودیکہ وہ دہلی میں تھا نہیں جا سکتے تھے۔ جلسہ میں خطبہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم نے پڑھا۔ مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء اپنی کتاب علماء حق صفحہ ۱۵۲ میں تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت شیخ قدس اللہ سرہ العزیز اگرچہ حیات مقدسہ کے بالکل آخری دور میں تھے مگر علماء ملت کی آرزو یہی تھی کہ جمعیۃ علماء حضرت شیخ الہند کی صدارت کا تاریخی امتیاز حاصل کرے اور آپ کے فیوض سے وطنی اور ملی سیاست کے متعلق ایسے بنیادی اصول معلوم کرے جس پر کار بند ہو کر اپنے فرائض سے سبک دوش ہونے کی کوشش کرتی رہے۔

حضرت شیخ کا خطبہ صدارت اگرچہ نہایت مختصر تھا مگر علماء ملت اور ملی سیاست کے تقاضہ کو پورا کرنے کے لئے مکمل اور کافی تھا۔

حضرت شیخ کے اس خطبہ صدارت نے علماء ملت کو مندرجہ ذیل اصولی نظریات کی ہدایات فرمائی

(۱) اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے ترک موالات فرض ہے۔

(۲) تحفظ ملت اور تحفظ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں، اگر برادران وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحق شکریہ ہیں۔

(۳) استخلاص وطن کے لئے برادران وطن سے اشتراک عمل جائز ہے مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو۔

(۴) اگر موجودہ زمانہ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز کا استعمال مدافعت اعداء کے لئے جائز ہو سکتا ہے باوجودیکہ قرون اولی میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے

جواز میں بھی تامل نہ ہوگا۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں ایسے لوگوں کے لئے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق ہوائی جہاز نہیں ہیں یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔

(صفحہ ۱۷ خطبہ صدارت مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند)

حضرت شیخ کی اختتامی تحریر جو آخری اجلاس میں پڑھی گئی اس کے چند جملے بلفظہ درج ذیل ہیں۔

کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عمائدین نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کے لئے میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حالات اگر اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے ناممکن بنا دے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لئے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے شکست کر سکے گی۔ ہاں یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دلنشین کر لیجئے۔ اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے۔ جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری متصور ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے مذہبی معاملات میں تو

بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذہب کی حد سے گذر جاتے ہیں لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتا ہے۔ میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری گزارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیشنوں کی زبانی تائید سے دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا انسداد کرنا چاہیے۔

اگر فرض کرو ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پئے۔ یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے لئے مہلک نہیں۔ البتہ دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائی اور ایک دوسرے کو ضرور پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں اتفاق کے حق میں سم قاتل ہیں مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔

(ص ۱۳ خطبہ صدارت حضرت شیخ الہند مطبع قاسمی) از علماء حق ص ۲۱۰

میرا کلکتہ کو سفر کرنا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہنے سے جدا ہونا

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے قیام دہلی کے زمانہ میں مولانا عبداللہ مصری جو کہ دراصل الہ آباد کے اصل باشندے ہیں اور مصر میں عرصہ تک ایام طالب علمی میں اقامت کرنے کی وجہ سے مصری مشہور ہو گئے ہیں جناب مولانا ابوالکلام صاحب کے بھیجے ہوئے کلکتہ سے تشریف لائے اور مولانا موصوف کا خط لائے جس میں یہ مطالبہ تھا کہ چونکہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے طلبا نے ترک موالات کی تحریک پر مدرسہ عالیہ سے علیحدگی کر لی ہے اور چاہتے ہیں کہ کلکتہ میں ایک آزاد اور نیشنل مدرسہ عالیہ قائم کر دیا جائے خلافت کمیٹی کے اراکین اس کی سرپرستی کریں اس لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا مدرس جو کہ علم حدیث کی کتابیں پڑھا سکے جلد بھیج دیا جائے" تاکہ وہ اوپر کے طلبہ کو پڑھا سکے اور مشہور و معروف ہو خلافت کمیٹی اس کی کفالت کرے گی ضرورت ہے کہ مولانا انور شاہ صاحب کو یہاں بھیج دیجئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ

نے کہا کہ شاہ صاحب (مرحوم) تو دارالعلوم دیوبند چھوڑ نہیں سکتے مگر ہم دوسرا شخص دیں گے جو کہ تمام کتب حدیث کی تعلیم دے سکتا ہو اور اس کو تجربہ اور شہرت حاصل ہو مگر چونکہ جمعیۃ کا اجلاس عام منعقد ہونے والا ہے اس لئے اُس کے منعقد ہونے تک توقف کرنا ہوگا۔ مولانا ابوالکلام صاحب کلکتہ میں خلافت کمیٹی کے صدر تھے اور ان کی تحریک اور زور دار تقریر پر ترک موالات پر طلباء مدرسہ عالیہ متاثر ہو کر مدرسہ عالیہ سے جدا ہوئے تھے اس لئے اس آزاد نیشنل مدرسہ عالیہ کی تمام تر ذمہ داری مولانا موصوف اور اراکین خلافت کمیٹی ہی پر تھی۔ فرنگی محل اور امروہہ وغیرہ سے بھی مدرسین منگائے گئے تھے اگر سابق مدرسین مدرسہ عالیہ ترک موالات کر دیتے تو اس کی ضرورت نہ پڑتی مگر وہ تو بڑی بڑی تنخواہوں کی لالچ اور انگریز پرستی میں مبتلا تھے۔ بہرحال ایک آزاد مدرسہ عالیہ ناخدا مسجد میں قائم ہو گیا تھا۔ مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی اس کے ناظم بنا دیئے گئے تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ چاہتے تھے کہ مولانا شبیر احمد صاحب یا مولانا مرتضیٰ حسن صاحب وہاں چلے جائیں اور اس تحریک پر جو انقلاب ہوا ہے اس کو سنبھال لیں۔ حضرت نے دونوں صاحبوں سے تذکرہ کیا دونوں نے علیحدہ علیحدہ اپنی ماؤں سے اجازت طلبی کا عذر کیا اس لئے اپنے اپنے مکانوں پر واپس ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد بذریعہ خطوط اطلاع دیدی کہ ہماری والدہ اجازت نہیں دیتیں۔ چونکہ جلسہ جمعیۃ کی تاریخیں بالکل سر پر آگئی تھیں حضرت نے دونوں کو بلایا اور یہ فرمایا کہ کلکتہ جانے کا مسئلہ مستقل ہے مگر یہاں حاضر تو ہو جاؤ اور اگر جلاس کی ضروریات میں ہاتھ بٹاؤ اس وقت تک فقط مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب ہی تمام امور اجلاس انجام دے رہے تھے۔ بالآخر ہر دو حضرات تشریف لائے تا اینکہ بفضلہ تعالیٰ بخیر و خوبی علی احسن الوجوہ جلسہ ختم ہو گیا۔ چونکہ مولانا عبداللہ مصری صاحب کو اس انتظار میں بہت مدت گذر گئی تھی اور ان کے ضروری کاروبار میں تعطل زیادہ ہو گیا تھا جس کی بناء پر ان کا تقاضا سخت تھا اس لئے فراغت کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مولانا مرتضیٰ حسن صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب اور مجھ کو تنہائی

میں طلب فرمایا۔ چونکہ معالجہ میں کونین زیادہ استعمال کرائی گئی تھی اس لئے سماعت میں بہت فرق آگیا تھا۔ حضرت نے کلکتہ کی ضرورت ظاہر فرما کر حکم کیا کہ جو رائے اور عذر ہو ہر ایک لکھ کر دیجئے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب نے لکھا کہ ہماری مائیں کلکتہ جیسی دور دراز جگہ پر جانے کی اجازت نہیں دیتیں۔ میں نے لکھا کہ میں امروہہ میں حضرت ہی کے حکم سے گیا تھا اور حضرت ہی کے حکم سے خدمت میں حاضر رہنے کی غرض سے ملازمت تدریس چھوڑ کر حاضر ہوا ہوں۔ کلکتہ جانے میں یہ مقصد عظیم فوت ہوتا ہے علاوہ ازیں نہ میں تقریر کا ماہر اور عادی ہوں نہ تحریر کا نہ مجھ میں ذکاوت ہے نہ حافظہ۔ آئندہ آپ کا جو حکم ہو اس کے امتثال کے لئے حاضر ہوں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہر ایک کی تحریر پر غور کیا اور تھوڑی دیر سکوت کر کے فرمایا کہ اپنے ہی کی طرف جھکنا پڑتا ہے تم چلے جاؤ" (میری طرف خطاب کر کے) میں نے عرض کیا کہ بہت اچھا میں حاضر ہوں۔ مگر چونکہ مدینہ منورہ سے کھجوریں بھائی سید احمد صاحب کی بھیجی ہوئی آئی ہوئی ہیں مجھے اتنی اجازت دی جائے کہ میں سہارنپور اور دیوبند جا کر ان کو جہاں جہاں پہنچانی ہیں پہونچا آؤں دو تین دن میں حاضر ہو جاؤں گا اور پھر کلکتہ کو روانہ ہو جاؤں گا۔ حضرت اس پر راضی ہو گئے اور مولوی عبداللہ صاحب مصری کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ میں نے حسین احمد کو کلکتہ بھیجنے کے لئے مقرر کر دیا ہے وہ دو تین دن میں یہاں کی ضرورتیں پوری کر کے روانہ ہو جائیگا آپ خرچہ سفر فلاں کو دیدیں اور روانہ ہو جائیں۔ میں اسی روز سہارنپور اور دیوبند روانہ ہو گیا اور تیسرے یا چوتھے دن سہارنپور و دیوبند وغیرہ سے ضروریات پوری کر کے واپس آگیا واپسی پر معلوم ہوا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا حماد اللہ صاحب سے فرمایا کہ کہیں حسین احمد کو مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم کلکتہ جانے سے روک نہ دیں۔ میں جب خدمت میں حاضر ہوا تو پوچھا کہ مولانا خلیل احمد صاحب نے کلکتہ جانے کے متعلق کچھ کہا تو میں نے عرض کیا کہ کچھ نہیں فرمایا (اور حقیقت یہی تھی) مگر آپ کے حکم کے بعد وہ یا اور کوئی صاحب کچھ بھی فرماتے میں کسی کی بھی ماننے والا نہیں تھا۔ چنانچہ اسی روز بمار روانگی کے لئے گاڑی کے وقت پر تیار

ہوگیا۔ رخصتی کے وقت حاضر ہوا تو میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور خوشی سے رخصت فرمایا۔ یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ رخصتی ہمیشہ کے لئے ہے مگر تقدیرات الٰہیہ کون جانتا ہے۔؟

میرا دہلی سے رخصت ہو کر بچھراؤں اور امروہہ پہونچنا

چونکہ مالٹہ کی اسارت ہی کے زمانہ میں پہلے والد صاحب مرحوم کا اڈریانوپل میں انتقال ہوگیا تھا۔ جب کہ دونوں بھائیوں مولانا سید احمد صاحب اور عزیزم محمود احمد سلمہ اور والد صاحب مرحوم کو ترکی حکومت نے شریف حسین کی بغاوت پر نظر بند کر کے مثل دیگر ہندوستانیوں اور عربوں کے ترکی ممالک میں متفرق کر دیا تھا۔ اس کے بعد صرف بچے اور عورتیں مدینہ منورہ میں باقی رہ گئی تھیں اور ان میں مولانا عبد الحق صاحب مدنی کی ہمشیرہ بھی تھیں جو کہ بھائی سید احمد صاحب سے منسوب تھیں اس لئے سب کی خبر گیری وہ ہی حسب استطاعت کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں میرے بچے اشفاق احمد اور اس کی والدہ مرحومہ کا مدینہ منورہ ہی میں انتقال ہوگیا تھا اس لئے مالٹہ سے واپسی پر جناب حکیم غلام احمد صاحب مرحوم سے پہلی اہلیہ کی چھوٹی بہن کے متعلق گفتگو کی گئی اور بعد جد وجہد قبول فرما کر انھوں نے اس سے عقد کر دیا تھا۔ وہ کلکتہ جانے کے وقت بچھراؤں ہی میں تھی اس لئے دہلی سے میں براہ مراد آباد روانہ ہوا اور ایک شب کے لئے وہاں قیام کر کے کلکتہ کا ٹکٹ لے کر سوار ہوگیا راستہ میں امروہہ پڑتا تھا امروہہ کے اسٹیشن پر بہت سے احباب نے آکر گھیر لیا اور اترنے پر مجبور کیا میں نے ہر چند اپنے اعذار پیش کئے مگر ایک نہ سنی اور کہا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں ان کا حکم ہے کہ حسین احمد کو اتار لو اور یہاں لے آؤ۔ چنانچہ اترنا پڑا انھوں نے ٹکٹ کو کینسل کرا یا۔

امروہہ اترنے کا سبب

اترنے کا سبب بعد کو معلوم ہوا کہ شیعوں اور سنیوں میں مناظرہ کی قرارداد پہلے سے ہو چکی تھی اور اسی بنا پر اہل امروہہ نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کو تکلیف دی تھی کیونکہ حضرت مولانا موصوف

کو شیعوں کے مذہب سے بہت زیادہ واقفیت تھی اور ان سے مناظرہ کی بھی بہت کامل مہارت تھی۔ مولانا مرحوم نے متعدد کتابیں شیعوں کے رد میں لکھی تھیں اور مختلف مقامات میں کامیاب مناظرے بھی کئے تھے۔ مگر چونکہ خلافت کی تحریک اس وقت بہت زوروں پر تھی اور عام فضا مسلمانوں میں خصوصاً اور تمام ہندوستانیوں میں عموماً اتفاق اور اتحاد قائم کرنے کی متقاضی تھی اس لئے عام اہل شہر مناظرہ کے خلاف تھے اور مناظرہ کے بانیوں وغیرہ پر سخت سے سخت اعتراض کرتے تھے اس لئے سنجیدہ حضرات چاہتے تھے کہ مناظرہ نہ ہو۔ مگر کوئی کھل کر روکنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا ورنہ اس کی جماعت کی بدنامی ہوگی اس لئے چاہتے تھے کہ کوئی قومی اور تحریک کا حامی شخص بیچ میں پڑ کر مناظرہ رکوا دے۔ میں امروہہ میں اس سے پہلے کئی مہینہ رہ چکا تھا اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کا مخلص خادم اور تلمیذ بھی تھا اس لئے حضرت موصوف اور دیگر احباب نے ضروری سمجھا کہ مجھی کو اتار لیا جائے اور مجھی کو درمیان میں ڈالا جائے تاکہ پھر کسی کو حرف گیری اور اعتراض کا موقعہ ہاتھ نہ آئے۔ بالآخر مجھ کو مجبور کیا گیا اور میں نے حاضر ہو کر وہاں تقریر بڑے مجمع میں کی جس کی وجہ سے اشتعال ٹھنڈا ہوا۔ میں نے ہر دو فریق سنیوں اور شیعوں کو سمجھایا اور وقت کی نزاکتوں کو دکھلا کر زوردار اپیل کی کہ کوئی اس قسم کی کارروائی اس زمانہ میں مناسب نہیں ہے جس سے افتراق کی خلیج میں وسعت ہو۔ ضروری ہے کہ اتفاق اور اتحاد کو مضبوط کیا جائے۔ میں نے کربلا شریف بغداد اور عراق کے انگریزی مظالم دکھلائے نیز مکہ معظمہ مدینہ منورہ اور دیگر مقامات مقدسہ کے قیامت خیز واقعات بھی دکھلائے۔ اور شیعوں اور سنیوں دونوں کو ملامت کی۔ بہرحال اس طویل تقریر کا فریقین اور عوام پر اچھا اثر ہوا۔ فریقین سمجھ گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا اس کے بعد میں روانگی کا انتظام کر ہی رہا تھا کہ دہلی سے ڈاکٹر انصاری مرحوم کا تار آ گیا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی بیماری اور وصال

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بیماری اور وصال کی تفصیل تو جناب مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم نے اپنے رسالہ "حیات

شیخ الہند میں بڑی تفصیل سے لکھی ہے جس کو نقل کرنے میں بہت تطویل ہے بنا بریں ہم اس کا اختصار ناظرین کے لئے پیش کرتے ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ جون ۱۹۲۰ء ایک بجے دن کو مالٹا سے بمبئی پورٹ پر تشریف فرما ہوئے بمبئی میں دو دن قیام فرما کر ۲۲ رمضان شب جمعہ مطابق ۱۰ جون بعد از مغرب روانہ وطن ہوئے۔ ۲۴ رمضان المبارک مطابق ۱۲ جون ۱۹۲۰ء بوقت صبح دہلی پہونچے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرمایا ایک روز قیام فرما کر ۲۵ رمضان المبارک مطابق ۱۳ جون ۱۹۲۰ء بروز یکشنبہ بوقت صبح دہلی سے روانہ ہوئے اور اسی روز ۹ بجے دیوبند پہونچے۔ استقبال کرنے والوں کا ہر اسٹیشن پر جس طرح نہایت زیادہ ہجوم تھا یہاں پر بھی بہت زیادہ ہجوم تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے دارالعلوم تشریف لے گئے۔ مہمانوں کی اطراف و جوانب سے نہایت زیادہ آمد تھی بنا بریں ۱۲ شوال تک دیوبند ہی میں قیام فرمانا پڑا اور نہ پختہ ارادہ تھا کہ جلد از جلد مولانا الحکیم نصرت حسین صاحب مرحوم کے مکان پر کوڑہ جہان آباد ضلع فتحپور مرحوم کی تعزیت کے لئے پہونچیں۔ ان کی والدہ ماجدہ اور دیگر متعلقین موجود تھے وہاں سے الہ آباد، غازی پور، فیض آباد، لکھنؤ، مرادآباد ہوتے ہوئے ۲۵ شوال کو دیوبند واپس ہوئے۔ چونکہ اہلیہ محترمہ سخت بیمار تھیں اس لئے درمیانی مقامات پر نہ جا سکے (اگرچہ عقیدت مندوں کے بہت تقاضے تھے) ۷ ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ کو اہلیہ محترمہ مرحومہ نے داغ مفارقت دیا۔ جس کا اثر طبع مبارک پر ہونا طبعی امر تھا۔ ماہ ذی الحجہ میں دیوبند میں موسمی بخار اور تپ و لرزہ کا بہت زیادہ شیوع ہوا۔ چنانچہ عشرہ محرم کے بعد خود حضرت بھی مبتلا، تپ و لرزہ ہو گئے۔ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ وجع مفاصل اور بواسیر کی تکلیف سابق ہندوستان پہونچنے کے بعد ہی عود کر آئی تھی مگر تاہم اس کا تحمل فرماتے تھے اور نشست و برخاست آمد و رفت پر زیادہ اثر نمایاں نہیں ہونے دیتے تھے مگر اس تپ و لرزہ نے یکبارگی اتنا ضعیف کر دیا کہ نشست و برخاست اور آمد و رفت کی طاقت جاتی رہی معالجہ یونانی اور ڈاکٹری جاری تھا۔ بعد انتہائی کمزوری اور غلبہ مرض کے اواخر محرم سے افاقہ تدریجی طور پر شروع ہوا مگر افاقہ کی رفتار بہت سست تھی ۱۹ صفر کو بتقریب صحت احباب اور طلبا دارالعلوم کی دعوت کی گئی جس کا اہتمام مخلصین نے از خود کیا تھا مگر افسوس کہ قدرت کو یہ خوشی باقی رکھنی منظور نہ تھی۔ ۲۰ صفر کو پھر بخار آیا اور پیچش بھی ہو گئی اور ضعف اور مرض میں اضافہ ہوتا گیا تا آنکہ اطبا نے

درم جگر تجویز کیا اسی زمانے میں سفر علی گڑھ کی تحریک ہوئی جس کو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں چنانچہ ۲۴ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء بروز جمعہ علی گڑھ میں جلسہ ہوا حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جمعہ پڑھ کر صدارت فرمائی۔ کمزوری اس قدر تھی کہ خود نہیں پڑھ سکتے تھے مولانا شبیر احمد مرحوم نے خطبہ پڑھا۔ اگلے روز علیگڈھ سے واپس ہو گئے ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر دہلی تشریف لے گئے معالجہ نہایت توجہ سے ہوا جس سے تخفیف کے آثار نمایاں تھے۔ ۱۴ ربیع الاول تک اطمینانی حالت رہی مگر ۱۵ ربیع یوم شنبہ کو پھر لرزہ بخار آیا اور حالت نہایت نازک ہو گئی۔ بخار بہت تیز ہو گیا۔ حالت اگرچہ تشویش ناک تھی تاہم ہوش و حواس بجا تھے آدمی کو پہچانتے تھے۔ بہت ضعیف آواز سے کچھ بات بھی فرماتے تھے۔ مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم سوانح صفحہ ۱۴۴ میں لکھتے ہیں (۱۸ کی شب کے متعلق) رات بھر یہی حالت رہی۔ سینہ پر بلغم تھا جس کو ضعف کی وجہ سے دفع نہیں کر سکتے تھے۔ صبح کو شہد کا شربت دیا گیا تو خلاف امید حلق میں اتر گیا۔ ۶ بجے کچھ اجابت ہوئی اور خود اپنے ہاتھ سے پانی سے استنجا کیا۔ ضعف لحظہ بلحظہ بڑھتا جاتا تھا اور باوجود ہوش بجا ہونے کے ایک استغراقی حالت طاری تھی۔ مخصوص لوگ چارپائی کے گرد موجود تھے دل دھڑک رہے تھے۔ طبیعت ہراساں تھی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ سات بجے کے بعد ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ یوم سہ شنبہ ۳۰ نومبر کو بہت تغیر ہو گیا اور حضرت دنیا سے بالکل غافل ہو گئے۔ تنفس طویل اور غیر طبعی ہو گیا اور انقطاع عن الدنیا و توجہ الی الرفیق الاعلیٰ کا گمان غالب ہونے لگا۔ چارپائی کے گرد حاضرین خاموشی اور آہستگی سے ذکر اللہ میں مشغول تھے کہ اسی حالت میں حضرت نے اس غیر فانی اور واجب الوجود ہستی کو یاد کیا جس کے نام پر اپنے آپ کو محو کر دیا تھا یعنی بلند آواز سے تین مرتبہ اللہ اللہ اللہ فرمایا۔ اھ

مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم کا بیان ہے (جس کو مولانا محمد جلیل صاحب نے نقل فرمایا) کہ حضرت نے تھوڑی دیر آنکھ کھول کر چھت کی طرف دیکھا پھر فرمایا کہ مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں ہے مگر افسوس ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں تمنا تو یہ تھی کہ میں میدان جہاد میں ہوتا اور اعلاء کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کئے جاتے

اس کے بعد بلند آواز سے اللہ اللہ سات مرتبہ کہا۔ آٹھویں مرتبہ آواز بند ہوگئی۔
دیکھا تو زبان تالو سے لگی ہوئی تھی" مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نے سورہ یسٰین شروع کی مگر جوش
گریہ اور ادب کی وجہ سے بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے اس لئے مولوی حافظ محمد الیاس صاحب نے
پڑھنا شروع کیا سورہ قریب الختم ہوئی تو حضرت نے خود بخود حرکت کر کے اپنا بدن سیدھا اور درست کر لیا
ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر سیدھی کر لیں اور آٹھ بجے جبکہ مولوی صاحب بالکل اخیر سورت پر پہونچے تو
حضرت نے ذرا آنکھ کھولی اور تصدیق قلبی کی تائید کے لئے زبان کو حرکت دی اور خاص الیہ ترجعون
کی آواز پر قبلہ رخ ہو کر ہمیشہ کے لئے آنکھ بند کر لی یسر اور سہولت سے سانس منقطع ہو گیا اور روح
مقدس روح وریحان وجنۃ نعیم کی بہار دیکھنے کے لئے تمام اہل اسلام کو یتیم و بیکس چھوڑ کر دنیا
سے رخصت ہوئی اور رفیق اعلیٰ سے جا کر مل گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون"

"وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ہے" (سوانح شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ ص ۱۴۷)

غمزدہ اور پریشان حال حاضرین کے صدمے اور قلق وبیقراری کا اندازہ آسان نہیں ہے کچھ
دیر تو وہ حالت رہی کہ ایک کو ایک کی خبر نہ تھی کسی کی آہ نکلی کوئی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایسے جانکاہ حادثات
پر آہ ونالہ اور چیخ وپکار ایک معمولی بات ہے مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا فیض صحبت کام آیا
اور رضا بالقضاء کا مضمون غالب ہوا۔

نصف گھنٹہ کے بعد منزل اول (قبر) کا فکر ہوا ڈاکٹر صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ
کے بھائی صاحب (حکیم محمد حسن صاحب) اور خدام سے استفسار فرمایا کہ اگر دہلی میں دفن کرنا آپ
مناسب سمجھیں تو محدثین (حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے احفاد کرام رحمہم اللہ تعالیٰ) کے
مزارات میں سامان کیا جائے اور اگر دیوبند کا خیال ہو تو وہاں کا انتظام عمل میں آوے۔ جواباً
کہا گیا کہ حضرت کی آرزو تھی کہ اپنے مخدوم استاد کے جوار با کرامت میں جگہ ملے اور یہی آرزو اور
کشش دوسری دنیا (مالٹہ) سے کھینچکر یہاں لائی تھی۔ نیز صاحبزادیاں بھی اب تک دہلی نہ پہونچی
تھیں اس لئے یہی رائے ہوئی کہ دیوبند لے چلنا چاہیئے۔ (سوانح ص ۱۴۸)

(حاشیہ صفحہ ہذا صفحہ ۲۶۹ پر)

دیوبند کو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس مضمون کا مفصل تار روانہ کیا کہ "حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوگئی جنازہ شام کو دیوبند پہونچے گا" اس کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم اطلاع دینے اور کفن و تابوت اور ریل کے انتظام میں مصروف ہوئے ادھر خدام نے غسل کا انتظام کیا، حکیم محمد حسن صاحب نے مخصوص شاگردوں کی امداد سے بطریق مسنون غسل دیا اور کفن پہنا کر تابوت میں رکھا جو کہ نہایت اہتمام سے بہت جلد تیار کرایا گیا تھا، اور ڈاکٹر صاحب کی وجاہت سے بارہ بجے تک ڈاکٹری سارٹیفکٹ اور ریل کے متعلق تمام انتظامات درست ہوگئے جن کی تکمیل میں دوسروں کو بہت دقت اور تاخیر پیش آتی۔

ڈاکٹر صاحب ہی کا تار امروہہ میں میرے پاس وفات اور جنازہ کے دیوبند لے جانے کا اسی روز شام کو پہونچ گیا تھا حالانکہ میں نے امروہہ پہونچنے کی ان کو کوئی اطلاع نہیں دی تھی غالباً سی آئی ڈی نے ان کو اطلاع دی ہوگی۔ دہلی میں آناً فاناً وفات کی خبر مشہور ہوگئی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنی اپنی دوکانیں فوراً بند کردیں ہزاروں مسلمان ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہونچ گئے اور جنازہ تیار ہوتے ہی نماز جنازہ کے متقاضی ہوئے حکیم محمد حسن صاحب برادر خورد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم لوگوں کی خواہش اور اصرار ہے تو تم نماز جنازہ پڑھ لو میں شریک نہ ہوں گا تاکہ مجھ کو نماز کے دہرانے کا اختیار رہے اور میں دیوبند میں پھر نماز اعزہ و اقارب کے

(حاشیہ صفحہ ۲۶۸)

۱؎ مگر مولانا محمد جلیل صاحب کا بیان یہ ہے کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی رائے یہی تھی کہ حضرت کو مقبرہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں دفن کیا جائے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ میں دو مشکلات میں مبتلا ہوں ایک یہ کہ دیوبند لیجائیں تو مذہب حنفی میں یہ غیر مستحسن ہے اور دوم یہ کہ یہاں کے مقابر میں دفن کریں تو چونکہ اسوقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تمام مسلمانوں کو انتہائی شغف اور محبت ہے تو خوف ہے کہ لوگ قبر کو پختہ کردیں اور ہم کتنا ہی صدائے احتجاج بلند کریں کچھ بھی نہ سنیں۔ پھر فرمایا کہ اہون البلیتین یہی ہے کہ جنازہ دیوبند ہی لیجایا جائے وہاں قبر کے پختہ کرنیکا احتمال نہیں ہے اور صاحبزادیوں کی بھی اشک شوئی ہو جائے گی اس لئے اسی کو اختیار کیا گیا۔

ساتھ پڑھ سکوں۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے سامنے میدان میں ایک مرتبہ بہت بڑے مجمع کے ساتھ نماز ادا کی گئی اس کے بعد جنازہ آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ لوگ بڑھتے جاتے تھے۔ اندازہ کیا جاتا تھا اسٹیشن کے قریب پہونچکر بیس ہزار آدمیوں کی تعداد ہوگئی۔ وہاں پھر دوسری دفعہ نماز جمعہ پڑھی گئی۔ ڈھائی بجے کے بعد دہلی سے وہ گاڑی جس میں تابوت تھا روانہ ہوئی پھر شہر میرٹھ اور چھاؤنی میرٹھ پر نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ساڑھے سات بجے شب کو تابوت دیوبند اسٹیشن پر پہونچا ازدحام نہایت عظیم الشان تھا۔ بمشکل تمام جنازہ اسٹیشن سے نکلا اور بہت دیر میں مکان پر پہونچا چونکہ قبر پہلے سے تیار ہو چکی تھی اس لئے بہت سے لوگوں کی رائے ہوئی کہ ابھی رات ہی میں دفن کر دیا جائے مگر چونکہ صاحبزادیاں اور داماد جو کہ تار ملنے کے بعد دیوبند سے دہلی کو روانہ ہو چکے تھے اور ابھی راستہ ہی میں تھے کہ جنازہ غازی آباد آگیا اس لئے وہ غازی آباد میں اتر گئیں مگر ہجوم کی زیادتی اور ٹرین کی جلدی سے روانگی اور ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے ساتھ نہ ہو سکی تھیں اس لئے ترجیح اسکو دیگئی کہ صبح تک جنازہ دفن نہ کیا جائے چنانچہ وہ اگلی ٹرین سے رات میں آگئیں۔ بہت سے عقیدت مند اور مخلصین کا بے شمار اجتماع سہارنپور مظفرنگر وغیرہ اطراف وجوانب سے ہوگیا اور اعلان کر دیا گیا کہ نماز جنازہ اور دفن صبح کی نماز کے بعد کیا جائے گا۔ صبح تک یہ اجتماع اور بھی زیادہ ہوگیا۔ جنازہ نماز صبح کے بعد دارالعلوم میں پہونچایا گیا۔ نودرہ اور باہر کا صحن آدمیوں سے بھرا ہوا تھا بمشکل تمام صف بندی ہوئی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ولی اقرب اور برادر عزیز مولانا حکیم محمد حسن صاحب جنھوں نے اب تک نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی با قلب مضطر وچشم تر نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ تمام مجمع پر ایک پر کیف سکوت طاری تھا اور ایک ہیبت و نورانیت مشاہد ہو رہی تھی۔ خواہ اس کو جذبات حسرت سمجھئے یا واقعیت وحقیقت کہئے۔

(سوانح ص ۱۵۲)

دیوبند میں اس وقت تک بڑے بوڑھوں نے بھی کبھی کسی جنازہ کے ہمراہ اس قدر مجمع نہیں دیکھا تھا۔ مدرسہ کے دروازہ سے قبرستان تک آدمی ہی آدمی نظر آتا تھا جنازہ مقبرہ میں پہونچا

یعنی بیالیس برس کی ظاہری جدائی کے بعد دنیا کی کشاکش سے استراحت کے لئے یہ شاگرد رشید فخر استاد اپنے مقدس مرشد و استاد کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ قبر تیار تھی جنازہ قریب لاکر رکھا گیا۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور حضرت کے داماد اور بعض مخصوص خادم قبر میں اترے چاشت کا وقت تھا نو بجے تھے کہ قدوۃ الواصلین، امام المحدثین والعارفین، قطب عالم علوم و کمالات، بطل حریت، آزاد کنندہ ہندوستان، خاتم دوران، بخاری زماں، کوہ وقار و حلم، آفتاب معرفت و علوم، گنجینۂ حکمت الٰہیہ، خزینۂ احادیث، سنن نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ) کو لحد میں اتار دیا گیا اور شریعت و طریقت کے آفتاب عالمتاب کو ہمیشہ کے لئے نظروں سے چھپا دیا گیا۔ ایک غمزدہ کی زبان نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔

مٹی میں کیا سمجھ کے چھپاتے ہو دوستو
گنجینۂ علوم ہے یہ گنج زر نہیں

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ آمین

مسیحائے زماں پہونچا فلک پر چھوڑ کر سب کو — چھپا چاہ لحد میں وائی قسمت ماہ کنعانی
جو تھا موصل الی اللہ ہو گیا واصل بحق ہی ہر — پھریں ہیں ڈھونڈھتے سرگشتگاں تیہ حیرانی
زمانے نے دیا اسلام کو داغ اس کی فرقت کا — کہ تھا داغ غلامی جس کا تمغائے مسلمانی
نہیں ہے سینۂ مجروح کم گنج شہیداں سے — تمنائیں جو تھیں دل میں ہوئی ہیں سب کی قربانی
فضائل ہائے شتیٰ میں سے کوئی ایک دکھلادے — کئے تھے حق تعالیٰ نے جو مولانا کو ارزانی
فقط ایک آپ کے دم سے نظر آتے تھے سب زندہ — بخاری و غزالی بصری و شبلی و نعمانی
جنھیں چھوڑا تھا تم پر حضرت امداد و قاسم نے — کرے گا کون ان سب بیکسوں کی ہائے چوپانی

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

میرا دیوبند پہونچنا میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کلکتہ بھیجنے کے تیسرے

میں امروہہ پہنچا اور اسی روز جلسہ اور تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحب کا تار پہونچا کہ حضرت کا وصال ہو گیا اور جنازہ دیوبند جا رہا ہے۔ میں نے دیوبند جانے کا ارادہ کر لیا۔ لوگوں نے منع بھی کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا شام کی گاڑی نکل چکی تھی اس لئے رات کی گاڑی ملی اور میں صبح کو تقریباً ۹ بجے دیوبند پہونچا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دولت کدہ پر جب پہونچا تو دیکھا کہ لوگ دفن سے فارغ ہو کر واپس آرہے ہیں۔ اپنی بد قسمتی اور بیچارگی پر انتہائی افسوس ہوا کہ باوجود سالہا سال حاضر باشی کے شرف کے آخری وقت میں نہ وفات کے وقت حاضر رہا اور نہ دفن میں شرکت کر سکا۔ افسوس

قسمت کی بد نصیبی کو صیاد کیا کرے
سر پہ گرے پہاڑ تو فریاد کیا کرے

کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔ دو چار روز رہ کر کلکتہ کا عزم کیا تو حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم مہتمم دار العلوم مانع ہوئے اور دیوبند ہی کے قیام کا حکم فرمایا مگر میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت نے اپنی شدید بیماری کے دوران میں جب کہ خود حضرت میری حاضری کی ضرورت محسوس فرماتے تھے اس کے علاوہ اور بھی چند اہم ضرورتیں درپیش تھیں۔ ان سب کو نظر انداز فرما کر کلکتہ روانگی کا حکم فرمایا اور کلکتہ کے کام کو سب پر ترجیح دی۔ اب وفات کے بعد کسی طرح درست نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت کا حکم پس پشت ڈال دیا جائے اور تن آسانی اختیار کی جائے۔ خصوصاً جب کہ یہاں دار العلوم میں بہتر سے بہتر کارکن حضرات موجود ہیں میرا یہاں قیام کس طرح درست سمجھا جا سکتا ہے؟ الغرض میں نے کلکتہ کی روانگی پر اصرار کر کے حضرت مہتمم صاحب مرحوم کو راضی کر لیا اور کلکتہ پہونچ کر اسباق حدیث شریف سنبھال لئے مگر چونکہ خلافت اور آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی اطراف و جوانب کلکتہ میں بکثرت جلسے ہو رہے تھے ان میں بار بار حاضر ہونا پڑتا تھا اس زمانہ میں اندرون بنگال بھی دور دراز شہروں میں بڑے بڑے جلسوں میں جانا پڑا جن میں سے مولوی بازار کے مشہور جلسہ کانگریس و خلافت میں بھی جانے پر مجبور کیا گیا۔ اجلاس کانگریس کے صدر مسٹر سی آر داس آنجہانی تھے اور جلسہ خلافت اور جمعیۃ کی صدارت

مجھ کو انجام دینی پڑی تھی۔ اور دوسرا جلسہ ضلع رنگ پور میں بڑے پیمانہ پر ہوا تھا دونوں کے خطبات چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح دو مرتبہ ہندوستان یوپی میں بھی آنا پڑا۔ ایک جلسہ سیوہارہ ضلع بجنور کا تھا اور اس جلسہ میں جمعیۃ کی صدارت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نائب مہتمم دار العلوم نے فرمائی تھی اور جلسۂ خلافت کی خدمت صدارت مجھے انجام دینی پڑی تھی۔ اس موقع پر بھی کانگریس کا اجلاس مشترک طور پر ہوا تھا۔ اس کے صدر دہرہ دون کے ایک پنڈت صاحب تھے۔ میرا خطبہ اس وقت بھی شائع ہوا تھا۔ ان جلسوں کے خطبوں کے ضروری اقتباسات حضرت مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند نے اپنے رسالہ[1] میں نقل کر دیئے ہیں۔ اسی طرح سہارنپور کے مدرسہ مظاہر العلوم کے سالانہ جلسہ میں بھی کلکتہ سے حاضر ہونا پڑا تھا۔ اس کے بعد کراچی کے مشہور جلسہ میں حاضر ہونا پڑا جس پر کراچی کا تاریخی مقدمہ چلا اور دو سال قید بامشقت کی عزت مجھے اور مولانا محمد علی مرحوم و مولانا شوکت علی وغیرہ میرے ساتھیوں کو حاصل ہوئی اور کلکتہ کی ملازمت اس کی وجہ سے ختم ہو گئی۔

اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس تحریر کو یہاں ختم کر دیں کیونکہ یہ احوال اکثر تحریروں میں آ گئے ہیں خصوصاً مولانا محمد میاں صاحب نے اپنے رسالوں[2] میں ذکر فرما دیئے ہیں اور لوگوں کو معلوم بھی ہیں۔ نیز خطبات اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس لئے مزید تحریر غیر ضروری سمجھ کر قلم فرسائی بند کرتے ہیں۔

کانگریس سے تعلق

میں اگرچہ پہلے سے کانگریس میں شامل نہ تھا مگر مالٹہ سے واپسی پر کانگریس کا ممبر باقاعدہ بن گیا اور ہمیشہ جد و جہد آزادی میں شریک رہا اور قید و بند کی مصائب بھی اہل ملک کے ساتھ ساتھ جھیلتا رہا۔ بفضلہ تعالیٰ اس میں کامیابی ہوئی۔ اور انگریزوں کی غلامی سے تمام ہندوستان آزاد ہو گیا۔ فالحمد للہ اولاً و آخراً۔

اس تحریر کی ابتداء نینی جیل میں ۱۹۴۳ء میں ہوئی تھی۔ ابھی چند صفحات لکھے تھے کہ رہائی ہو گئی پھر جب بھی تکمیل کا ارادہ کیا مشاغل اور عوائق حائل ہوتے رہے۔ مگر احباب کے تقاضوں نے پیچھا

---

[1] ملاحظہ فرمائیے رسالہ حیات شیخ الاسلام۔ [2] ملاحظہ فرمائیے علماء حق جلد اول، دوم و حیات شیخ الاسلام

نہیں چھوڑا۔ وہ دن بدن شدید ہو کر بڑھتے رہے۔ خدا خدا کر کے بڑی مشکلوں سے ۱۹۵۳ء کے آغاز میں یہ ٹوٹی پھوٹی تحریر اختتام کو پہونچی۔ مشاغل و عوائق جس طرح باعث تاخیر ہوتے رہے وہ شکستگی میں بھی اضافہ کرتے رہے۔ اور اس کا موقع بھی میسر نہ آسکا کہ نظر ثانی کر سکوں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے پیش خدمت ہے۔ گر قبول اُفتد زہے عز و شرف۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہ۔

ضمیمہ صفحہ ۲۱۲

حضرت مصنف مدظلہ العالی نے نقش حیات جلد دوم میں چند واقعات کی تفصیل کے لئے سفرنامہ "اسیر مالٹا" کا حوالہ دے دیا ہے۔ چونکہ یہ تفصیل دلچسپی کے علاوہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے حالات کے بارہ میں خاص اہمیت بھی رکھتی ہے۔ اس لئے اس کو اس ضمیمہ میں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ مطالعہ کرنے والے حضرات کو تشنگی باقی نہ رہے۔ البتہ یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ سفرنامہ اسیر مالٹا چونکہ برطانوی سامراج کے دور شباب میں ایسے وقت لکھا گیا تھا کہ حضرت مصنف (شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی) جیل میں بند تھے۔ اس لئے انداز تحریر میں یہ لحاظ رکھنا ضروری تھا کہ مسودہ جیل خانہ کی چاردیواری سے باہر نکل کر طبع ہو سکے اس لئے بعض واقعات کو آئینی الفاظ میں ظاہر کرنا پڑا ہے۔ ناظرین کرام اس پس منظر کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ عبارتیں ملاحظہ فرمائیں

مولانا مرحوم کا حجاز کو روانہ ہونا

ماہ شوال ۱۳۳۳ھ میں قصد فرمایا چونکہ مولوی عزیز گل صاحب خاص خادم کو اپنے وطن کی طرف جانا اور اپنے اکابر سے ملنا اور اجازت چاہنا ضروری تھا اس لئے ان کی واپسی کا انتظار فرمایا۔ اس مدت میں سامان سفر قدرے مہیا ہو گیا۔ عالی جناب حکیم عبدالرزاق صاحب غازی پوری برادر بزرگ جناب ڈاکٹر انصاری نے اس سفر میں نہایت زیادہ امداد دی جس کے حضرت مولانا مرحوم ہمیشہ ممنون منت رہا کئے۔ حکیم صاحب موصوف مولانا سے پہلے بمبئی پہونچ گئے اور ہر قسم کا ضروری سامان سفر نہایت فراخ دلی کے ساتھ مہیا کر دیا۔ بلکہ جائے قیام اور ٹکٹ وغیرہ کا بھی انتظام کافی طور پر کر دیا۔

مولانا کے رفقائے سفر

مولانا کی روانگی ایک معمولی شخص کی روانگی نہ تھی۔ بہت سے ارباب عقیدت استفاضہ یا خدمت کے لئے ساتھ ہو لئے۔ جن میں سے خاص خاص حضرات حسب ذیل ہیں۔

مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری۔ مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری۔ مولوی محمد میاں صاحب انبہٹوی۔ مولوی عزیز گل صاحب ساکن زیارت کاکا صاحب۔ حاجی خان محمد صاحب مرحوم۔ مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب دیوبندی۔ حاجی محبوب خاں صاحب سہارنپوری۔ حاجی عبدالکریم صاحب سرونجی۔ مولوی وحید احمد وغیرہ

مولانا کے سفر کی نسبت افواہ

عام لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ مولانا دیوبند سے ہجرت کر کے جا رہے ہیں۔ اور اب ہمیشہ حرمین شریفین میں عمر بسر فرمائیں گے۔ اور چونکہ مولانا مرحوم نے بخوف وفات اپنی جائداد شرعی طریقہ پر ورثا میں تقسیم کر دی تھی۔ اس لئے اور بھی لوگوں کو اس خیال

میں تقویت ہوئی۔ مولانا نے ایک عرصہ تک کے لئے اپنے گھر کے مصارف کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ اس خاص افواہ کی وجہ سے ہر اسٹیشن پر لوگوں کا بہت بڑا مجمع زیارت کے لئے موجود رہتا تھا۔ طلبا مدرسہ نے اپنے اپنے اعزہ کو تاریخ روانگی سے تار کے ذریعہ مطلع کر دیا تھا۔ غرضکہ ہر اسٹیشن پر ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا جس کی وجہ سے مصافحہ کرنا بھی سخت دشوار تھا۔ متابعت کرنے والے بھی بہت سے ساتھ ہو گئے تھے۔ دہلی میں مولانا مرحوم نے گاڑی میں قدرے تاخیر ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر جا کر چاء بھی نوش فرمائی اور بہت تھوڑی دیر قیام فرما کر گاڑی کے وقت اسٹیشن پر آگئے ناگدہ ریلوے سے روانہ ہوئے۔ راستہ میں رتلام، راندیر میں بھی قدرے قیام فرمایا۔ کیونکہ ان مقامات پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خاص خاص لوگ تھے جنھوں نے سخت اصرار فرمایا تھا۔

راندیر سے روانہ ہو کر بمبئی پہونچے اور انجمن محافظ حجاج کے آفس میں جس کو حکیم عبدالرزاق صاحب نے پہلے سے آراستہ کر رکھا تھا قیام فرمایا۔ وہاں بھی مولانا کے زائرین کا ایک بڑا مجمع رہتا تھا۔ اگر انجمن کے کارکن انتظام کافی نہ کرتے تو غالباً مولانا کو آرام کی صورت ممکن ہی نہ ہوتی۔

بمبئی سے مولانا کی روانگی

جو تاریخیں اکبر جہاز کی روانگی کی تھیں۔ اسی کے ٹکٹ مولانا مرحوم اور ان کے ساتھیوں کے لئے گئے تھے۔ مولانا اور ان کے خاص بعض خدام کے ٹکٹ سیکنڈ کلاس کمرہ کے اور باقی ماندہ کے چھتری یا تتق کے تھے۔ چنانچہ بروز شنبہ، ۲ ذی القعدہ ۱۳۳۳ھ کو جہاز پر سوار ہو کر جدہ کو روانہ ہو گئے۔ چونکہ اکثر ہمراہیوں کی طبیعت دریائی سفر سے مانوس نہ تھی۔ اس لئے عموماً ان کو بدمزگی اور چکر وغیرہ کی شکایت پیش آئی جس کی وجہ سے میوہ جات اور عمدہ غذائیں اپنے موقع پر صرف نہ ہوئیں جن کی بڑی مقدار حکیم صاحب نے مولانا اور ان کے رفقاء کے لئے مہیا کی تھی بلکہ بہت سی چیزیں ضائع ہوئیں۔ بوجہ ظہور جنگ ان دنوں قرنطینہ جزیرہ کامران سے اٹھا لیا گیا تھا۔ اور قریب جدہ کے مقام سعد میں ہوتا تھا۔ چنانچہ جہاز نے وہاں لنگر ڈالا اور بخیر و خوبی مولانا اور ان کے رفقاء اترے۔ اور ایام قرنطینہ نہایت عافیت سے انجام دے کر جدہ پہونچے۔

خفیہ پولیس کی افواہ

بمبئی میں سوار ہوتے وقت بعض لوگوں نے مولانا کے رفقاء سے یہ کہا کہ تقریباً آٹھ دس آدمی تمہارے ساتھ خفیہ پولیس کے ہیں ان سے احتیاط رکھنا ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ بیان صحیح تھا یا غلط، چونکہ یہ بات اہل جہاز کو معلوم ہو چکی تھی۔ کسی شخص نے جو کہ غالباً جدہ یا مکہ معظمہ کا رہنے والا تھا اس کو ترکی پولیس تک پہونچا دیا۔ اور جو لوگ مشتبہ تھے ان کے نام و نشان بتا دیئے اور کہدیا کہ یہ لوگ مولانا پر مسلط ہو کر آئے ہیں حالانکہ اس قسم کا خیال نہ مولانا کو تھا اور نہ ان کے رفقاء کو۔ ترکی پولیس نے فوراً ان لوگوں کو گرفتار کر لیا اور مولانا مرحوم کی خدمت میں پولیس کا افسر تصدیق کرانے کے لئے حاضر ہوا۔ مولانا خود تو آفس میں نہ گئے مگر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب وغیرہ کو بھیجدیا۔ چونکہ واقعی طور پر کوئی یقینی بات تھی ہی نہیں۔ اس لئے مولوی صاحب موصوف نے یہی بیان دیا کہ ہم کو کوئی یقین ان لوگوں کے سی۔ آئی۔ ڈی ہونے یا مولانا پر مسلط کئے جانے کا نہیں ہے۔ ہم کوئی شہادت ایسی نہیں دے

سکتے جس کا ہم کو علم نہیں۔ مگر پولیس ٹرکی نے اس جواب کو اس پر محمل کیا کہ چونکہ ان لوگوں کو پھر ہندوستان جانا ہے اس لئے صریح طور پر اپنی معلومات کو ظاہر نہیں کر سکتے۔ الحاصل ٹرکی پولیس نے ان لوگوں کو زیر حراست رکھا اور اسی طرح ان کو حج کرا کر یہ کہا کہ اگر تم اپنے محافظ سپاہیوں کا خرچ دو تو تم کو مدینہ منورہ کی زیارت کی اجازت مل سکتی ہے ورنہ تم کو ہندوستان واپس ہونا پڑے گا۔ چونکہ ان لوگوں کے پاس اتنا خرچ نہ تھا اس لئے وہ بمبئی واپس کر دیئے گئے۔

دوسری افواہ

بعض خفیہ کے افسروں کا بیان ہے کہ جب مولانا مرحوم بمبئی پہونچے تو وہاں کے افسر پولیس کے پاس تار آیا کہ مولانا کو بمبئی میں گرفتار کر لیا جائے اور آگے جانے نہ دیا جائے مگر چونکہ مولانا کے پاس بہت بڑا مجمع رہتا تھا اس لئے بمبئی کے مقامی حکام کو بلوہ کا خوف ہوا اور اس وجہ سے انھوں نے عملدر آمد سے پہلو تہی کی۔ پھر دوسرا حکم روانگی کے بعد جہاز کے کپتان کے پاس پہونچا کہ مولانا کو جدہ میں اُترنے نہ دیا جائے بلکہ جہاز ہی پر گرفتار کر لیا جائے مگر یہ حکم اُس کے پاس اُس وقت پہونچا جب کہ مولانا جزیرہ سعد میں برائے قرنطینہ اُتر چکے تھے۔ اس لئے ہمیں معذوری رہی (ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ دونوں بیان کہاں تک صحیح ہیں) مگر ہم کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوئے

مولانا مرحوم کی جدہ سے روانگی اور مکہ معظمہ میں داخلہ

۲۷ ذی قعدہ ۱۳۳۳ھ کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ اونٹوں کی سواری پر مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے اور اٹھائیسویں کو مکہ معظمہ میں شب بحرہ گذار کر شام کو داخل ہوئے وہ زمانہ طبعی طور پر حجاج کے ہجوم کا ہوتا ہے مگر چونکہ جنگ کی وجہ سے بہت سے ملکوں سے حجاج کی آمد و رفت بند یا کمی پر تھی اس وجہ سے حسب دستور ہجوم میں کمی ضرور تھی۔ مگر تاہم مکہ معظمہ کی گلیاں اور مکانات مسافرین سے لبریز تھے۔ حرم محترم میں بھی لوگوں کی کثرت تھی۔ مولانا مرحوم طواف قدوم وسعی وغیرہ ادا کرنے کے بعد احباب سے ملنے اور ادائے عبادت میں بدل و جان مشغول ہوئے۔

ضمیمہ صفحہ ۲۲۸

سفرنامہ اسیر مالٹا (جس کا حوالہ دیا گیا ہے) اس کی عبارت درج ذیل ہے۔

حضرت شیخ الہند بمعیت سید امین عاصم صاحب آمد و رفت کا اونٹ کرایہ کر کے ۲۰ رجب ۱۳۳۴ھ کو روانہ ہو کر ۲۳ یا ۲۴ رجب کو طائف پہونچے۔ شہر پناہ کے باہر ایک باغ میں فروکش ہوئے جس کا انتظام سید صاحب نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ باغ کے بالائی حصہ مکان میں سید امین عاصم صاحب معہ اپنے متعلقین تھے اور نیچے کے ایک حصہ میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اس سفر میں مولانا کے ہمراہ فقط تین آدمی تھے۔ مولوی عزیر گل صاحب۔ وحید احمد اور کاتب الحروف حسین احمد۔

طائف

طائف حقیقتاً ایک چھوٹا سا قصبہ ہے مگر اس کا اطلاق بہت بڑے حصہ پر کیا جاتا ہے جس میں بہت سے قصبات اور دیہات شامل ہیں۔ یہ قطعہ زمین کا بہت اونچائی پر واقع ہے۔ اونٹوں

کے راستہ سے تین دن میں یہاں پہونچتے ہیں۔ کیونکہ چکر زیادہ ہے اور چڑھائی بآسانی طے ہوتی ہے۔ اور جبل کرہ کے راستہ سے جس میں خچر گدھے گھوڑے چلتے ہیں ۲۴ گھنٹہ بلکہ اس سے کم میں آدمی پہونچ جاتا ہے مگر راستہ دشوار گذار ضرور ہے۔ آدھے راستہ ہی سے ہوا بالکل متغیر ہو جاتی ہے جبکہ مکہ معظمہ میں سخت گرمی کی وجہ سے شب کو بھی آرام نہ آتا ہو طائف میں پتلی رضائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں کا موسم گرمیوں میں نہایت عمدہ رہتا ہے جا بجا باغات ہیں۔ ہر قسم کے میوے پیدا ہوتے ہیں۔ انگور۔ انجیر۔ برشومی (ناگ پھل) انار۔ آڑو۔ آلوچہ وغیرہ وغیرہ جملہ سرد ملکوں کے میوے بکثرت اور عمدہ ہوتے ہیں۔ زراعت اور سبزی کا ہر قسم کی پیدا ہوتی ہے۔ جا بجا نہریں بھی ہیں۔ کنویں میٹھے بکثرت ہیں۔ بارش بھی خوب ہوتی ہے۔ حجاز کے لئے طائف ہند کے لئے شملہ کی مانند ہے۔ ترکی گورنر اکثر گرمیوں کے زمانہ میں طائف میں رہا کرتا تھا اور بڑے درجہ کے حکام اور اہل عرب شریف وغیرہ بھی وہاں ہی چلے جاتے تھے۔

فتنہ حجاز جب ہم مکہ معظمہ میں پہونچے تو عجیب عجیب افواہیں مشہور تھیں عام بدؤں اور اہل شہر کی زبانی سُنا جاتا تھا کہ عنقریب بد عملی ہونے والی ہے۔ شریف حسین انگریزوں سے ملا ہوا ہے اور بغاوت کرنے والا ہے مگر ترکی کے استقلال میں کوئی فرق نہ تھا۔ ترکی فوج تمام حجاز میں غالباً چار پانچ ہزار ہوگی۔ کیونکہ اکثر فوج دوسرے مقامات جنگ پر چلی گئی تھی۔ شریف نے باب عالی کو اطمینان دلا رکھا تھا کہ حجاز کا ذمہ دار میں ہوں یہاں زیادہ قوت رکھنے کی ضرورت نہیں۔ جائے ضرورت جنگ پر اپنی قوت پہونچاؤ۔ یہ موجودہ فوج بھی جدہ۔ مکہ۔ طائف پر منقسم تھی۔ ہم کو یہ بھی اس وقت کہا گیا کہ جلد طائف جانا اور لوٹ آنا چاہیئے۔ مبادا بد عملی ہو جائے۔ مگر ہم کو یقین کامل نہ ہوا۔ اسی زمانہ میں یہ خبر بھی مشہور ہوئی تھی کہ گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے کوئی خط شریف کے نام آیا ہے کہ فلاں تاریخ تک یا تو تم ترکوں کو حجاز سے نکال دو ورنہ ہم شریف علی کو (جو پہلے شریف حجاز تھا اور شریف حسین موجودہ کا بھتیجا ہے اور اس وقت مصر میں مقیم تھا) اس کو حجاز کا شریف بنا کر بھیجیں گے (نہ معلوم یہ خبر کہاں تک صحیح تھی) جدہ میں ہمیشہ جنگی آگبوٹ آتے اور بندر میں تین تین چار چار اور کبھی کم زیادہ جمع ہو جاتے تھے اور کھڑے رہ کر چلے جاتے تھے۔ نہ وہ کچھ تعرض کرتے تھے نہ ترکی حکومت۔

ہم اس رسالہ میں ان واقعات کو دکھلانا نہیں چاہتے۔ جو کہ اس فتنہ کے زمانہ میں ہوئے کیونکہ اُس کے لئے ہمارا ارادہ ہے کہ اگر خدا کو منظور ہوا تو مستقل رسالہ لکھیں گے۔ اس مقام پر تو فقط حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا سفر نامہ لکھنا ہے۔ ہم کو طائف پہونچکر کچھ طبیعت سیر ہونے کا موقعہ ہاتھ نہ آیا تھا کہ شتربان آیا اور کہا کہ اگر چلتے ہو تو شتر حاضر ہے ورنہ میں آٹھ دن کے بعد پھر آؤں گا۔ مطوف صاحب اور ہم لوگوں کی رائے ہوئی کہ ایک ہفتہ یہاں اور قیام کر لیا جائے۔ اس کے بعد مکہ معظمہ جانا چاہیئے۔ اتفاق وقت سے اُس وقت طائف میں میوے بہت کم تھے۔ شہتوت اور خوبانیوں وغیرہ کا ابتدائی موسم تھا البتہ شہد خوب آتا تھا۔ دو چار دن بعد مولانا مرحوم نے تقاضا فرمایا کہ مکہ معظمہ کو چلنا چاہیئے۔ مگر شتربان جا چکا تھا ایک دو دن کے بعد پھر زیادہ تقاضا فرمایا۔ ہم نے جب دوسری سواریاں تلاش کیں تو معلوم ہوا کہ راستہ بند ہو گیا ہے۔ ہم اس وقت اس راز کو نہ سمجھ سکے کہ کیوں اس قدر تقاضا کیا جا رہا ہے مگر دو ہی تین دن کے بعد معلوم ہو گیا کہ آئندہ آنیوالے واقعات

نے خلاف عادت مولانا کو تقاضائے سفر پر مجبور کیا ہے۔ جن کو نظر کشفی سے مولانا نے معلوم کر لیا تھا مگر چونکہ ضبط اور اخفا کا مادہ بہت زیادہ تھا اور ہر مقام رضا میں قدم راسخ تھا۔ اس لئے چند مرتبہ ظاہری تقاضا کرنے کے بعد چپ ہو رہے اور پھر معلوم ہوا کہ طائف نہایت سخت خطرہ میں پڑ گیا ہے اس لئے جو لوگ باہر باغوں میں مقیم ہیں اُن کو شہر پناہ میں چلے جانا ضروری ہے چنانچہ ہمارے مطوف سید ابن حاصم صاحب معہ اپنے اہل وعیال شہر میں سید علی حبشی کے مکان پر چلے گئے اور ہمارے لئے بھی وہاں ہی ایک کوٹھری لے دی۔ تمام شہر میں اس وقت عجب ہل چل تھی۔ ۹ شعبان روز شنبہ کو ہم لوگ شہر میں چلے گئے تھے ترکی افسروں کو بھی یہ بات محسوس ہو گئی۔ انھوں نے شہر کے اردگرد حسب قواعد جنگ مورچے بنائے اور جن جن باغوں اور مکانوں کو مورچہ کے لئے مناسب جانا اُن کو خالی کرالیا۔ گیارھویں شعبان ۱۳۳۴ھ کی شب کو صبح صادق کے قریب چاروں طرف سے شریف کی فوجوں نے چڑھائی کی جو کہ زیر کمانداری عبداللہ بیگ کام کر رہی تھیں۔ صبح صادق کے وقت ہم سب بمعیت حضرت مولانا مرحوم صبح کی نماز کے لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مسجد میں جا رہے تھے کہ ناگاہ ایک بندوق کی آواز سُنائی دی۔ پھر تو چاروں طرف سے بندوقیں چلنے لگیں ترکی فوج جس نے چاروں طرف حسب قواعد جنگ مورچے بنا رکھے تھے پورے طور سے جواب دیتی رہی۔ اگرچہ ترکی فوج کی مقدار تقریباً ایک ہزار مسلح سپاہی کے تھی۔ باقیماندہ لوگ مسلح نہ تھے مگر چونکہ منتظم جماعت تھی اس نے بدوی فوجوں کو بہت زیادہ اور قوی نقصان پہونچایا۔ بدوؤں کی مقدار بہت زیادہ بتائی جاتی ہے اس سے دو دن پہلے مکہ معظمہ، جدہ، ینبع، مدینہ منورہ میں یہی واقعہ پیش آ چکا تھا۔ کیونکہ شریف نے انتظام کیا تھا کہ ایک ہی دن میں سب جگہ یہ کام ہو۔ اس جنگ کی وجہ سے جو لوگ طائف میں غلہ اور ترکاری میوہ وغیرہ لاتے تھے اُن کا آنا بند ہو گیا اور یہاں سے باہر کا جانا بھی بند ہو گیا۔ ادھر فوجی حکام کو رسد کی فکر ہوئی۔ حسب قواعد جنگ انھوں نے تاجروں سے موجودہ غلہ کی نصف مقدار لینی شروع کی جس نے خوشی سے دیدیا اس کی مقدار میں سے نصف لے لیا اور نصف چھوڑ دیا اور لئے ہوئے نصف کی قیمت اُس وقت کے حساب سے لگا کر اس کو رسید دیدی کہ حکومت ترکی بعد از جنگ یہ مقدار تجھ کو ادا کرے گی۔ البتہ جن لوگوں نے چھپایا اُن پر شدت کی گئی اور تمام مال تجارت اُن کا خورد و نوش اور ضروریات فوجی کی قسم کا لے لیا گیا فقط بمقدار اُن کے اہل وعیال کی ضرورت کے اُن کو دے دیا گیا۔ ادھر تو شہر میں غلہ کی کمی اُدھر آمد بالکل بند غرضکہ اس وجہ سے شہر میں سخت گرانی ہو گئی۔ پھر شریف کے لوگوں نے نہر کو بھی اوپر سے بند کر دیا اس وجہ سے پانی کی سخت تکلیف ہوئی۔ اگر قشلہ (فوجی قیامگاہ) کا کنواں نہ ہوتا تو نہایت زیادہ اشکال کا سامنا ہوتا۔ اگرچہ شریف کی فوج کثیر التعداد بھی تھی اور اس کے پاس نئی اور عمدہ انگریزی رائفلیں بھی تھیں اور سامان جنگ نہایت کثرت سے تھا مگر باوجود سعی بسیار ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ جب انھوں نے ہجوم کیا منہ کی کھائی۔ دن رات برابر گولیاں چلتی رہتی تھیں ترکی فوج اُن کے مجمعوں پر توپوں سے گولے برساتی تھی۔ نصف رمضان تک یہی حالت رہی اس کے بعد وہ مصری فوجیں جو جدہ میں اس کے لے لینے کے بعد اُتاری گئی تھیں اور جنھوں نے مکہ معظمہ کے قلعہ اور قشلہ کو توپوں کے ذریعہ سے فتح کیا تھا۔ طائف میں معہ توپوں کے پہونچیں اور طائف کے چاروں طرف سے توپیں سات یا آٹھ نصب کر کے قلعہ اور قشلہ پر گولہ باری کرنے لگیں۔ صبح صادق سے تقریباً بارہ بجے تک یہ عمل ہوتا رہا۔ اُس کے بعد توپیں ٹھیر جاتی تھیں۔ ترک بھی

اُن کا جواب دیتے تھے۔ یہی حال عید مبارک تک رہا۔ افسوس کہ عید کے دن بھی شریف کے لوگوں نے جنگ کو موقوف نہ کیا۔

مولانا کا رمضان طائف میں

چونکہ رمضان کا مہینہ طائف میں نہایت بدامنی کی حالت میں واقع ہوا تھا اس لئے نہ تو دن کو حسب خواہش لوگوں کو خوراک کا انتظام کرنا ممکن نہ ہوتا تھا نہ مساجد میں تراویح وغیرہ کا انتظام حسب ضرورت ہو رہا تھا۔ مسجد ابن عباسؓ وہاں کی بڑی مسجد ہے اس میں بھی تراویح الم ترکیف سے ہوتی تھیں۔ اور اس میں بھی بہت کم آدمی آتے تھے باقی لوگ محلہ کی مسجدوں اور اپنے مکانوں میں پڑھتے تھے۔ کیونکہ ہر وقت ادپہ سنگ زنی رہتی تھیں۔ مولانا نے بھی اوّلاً مسجد ابن عباسؓ میں حسب عادت سابقہ تراویح پڑھنی شروع کیں۔ مگر چونکہ راستہ وہاں کا ایسا تھا جہاں پر گولیاں برابر آتی رہتی تھیں۔ اس لئے اس مسجد میں جاتے وقت خطرہ ضرور رہتا تھا اور پھر ایک شب میں یہ واقعہ پیش آیا کہ نماز مغرب پڑھ کر فارغ ہوئے ہی تھے ابھی تک نفل وغیرہ پڑھ رہے تھے اندھیرا ہو چکا تھا کہ بدوؤں نے ہجوم کیا۔ مسجد ابن عباس کی چھت اور میناروں پر بھی ایک بڑا دستہ ترکی فوجوں کا تھا اور مسجد کے قریب جو دروازہ تھا وہاں پر مورچہ بھی تھا۔ غرضکہ طرفین میں خوب تیز گولی اور گولوں کی بارش دیر تک ہوتی رہی۔ خود مسجد میں بھی برابر گولیاں برستی رہیں۔ جو لوگ مسجد میں باقی تھے وہ ایک کونہ میں جدھر گولیوں کے آنے کا گمان نہ تھا بیٹھ گئے۔ اس روز تراویح بھی نہیں ہوئی صرف چند آدمیوں نے بوقت نماز عشا فرض عشا ایک طرف پڑھ کر جب کچھ سکون ہوا چلے گئے۔ اس کے بعد احباب اور خصوصاً سید امین عاصم صاحب نے اصرار کیا کہ آپ مسجد ابن عباسؓ میں نماز کے لئے نہ جایا کریں۔ دروازہ مکان کے قریب جو مسجد ہے اس میں ہمیشہ نماز جماعت پڑھا کریں۔ چنانچہ تمام رمضان اوقات خمسہ کی نماز وہاں پڑھا کرتے تھے۔ اُس سال تراویح فقط الم ترکیف سے پڑھی گئی۔ اس کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ نوافل میں سحر کے وقت تک مسجد میں مشغول رہتے تھے اور مولوی عزیر گل صاحب اور کاتب الحروف بھی اسی مسجد میں علیحدہ علیحدہ نفلوں میں وقت گذارتے۔ چونکہ گرمیوں کی رات تھی۔ جلد تر سحور کا وقت ہو جاتا تھا۔ پھر آ کر کچھ سحری پکاتے جو کہ میٹھے چاول ہوتے تھے۔ مگر چونکہ شکر وہاں ملتی نہ تھی اس لئے شہد کو بجائے شکر چاول اور چاء میں استعمال کرتے تھے اور اکثر نمکین چاول بغیر گوشت پکایا جاتا تھا۔ اس وقت طائف میں چاول وغیرہ بھی دستیاب ہونا مشکل ہو تا تھا۔ ایک آنہ والی روٹی آٹھ آنہ کو بمشکل ملتی تھی۔ مگر دہلی کے تاجروں میں سے حاجی ہارون مرحوم نے تھوڑے چاول مولانا مرحوم کے لئے ہدیتہً بلاطلب بھیج دیئے تھے جو کہ عمدہ قسم کے تھے۔ انھوں نے بہت کام دیا۔ اس مدت میں جو کہ تقریباً دو ماہ تھی ہم نے دس بارہ اشرفی طائف میں بوجہ سخت گرانی کھا ڈالی۔

طائف سے روانگی

عید کے بعد چونکہ تمام اہل شہر بھوک سے مرنے لگے تھے۔ حکام کے پاس جا کر شکایت کی کہ اب ہمارے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں رہ گیا۔ ہمارے پاس جتنے حیوانات دودھ سواری کے تھے کھا ڈالے۔ سب غلہ ختم ہو گیا۔ اب ہمارے لئے کوئی صورت کیجئے۔ ہم سب مرے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ اچھا صبح کے آٹھ بجے سے بارہ بجے تک باب ابن عباسؓ سے روانگی کے لئے ہم تم کو اجازت دیں گے۔ ہم اپنی حد میں تم کو کوئی نقصان نہیں پہونچائیں گے شریف کے آدمی تم کو نقصان پہونچائیں تو اس کے ہم ذمہ دار نہیں۔ الحاصل لوگوں کو اس طرح ایک فارم معہ اُن کے اہل وعیال کے نام کے دیا جاتا تھا اور اُن سے عہد لیا جاتا تھا

کہ وہ کہیں آگر ترکی حکومت سے جنگ نہ کریں گے۔ پھر اُن کو معہ اُن کے ضروری اسباب کے باہر نکلنے دیا جاتا تھا۔ جب اس طرح سے لوگ نکلنے لگے تو پھر ہم سبھوں کو ضروری معلوم ہوا کہ نکل چلیں چنانچہ ۶؍ شوال ۱۳۳۴ھ کو بوقت صبح ہم بھی باب ابن عباس سے نکلے اور وہاں سے چل کر پھرتے ہوئے (تیم) میں پہونچے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر شریف کا بیٹا عبد اللہ بیگ جو کہ کمانڈر بدوؤں کا تھا مقیم تھا اور تمام فوجی حرکات کا یہی مرکز تھا۔ یہیں مصری فوج کے خیمے بھی تھے چونکہ ہمارے پاس نہ سواری تھی اور نہ نقد وغیرہ اور راستہ دور تھا۔ ادھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نہایت ضعیف تھے تین دن تک پہاڑی راستہ کو قطع کرنا آسان نہ تھا۔ علاوہ ازیں اسباب بھی تھا اس وجہ سے وہاں جانا ضرور ہوا۔ عبد اللہ بیگ سے ملاقات ہوئی۔ اعزاز واکرام سے پیش آیا۔ ایک خیمہ کھڑا کرنے کا حکم کیا۔ ایک دنبہ ذبح کر کے دعوت پیش کی (عرب میں عادت ہے کہ معزز مہمان کی دعوت میں دنبہ ذبح کرنا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو وہ کامل اکرام مہمان کا شمار نہیں ہوتا) اور پھر انجیر وغیرہ میوہ جات بھیجے۔ اور ایک اشرفی نذر کی اور کہا کہ شب کو یہاں قیام کرو۔ علی الصباح تم کو روانہ کر دیا جائے گا۔ مگر علی الصباح لڑائی پر چلا گیا۔ اُس کے لوگوں نے خالی پشت شتر کا انتظام کر دیا۔ کرایہ بھی خود دیا اور زاد راہ بھی۔ اس طرح وہاں سے روانہ ہو کر ہم دسویں شوال کو مکہ معظمہ علی الصباح پہونچے۔

ضمیمہ صفحہ ۲۳۲

حضرت مصنف مدظلہ العالی اپنی تصنیف "سفرنامہ اسیر مالٹا" میں تحریر فرماتے ہیں۔

ایام حج میں اورنگ آباد کے خان بہادر مبارک علی مکہ معظمہ تشریف لائے۔ سرکاری آدمی تھے۔ لن ترانیاں خوب ہانکتے تھے۔ شریف صاحب کے یہاں پہونچے۔ ترکوں کو ہر مجلس میں بُرا کہتے تھے۔ حکومت موجودہ کی مدح سرائی میں زبان خشک ہو جاتی تھی۔ اُنھوں نے ظاہر کیا کہ میں گورنمنٹ ہند کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں۔ تاکہ حجاز کے احوال کو دریافت کر کے واقعی باتیں اہل ہند کو بتاؤں۔ کیونکہ ہند میں اس وقت بے چینی بہت پھیلی ہوئی ہے اور عموماً اہل ہند برطانیہ پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے بادشاہ حجاز کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایک اعلان علماء مکہ کی طرف سے مجھ کو دیا جائے جس میں ترکوں اور اُن کی حکومت اور خلافت کی بُرائیاں ہوں اُن کے استحقاق خلافت پر پر زور مضمون سے رد کیا گیا ہو۔ اس موجودہ انقلاب اور حکومت حاضرہ کی بھلائیاں ذکر کی گئی ہوں۔ چنانچہ ایک ایسا محضر تیار کیا گیا اور وہاں کے ان علماء سے جن کو دربار شرافت میں دخل تھا اور صاحب عزت و شوکت شمار کئے جاتے تھے اس پر دستخط اور مہر کرایا گیا۔ بہتوں نے خوشی سے اور بہتوں نے خوف سے دستخط اور مہر کر دیا۔ خان بہادر موصوف کے پاس جب یہ محضر نامہ پہونچا تو اُنھوں نے کہا کہ ان علماء کو کوئی ہند میں نہیں جانتا۔ کون تصدیق کرے گا۔ مناسب ہوگا کہ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب جو کہ علماء ہند میں ایک مشہور اور مسلم شخص ہیں اُن کے اور دیگر علماء ہند کے دستخط اور مہر ہوں۔ (نہ معلوم یہ اسی واسطے وہاں بھیجے گئے تھے کہ اس ذریعہ سے مولانا مرحوم کو وہاں سے پکڑا جائے یا یہ قضیہ اتفاقیہ تھا)

الحاصل اس مضمون کو وہاں کے شیخ الاسلام مفتی عبداللہ سراج جو کہ زمانۂ حکومت ترکیہ میں مفتی احناف تھے اور اب انقلاب کے بعد عہدۂ شیخ الاسلامی اور وکالت شرافت پر مامور ہو گئے تھے بذریعہ نقیب العلماء مولانا کے پاس بھیجا، واخر محرم الحرام ۱۳۳۵ھ میں عصر کے بعد وہ اس محضر کو لیکر مکان پر آیا۔ اس زمانہ میں اہالی مکہ معظمہ میں سے جو لوگ مہاجرین ہند اور علم دوست تھے۔ انھوں نے ظہر کے بعد مولانا مرحوم سے بخاری شریف کو شروع کر رکھا تھا۔ مکانِ اقامت ہی پر درس دیا کرتے تھے۔ جب وہ کاغذ آیا تو چونکہ اس کی سرخی تھی "من علماء مکۃ المکرمۃ المدرسین بالحرم الشریف المکی۔ یعنی یہ تحریر مکہ مکرمہ کے اُن علماء کی طرف سے ہے جو حرم شریف مکّی میں پڑھاتے ہیں۔ اس لئے اُن سے کہا گیا کہ" اولاً اس سرخی کی وجہ سے کوئی استحقاق نہیں کہ حضرت مولانا اس پر کچھ لکھیں کیونکہ وہ علمائے مکہ میں سے نہیں اور نہ حرم مکّی یعنی مسجد الحرام میں مولانا نے کبھی تدریس کی ثانیاً اس میں قوم ترک کی مطلقاً تکفیر کی گئی ہے اور درپارہ اس کے جو کچھ احتیاط اور سخت احکام ہیں آپ کو معلوم ہے۔ ثالثاً اس میں وجہ تکفیر سلطان عبدالحمید خاں کا تخت سے اُتار دینا لکھا گیا ہے۔ حالانکہ کسی فقیہ نے اس کو موجباتِ کفر میں سے قرار نہیں دیا۔ رابعاً اس میں خلافتِ سلاطین آلِ عثمان کا انکار کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ امر مخالف نصوص شرعیہ میں ہے۔ خامساً اس میں اس انقلاب اور حرکت کو مستحسن دکھایا گیا ہے اور یہ بھی شرعاً نہایت قبیح واقع ہوا ہے" چونکہ کاتب الحروف کی نقیب العلماء سے کچھ پہلے سے معرفت تھی اس لئے اُن سے تمام کیفیتیں ظاہر کر دینے کے بعد یہ کہا گیا کہ تم شیخ الاسلام سے یہ کہدینا کہ مولانا نے اس پر دستخط اور مہر کرنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ اس کا عنوان اہل مکہ اور مدرسین حرم کے ساتھ مخصوص ہے۔ میں آفاقی شخص ہوں۔ پردیسی ہونے کی وجہ سے مجھ کو کوئی استحقاق اس پر دستخط کرنے کا نہیں اور یہ کہا گیا کہ ابھی دوسری وجہوں کو اُن پر ظاہر نہ کرنا اگر پھر اُنھوں نے اصرار کیا تب ان وجہوں کو پیش کیا جائے گا۔ وہ اسی وقت واپس ہو گئے اور پھر کوئی جواب نہ لائے۔ اس محضر کا شہر میں پہلے سے چرچا تھا۔ جو لوگ مقامی تھے اُن کو خوف لگا ہوا تھا کہ اگر ہمارے پاس آیا تو ہم کیا جواب دیں گے اور کس طرح جان چھڑائیں گے۔ مولانا مرحوم کے رد کرتے ہی تمام شہر میں مشہور ہو گیا کہ مولانا نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اب تو دوسروں کو بھی ہمت ہو گئی۔

ادھر شیخ الاسلام صاحب کو تنبیہ ہوا اُنھوں نے عبارت سابقہ بالکل بدل ڈالی اور اس طرح اس کو لکھا کہ اس میں سے مبحث تکفیر بالکل خارج ہو گیا۔ مگر دستخط کرنے کو پھر نہیں بھیجا۔ جو عبارت دوبارہ بنائی گئی تھی۔ اس پر پہلے علماء سے فقط دستخط لیکر اخبار "القبلہ" میں چھاپ دیا گیا اور اسی کو خان بہادر مبارک علی خاں لیکر روانہ ہو گئے۔ خیر خواہوں نے مولانا مرحوم سے کہا کہ کہیں شریف آپ کو کوئی اذیت نہ پہونچائے۔ مولانا مرحوم نے فرمایا کہ پھر کیا کیا جائے۔ مذہبی حیثیت سے اس پر مہر و دستخط کسی طرح درست نہ تھا آئندہ جو کچھ تقدیر الٰہی میں ہوگا جھیلیں گے۔

فہرست مضامین نقش حیات جلد دوم

چند قابل قدر کتابیں

ان کتابوں کا حوالہ حضرت مصنف مدظلہ العالی نے نقش حیات جلد اوّل اور نقش حیات جلد دوم میں اپنے یا اپنی جماعت کے حالات کے سلسلہ میں دیا ہے۔

یہ کتابیں آپکی لائبریری میں ضرور رہنی چاہئیں۔ ان کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ بالخصوص اس دور میں کہ ہر ایک ہمدرد ملت روشن مستقبل کی فکر میں مصروف ہے۔ ان کتابوں کا مطالعہ مشعل راہ کا کام دے گا

علماء حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے

از حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند

حصہ اوّل اس حصہ میں ان تمام علماء امت کے مفصل حالات زندگی اور اُن کے کارنامے درج ہیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی سے لیکر تحریک دار العلوم دیوبند تک۔ وطن و ملت کی آزادی کے لئے جدوجہد کی اور اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ یہ حصہ ۱۶۵ عنوانات اور ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد مع خوبصورت گردپوش تین روپے چار آنے (۳/۴) علاوہ محصولڈاک

حصہ دوم اس حصہ میں دوسری جنگ عظیم سے لیکر مہاتما گاندھی کی قربانی تک کے تمام سیاسی حالات اور اس دوران میں جن علماء حق نے آزادی وطن اور اس کے بعد ملک میں قیام امن و اتحاد کے لئے انتھک کوششیں کی ہیں اُن کا مفصل تذکرہ درج ہے صفحات ۳۷۶ قیمت مجلد مع خوبصورت ڈسٹ کور۔ سات روپے آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

اس کتاب کے متعلق مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب کی رائے گرامی کا اقتباس

"علمائے ہند کا شاندار ماضی" لکھ کر مولانا سید محمد میاں صاحب نے برطانوی سامراج کی بنیادوں پر ایک بھرپور وار کیا تھا اور اب "علماء حق" لکھ کر انھوں نے تذکرہ نویسی کی دنیا میں ایک مقام اعظم حاصل کیا ہے" سیاسی مورخوں کے لئے ایک زبردست خزینۂ معلومات۔ تذکرہ نویسوں کے لئے ایک عظیم مینار نور۔ اور ہمارے لئے ایک مقدس نشان راہ ——— **وہ علماء حق** جنھوں نے پھانسی کے تختہ پر بھی نڈر ہو کر کلمہ حق کہا' جنھوں نے گولیوں کی بوچھاڑ میں بھی اعلان حق کیا۔ جنھوں نے ہر فرد جماعت سے آگے بڑھ کر جنگ آزادی لڑی' جن کا عزم آزادی بڑے سے بڑے سامراجی لالچ یا خوف سے متزلزل نہ ہوا۔ جنھوں نے ہر ایک سیاسی جماعت سے پہلے آزادیٔ وطن کا بیڑا اٹھایا' ان ہی مجاہدین وحق پرستوں کی مکمل تاریخ ہے"۔

مسلمانوں کا روشن مستقبل

جدید ایڈیشن

مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم کی مقبول عام کتاب جس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس ایڈیشن میں بہت سے اضافے کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب مسلمانوں کی گذشتہ تین سو سال کی مذہبی، اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی تاریخ ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی بدحالی نہ سلطنت چھن جانے سے ہے اور نہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے، بلکہ جدید تعلیم کے دور نے کچھ ایسے اسباب پیدا کر دیئے ہیں جن کا اثر مسلمانوں پر افسردگی کی شکل میں ظاہر ہوا اور ان کے قوائے عمل مضمحل ہو گئے۔ اس قسم کے یاس انگیز خیالات کو مصنف نے دور کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمان ترقی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ قابل مطالعہ کتاب ہے۔ قیمت مجلد ؎

حیاتِ شیخ الاسلام

حضرت مصنف کے حالات زندگی ۔ از ۔ مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند

جس میں علمی، مذہبی، تبلیغی، اصلاحی اور سیاسی خدمات، اسارت مالٹا، اسارت کراچی اور اسارت مراد آباد و نینی وغیرہ کے حالات اور آپ کے سیاسی نظریات پر سیر حاصل مفید اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ خطبات صدارت کے اہم اقتباسات اور آخر میں چند مکاتیب بھی جمع کر دیئے گئے ہیں جو علمی، اخلاقی اور روحانی افادات کا بہترین مجموعہ ہیں۔ قیمت مجلد صرف ؎

اقسام حکومت

و انواع الدول

دورِ حاضر کی بہترین کتاب۔ سیاست اور مذہب کا عجیب و غریب سنگم، اپنے موضوع پر پہلی کتاب جس میں حکومت کی مختلف قسموں کی تفصیل کی گئی ہے اور ظاہر کیا گیا ہے کہ دنیا میں کس کس قسم کی حکومتیں قائم ہیں یا قائم ہو سکتی ہیں۔ پھر ہر ایک کے متعلق منصفانہ اور سیر حاصل بحث کرنے کے بعد صحیح اور سلیم طرز حکومت کی تشریح کی گئی ہے۔ یہ صحیح حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے اس کی کیبنٹ کس طرح تشکیل پاتی ہے۔ اس کے مصنف حضرت مولانا منصور انصاری صاحبؒ نے سالہا سال کے غور و خوض اور مذہبی اور سیاسی کتابوں کے ہزاروں اوراق پلٹنے کے بعد اس کو مرتب فرمایا ہے۔ کاش اہل علم اور ارباب ذوق اس کی قدر کریں۔

یہ کتاب یقیناً اس قابل ہے کہ طلبا کے سیاسی کورس میں اس کو جگہ دی جائے۔ تاکہ بلندیٔ فکر وطن عزیز کے مستقبل کا بہترین نقشہ تیار کر سکے۔ قیمت صرف دو روپے (عـہ) علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ

الجمعیۃ بک ڈپو۔ دفتر جمعیۃ علماء ہند۔ گلی قاسم جان۔ دہلی ۶